کرشن چندر
شکست
ناول
alhamra

شکست

(ناول)

کرشن چندر

alhamra

اُس شعلے کے نام جسے میں کبھی چھو نہ سکا
اُس پھول کے نام جو کبھی نگاہ نہ ہوا

© 2002 الحمرا پبلشنگ

طبع اول: دسمبر 2002

طابع: الحمرا پرنٹنگ پریس

ناشر: شفیق ناز۔ الحمرا پبلشنگ۔اسلام آباد

Shikast
Karshan Chander

© 2002 by Alhamra Publishing,
Saudipak Tower, Jinnah Avenue, Islamabad - Pakistan

Printed in Pakistan - ISBN: 969-516-104-9

بابِ اول

تخیل

یکایک آفتاب مغرب میں غروب ہو گیا، اور حد نظر تک آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت وادی پھیلتی گئی، سورج کے ماہی گیر نے آخری بار اپنا سنہری جال وادی کی گہرائیوں میں پھینکا، اور نیلے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے دور استادہ سلسلہ ہائے کوہ، دھان کے کھیت، ندی کا چمکیلا پانی، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پل، ناشپاتیوں کے جھنڈ، شفق کے زریں دام میں گرفتار نظر آئے۔ ہوا کے ہلکے، لطیف جھونکے بھی رک رک کر آتے تھے، جیسے اس کا میٹھا، مدھم سانس بھی اسی جال میں الجھ کر رہ گیا ہو۔ خود اپنے چہرے پر شیام نے اس رنگین اور لچکیلے تانے بانے کی ملائمیت کو محسوس کیا، جیسے وہ سنہرا جال اس کے رخساروں پر سے پھسلتا ہوا مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سورج کے پُرفن اور چابکدست ماہی گیر نے وادی کا سارا سونا، اس کی ساری رعنائی، رنگین مچھلیوں کی طرح اپنے جال میں سمیٹ لی تھی، اور وہ اب اسے مغرب کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا۔ یہ جال اب پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے گھسٹتا ہوا، گھنے جنگلوں پر سے پھسلتا ہوا، زریں وادی میں پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی طرف آ رہا تھا اور اپنے پیچھے اک اُداس، سرمئی غبار پھیلاتا جا رہا تھا۔ شیام نے سوچا، کسی فردِ واحد کو یہ حق کیسے پہونچتا ہے کہ وہ اس طرح اس سارے خطے کی خوبصورتی پر قبضہ کر لے، اور اس وادی سے رخصت ہوتے وقت اسے بھی اپنے ساتھ لے جائے، اس کا جی چاہا کہ مغرب میں اس افقی کنارے سے دوسرے افقی کنارے تک ایک ایسا بند باندھ دیا جائے کہ خوبصورتی کا یہ بہاؤ مغرب کی طرف جانے سے رک جائے، اور وادی کے آخری لمحاتِ رنگیں اپنے جمالیاتی تزئین و تناسب کے ساتھ جوں کے توں قائم رہیں۔ مغرب کا ماہی گیر اس کی اس آرزوئے خام پر یوں مسکرایا کہ چند منٹوں میں ساری وادی پر ایک دھندلا سرمئی غبار پھیل گیا۔ صرف مغرب میں لالی کی ایک لکیر رہ

گئی، جال کا آخری کنارہ۔ اس کی خچر کی سی ایال جو چند لمحے پہلے شعلے کی طرح لہراتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اب روکھے سوکھے بالوں کی ایک بدصورت بند نما پٹی نظر آنے لگی۔ اور اس نے سوچا کہ اب زیادہ دیر تک درے کی چوٹی پر خچر کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اپنی امنگوں اور آرزوؤں کی ناتمامی پر غور کرنا بیکار ہے، اب آگے چلنا چاہیئے۔

غلام حسین نے جو اس کے قریب ہی دوسرے خچر پر بیٹھا ہوا تھا، آگے جھک کر اور وادی کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔ "یہ ماندر کی وادی ہے، اور وہ۔۔۔ ماندر کی ندی کے پار کچہری ہے، اب ہمیں چلنا چاہیئے، رات ہوتے ہوتے ہم وہاں پہونچ جائیں گے، تحصیلدار صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

تحصیلدار صاحب اور شریر روی اور ننھی نمی اور اس کی والدہ، آج سب کو اس کے آنے کی اُمید تھی، اُن کے اشتیاق آمیز چہرے اس کی نگاہوں کے آگے گھومنے لگے۔ نمی کی بھولی معصوم مسکراہٹ، اس کی آنکھوں کی حیرانی، روی کا شوخ لہجہ، اس کے گھنگریالے بال اور انہیں بار بار جھٹک دینے کا انداز، اس کی ماں کا فراخ ماتھا، سیدھی مانگ، اور سیاہ بالوں میں جا بجا چاندی کے تار چمکتے ہوئے، پتلی بھوؤں کے نیچے پُر سکون پتلیاں، اور پپوٹوں کی کوروں پر پتلی، مہین خفیف سی جھریاں، ادھیڑ پنے کی آمد کے آثار، نگاہوں میں پریشانی، اک نامعلوم سا خوف اور اک غیر واضح اشتیاق سے زیادہ مامتا نظر آتی تھی۔ ان سب کے اوپر اس کے باپ کا جھکا ہوا چہرہ، تیز، پریشان، متجس آنکھیں، جن میں کبھی مسرت کی چمک، کبھی غم کی بدلی، کبھی حکومت کا وقار، جیسے ان آنکھوں کی نگاہوں میں ساری دنیا مجرم ہے، مضبوط ٹھوڑی جسے وہ اپنی اُنگلی سے سہلا رہے تھے۔ وہ ایک سال کے بعد اپنے گھر والوں سے ملنے آرہا تھا۔ پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جب وہ کالج پہونچا۔ تو اس کے والد کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ تبدیلی بھی اور ترقی بھی۔ اور اب وہ ماندر میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ ایک سال کے عرصے میں بھلا گھر والوں میں تو کیا تبدیلی آگئی ہو گی، ہاں یہ جگہ نئی تھی۔ دھیر کوٹ تو ایک بالکل گھٹی گھٹی سی جگہ تھی۔ سرد، یخ بستہ، پالے کی ماری ہوئی، لیکن اس وادی کا سینہ فراخ تھا۔ جس کے پھیلاؤ میں ایک چھوٹا سا دریا بھی بل کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اچھی جگہ ہو گی۔ چھوٹی بہن اور بھائی، دونوں اشتیاق آمیز نگاہوں سے اس کی راہ تک رہے ہوں گے۔ کبھی کبھی ماں جی بھی توکھائی کے کنارے آکر اس ٹیڑھی میڑھی سڑک پر آنے والے سواروں میں اپنے بیٹے کے چہرے

کو تلاش کرتی ہوں گی۔۔۔

درے کے ڈھلوان سے اتر کر اب وہ ایک سیدھی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ اب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ ہاں خچروں کے پاؤں کبھی کبھی پگڈنڈی کے پتھروں سے ٹکرا جاتے، اور خچر والا اپنی تھکی ہوئی، نیم مدہوش آواز میں کہہ اٹھتا: "ہوش، نوری، ہوش!" اس کے سارے حواس پر ایک غنودگی سی چھاگئی۔ صرف ناک کے نتھنوں میں بار بار کیسی نیم گرم، سوندھی خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں، جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ باسمتی کے دھان کے کھیتوں کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ باسمتی کے دھان کی خوشبو کتنی نرم گرم اور پیاری ہوتی ہے۔

یکایک اس کی پیاس چمک اٹھی، اور اس نے غلام حسین کی طرف دیکھا، جو اپنے خچر پر چپ چاپ پتھر کے بت کی طرح ساکن بیٹھا تھا۔

"غلام حسین، ادھر کوئی چشمہ نزدیک ہو گا بہت پیاس لگی ہے۔۔۔"

"بس کوئی دس پندرہ قدم آگے، یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ کو یہیں آکر پیاس لگی، ورنہ۔"

دس قدم کے بعد خچروں کے قدم خود بخود رک گئے، شاید خچر بھی پیاسے تھے۔ یہاں ایک ننھی سی باؤلی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ سلوں کے درمیان پانی چمک رہا تھا۔ باؤلی کے سر پر درختوں کا سیاہ جھنڈ تھا۔ نظر نہ آنے والے مینڈک ٹرا رہے تھے۔ وہ ایک سل پر اکڑوں بیٹھ گیا، اوک چشمے کی طرف بڑھا دی۔

"اس چشمے میں جونکیں ہیں راہی!" کسی نے کہا۔

وہ چونک کر پیچھے ہٹا اور سل پر کھڑا ہو گیا، اندھیرے میں جسے درختوں کے سیاہ جھنڈ نے اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو نہ دیکھا تھا جس کا لانبا، کمان کی طرح خمیدہ جسم، اور چھاتیوں کے موہوم سے خم، اور چمکیلی آنکھیں جیسے پتھر کی سلوں میں چمکتا ہوا پانی، اب اسے اپنے بالکل قریب نظر آرہی تھیں۔ وہ لڑکی سر پر ایک گاگر اٹھائے ہوئے تھی اور اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

"اس میں۔۔۔ اس چشمے میں جونکیں ہیں؟"

لڑکی نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "ہاں! جونکیں۔۔۔ جو اندھیرے میں پانی پینے والے اجنبیوں کے حلق میں پھنس جاتی ہیں، یا ناک میں چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی دماغ میں بھی۔۔۔" وہ ہنسی۔

لڑکی کی آواز میں خود اعتمادی تھی، جرات، ایک جنسی چیلنج، جیسے وہ اس کی تضحیک پر آمادہ ہو۔ اسے اس خمیدہ کمان کے ترچھے تیروں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "اگر جونک دماغ میں پہونچ جائے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟"

وہ بولی۔ "وہی ہوتا ہے، جو درخت کو دیمک لگ جانے سے ہوتا ہے۔"

"یعنی؟"

"درخت گر جاتا ہے، دیمک باقی رہتی ہے۔۔۔لو پانی پیو۔"

وہ اپنی گاگر انڈیل کر اسے پانی پلانے لگی، چند لمحوں کے لئے اس نے اس کی آنکھوں کی سیاہ اور چمکیلی گہرائیاں دیکھیں، اور دو بیقرار طائر، دو مرغابیاں، مائل پرواز، اور دوسرے لمحے میں پتھر کی طرح جامد، اب وہ گاگر سنبھالے کھڑی تھی۔ یکایک اسے خیال آیا کہ وہ پانی پی چکا ہے۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا نام چندرا ہے، میرا گھر ان درختوں کے جھنڈ کے پرے گھاٹی کے اوپر ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں، جو ایک بیوہ ہے۔ ہمارے گھر میں ایک کتا بھی رہتا ہے، اس کا نام بھی جاننا چاہتے ہو۔ اس کا نام شیر ہے۔ اجنبیوں اور بدمعاشوں کو مار بھگانے میں وہ سچ مچ ایک شیر ہے۔"

وہ ہنسی۔ لیکن اس ہنسی میں تضحیک کا پہلو اور بھی نمایاں تھا۔ آواز میں استہزا کے کڑوے سر پوری طرح بیدار تھے۔

یہ غرور، یہ خود اعتمادی، یہ چیلنج۔ وہ خچر پر سوار ہونے لگا۔

یکایک چندرا نے پوچھا۔ "اور تمھارا نام کیا ہے؟"

"جونک!" اس نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر خچر کو ایڑی دکھا کر ہوا ہو گیا۔

بھاگتے ہوئے خچر پر سے پیچھے مڑ کر اس نے دیکھا تو وہ خمیدہ کمان ابھی وہیں ساکن و جامد تھی، پھر دھندلی ہوتی ہوتی اندھیرے میں گھل گئی۔۔۔اب پیاس بجھ چکی تھی، اور نتھنوں میں پھر وہی خوشبو آ رہی تھی، باسمتی کی سوندھی خوشبو۔۔۔

غلام حسین کہنے لگا۔ "یہ لڑکی بڑی حرامزادی ہے۔ کسی سے بیاہ نہیں کرتی، کسی کے قابو میں نہیں آتی، اس کی بیوہ ماں کو پٹواری تین ہزار روپے دیتا تھا، اس قیمت پر یہ گھوڑی بری بھی نہ تھی، پر یہ کمبخت بیوہ نہ مانی، گاؤں والوں نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو گاؤں سے باہر نکال دیا ہے۔ اس کی ماں

نے ایک غیر ذات کے آدمی سے شادی کر لی تھی، براہمن ہو کر ایک چمار سے شادی کر لی تھی۔ جو جموں سے یہاں آیا۔ یہ چندرا اسی کی لڑکی ہے۔ چمار مر گیا۔ اب لڑکی ہے اور اس کی ماں، اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا، جس پر ان کی گزر ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگ ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اور شریف لوگ تو انہیں اپنے گھروں میں بھی نہیں گھسنے دیتے، بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے ان کی۔ اگر بیوہ یہ لڑکی بیچ دے تو اس کے دن پھر جائیں۔ پر یہ بیوہ بڑی کمبخت ہے جی۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔"

وہ غلام حسین کی باتیں سنتا گیا، اور خچر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، اور وہ وادی کے بدلے ہوئے مناظر کی فلم لیتا گیا۔ پھر جیسے غلام حسین کی باتیں بھی اسی وادی کے مناظر کا ایک جز بن گئیں، پھر جیسے ان باتوں میں سے اسے شہد کی مکھیوں کے بھنبھنا کی آواز آنے لگی، اور اس کی آنکھوں میں خمار چھانے لگا۔ باتوں میں اب کوئی مطلب نہ رہا تھا، صرف شہد کی مکھیوں کی اک گونج تھی جو اس کے دماغ کے کسی پردے سے ٹکرا رہی تھی۔ باتیں، خوشبوئیں، فلمیں، اک غیر موہوم، غیر شعوری انداز میں اس کے دماغ کی تہوں میں گھسی جا رہی تھیں، اور خچر پر بیٹھے بیٹھے اسے نیند آنے لگی۔

ماندر کی ندی عبور کرنے کے بعد راستہ ایک پگڈنڈی کی صورت میں دھان کے کھیتوں میں سے گذرتا تھا۔ اور اس سے آگے تھوڑی دور جاکر ایک ٹیلے پر سے یہ راستہ دشوار گزار نہ تھا۔ اس نے بائیں رکاب سے اپنا پاؤں نکال لیا، اور اسے بھی دائیں طرف لاکر اطمینان سے کاٹھی پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں باگ تھی اور دونوں پاؤں ایک طرف لٹکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے کمر سیدھی کی، ہیٹ کو اتار کر آگے رکھ لیا، اور پھر سارے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ خچر آہستہ آہستہ ٹیلے کے اوپر چڑھ آیا، یہاں ناخ کا ایک ٹیڑھا میڑھا درخت تھا۔ اور اس کے قریب پگڈنڈی کے دونوں طرف مکی کے کھیت تھے۔ بھٹوں کی سوندھی سوندھی گرم خوشبو اس کے نتھنوں میں سرایت کرتی گئی۔ ایک لڑکی بھینس کے تھنوں سے دودھ دوہ رہی تھی۔ ایک گوجر اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہاں ایک مکان تھا۔ ایک لالہ دھوتی باندھے ہوئے ننگی کھاٹ پر گھٹنے اوپر اٹھائے حقہ پی رہا تھا۔ قریب ہی ایک چولھے میں ایک بڑھیا لکڑیاں لگا رہی تھی۔ آٹا گوندھ کر پاس دھرا تھا۔ قریب ہی دو ایک گائیں ڈکرانے لگیں۔ ایک بچھیا پیشاب کرنے لگی۔ آگ، دھواں، گوبر، پیشاب، حقے کی گڑگڑاہٹ، بھٹوں کی سوندھی خوشبو، اور جھاڑیوں پر کھلے ہوئے جنگلی گلاب، نیل دھاری کی بیلیں، جن میں بے شمار چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ یہ سب چیزیں اس کے احساسات پر اس طرح حاوی ہو گئیں کہ وہ بالکل خالی الذہن ہو کر اونگھنے لگا اور اس کے جسم کی ہر حرکت خچر کی چال سے ہم آہنگ ہو گئی اور اس کے دونوں پاؤں بے طور جھولنے لگے۔ یکا یک قریب سے دو بچے چلا اٹھے اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کا چھوٹا بھائی اور اس کی بہن نمی دونوں خوشی سے تالیاں بجاتے، چلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "بڑے بھیا آ گئے۔ بڑے بھیا آ گئے۔ آہاہا۔" روی اور نمی نے آگے بڑھ کر خچر کی باگ پکڑ لی۔

اور وہ اچھل کر نیچے آ رہا۔ اور اس نے دونوں کو ایک ساتھ اوپر اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ نمی کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور اس کے کٹے ہوئے بال اس کے شانوں پر رقص کر رہے تھے۔ روی کے بھورے بھورے گالوں پر ایک نیم گلابی لہر دوڑ گئی اور اس نے اپنی دونوں باہیں اپنے بھائی کے گلے میں ڈال دیں اور بولا "میرے لئے چیکو لائے۔"

"اور میری موٹر۔" نمی بولی۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں۔"

اور پھر اس نے دونوں کو نیچے اُتار دیا۔ آہستہ سے۔ اور بولا۔ "اب مجھے راستہ تو دکھاؤ۔۔۔"

ایک باغیچے میں منو اور شمشاد کے درخت تھے۔ گل شبو اور زرد چنبیلی کے پھول، ان کی مہک نے اس کے خوابیدہ احساس کو بیدار کر دیا۔ وہ دیکھنے لگا کہ یہ باغیچہ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے تھا، اس کے برآمدے میں ایک چیچک کے داغوں والا آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ روی نے اس کی طرف دیکھ کر زور سے ہات ہلایا، اور کہا۔ "بڑے بھیا آ گئے۔" چیچک کے داغوں والے آدمی نے اسے سلام کیا۔ اور وہ آگے بڑھ گیا۔ یہاں باغ تھا۔ باغ نیا نیا لگایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پیڑ، دور دور فاصلے پر، چاروں طرف لکڑی کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ کوتر ناخ کے پیڑ پھلوں سے لدے ہوئے جھکے جا رہے تھے۔ سامنے ایک بڑا بنگلہ تھا۔ جس کی باغ والی دیوار سے لگا ایک پہاڑی انجیر کا درخت تھا۔ غلام حسین ذرا آگے بڑھ گیا۔ روی اور نمی دونوں شور مچاتے ہوئے اس کے ساتھ دروازے کے اندر داخل ہوئے۔

اس نے اپنے پتا اور ماتا کے پاؤں چھوئے۔ وہ ایک سال کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں گھر لوٹا تھا۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسوں چمکنے لگے۔ اور اس کے باپ کے لبوں پر ایک غمناک سی مسکراہٹ تھی، جو آنسوؤں اور تبسم کے درمیان لرزتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، آنگن میں اپنے ماتا پتا کے پاؤں چھوتے ہوئے اسے اپنے کالج کا کیمپس یاد آ گیا۔ جس کے وسط میں پیپل کا ایک پیڑ تھا۔ اور جہاں بنچ پر بیٹھے ہوئے اس نے سشیلا سے اقرار محبت کیا تھا۔ سشیلا کے شہابی رخسار، جس پر اسے کوٹی کے پاؤڈر کے ہلکے سے غبار کا شبہ ہوتا تھا۔ اس کی بلند و بالا گردن کا خم جیسے کسی نازک چینی کی مرمریں صراحی۔ پتہ نہیں سشیلا اسے اس وقت کیوں یاد آ گئی۔ سشیلا نے کہا تھا۔ تم مجھے بھول جاؤ گے۔ اور اس نے کہا تھا کہ وہ تو اس کی جان تھی۔ "لیکن کرسچین لڑکیوں کی

محبت کا کیا اعتبار۔" اس کے اس بھونڈے مذاق پر سٹیلا کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا۔ اور اس نے گڑگڑا کر معافی مانگی تھی۔ اس آنگن میں اس وقت اسے سٹیلا کیوں یاد آ رہی تھی۔ یکایک اس کی ماں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "بیٹا یہ تمھاری خالہ ہیں چھایا دیوی۔" ایک لانبے قد کی نازک اندام عورت اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آواز میں جوانی تھی اور ایک دلکش نسائیت، ہاں آنکھوں کے قریب نہایت خفیف سی جھریاں تھیں۔ اپنے وقت میں خالہ قیامت ڈھاتی ہوگی۔ اس نے سوچا۔ یہ ماں جی بھی کیا غضب کرتی ہیں۔ جہاں جاتی ہیں میرے لئے خالائیں، چچیاں، پھوپیاں، بہنیں ڈھونڈھ نکالتی ہیں۔ خالہ؟ اب بھی اس کا قد، بت، رنگ روپ، اٹھان، ایسا ہے کہ کیوں پر سحر طاری کر دے۔

چھایا دیوی نے کہا۔ "اور یہ تیری بہن ہے، ونتی۔"

ونتی سب سے پیچھے کھڑی تھی، اپنا نام سن کر وہ اور بھی پیچھے ہو گئی۔ بالکل لاشعوری طور پر ونتی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور وہ ونتی کو دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔

ماتا جی کہہ رہی تھیں۔ "اور یہ تیری چچی متھرا دیوی ہیں، یہ چچی حسناں بیگم، یہاں کے نائب تحصیلدار صاحب کی بیوی۔ یہ ماتا جی ہیں، پنڈ تائین، پنڈت روپ کش کے گھر سے ہیں۔ یہ کرنیا مالی کی اماں ہیں۔ بیٹا ان سب کو پیری پونہ کرو۔ سنت رام، او سنت رام، کدھر مر گیا۔ سنت رام جلدی سے اس کمرے میں شیام کیلئے پلنگ بچھا دے۔ اور دیکھنا بستر کے اوپر وہ چادر بچھائیو جو ابھی نمی اور ونتی نے مل کر شروع کی تھی۔ بیٹا، راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ ہم نے اسی لئے غلام حسین کو تمھیں لانے کے لئے بھیجا تھا۔ کیونکہ ہم نے سوچا کہ ہماری تبدیلی نئی جگہ ہو گئی ہے۔ تمھیں ادھر آتے ہوئے اور بھی دقت ہو گی۔ یوں تو یہ جگہ بہت اچھی ہے لیکن ۔۔۔" ماں جی بہت سی باتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ عورتیں جو اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوئی تھیں، اب چلنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آنگن میں ایک شور سا بپا تھا۔ لیکن ان تمام چہروں اور آوازوں کے ہجوم میں اسے صرف ایک چہرے کا شدید طور پر احساس تھا۔ لاشعوری طور پر وہ ونتی کی محجوب نگاہیں دیکھ رہا تھا۔ ونتی، جو گویا چھایا کی جوانی تھی۔ اس کی گذری ہوئی رعنائیوں کی مکمل تصویر اور پھر کچھ اس سے بھی زیادہ۔ وہ مسکراہٹ جو ونتی کی اپنی ہی تھی۔ اس کے ہنسنے کا انداز جو سب سے نرالا تھا۔ اسے ان دو آنکھوں کا احساس تھا۔ جو اس ہجوم میں دو شرمیلے ستاروں کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔ اور پھر اسی ہجوم میں گم ہو جاتی

تھیں۔ ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیاں ایک خفیف سا تل، اور تل کے قریب ایک موہوم سی سلوٹ، جیسے ان لبوں کا ایک حصہ مسکرا رہا ہو اور دوسرا حصہ اسی طرح سنجیدہ ہو۔ اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ آیا وہ اب مسکرا رہی ہے یا بدستور سنجیدہ ہے۔

جب سب لوگ چلے گئے، اور خالہ چھایا بھی چلنے کی تیاری کرنے لگی، تو اس کی ماتا نے کہا۔ "بہن۔ اب کھانا کھا کر ہی جاؤ۔ تمھیں تو گوشت پسند بھی ہے۔ اور پھر آج ماش اور چانول پکے ہیں۔ اس کے ساتھ کرم کا اچار۔"

وہ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے اتار کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی کمر سیدھی کرنے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور جب وہ جاگا تو کمرے میں آہٹ سی ہو رہی تھی۔ ونتی کھڑی تھی، کہنے لگی۔ "میری گرگابی کا دوسرا پاؤں نہیں ملتا۔"

اس نے اپنی چارپائی کے نیچے سے گرگابی ڈھونڈ کر نکال دی۔

وہ گرگابی پہننے لگی، جلدی جلدی، اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ لیکن جتنی جلدی وہ گرگابی پہن کر کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھی، گرگابی کی لیس اسی شدت سے بٹن میں بندھ جانے سے انکار کر رہی تھی۔ "اونہہ" کر کے ونتی نے اپنا پاؤں جھٹک دیا۔

"لاؤ، یہ فیتہ میں باندھ دوں۔"

پاؤں کے مرمریں ابھار پر فیتہ بالکل فٹ آیا۔ اوپر دو گول ٹخنے تھے۔ اور ان ٹخنوں کے ساتھ اس کی نگاہوں میں باؤلی کے کنارے کھڑی ہوئی پانی بھرنے والی لڑکی کے بے چین طائر پھڑپھڑانے لگے۔ پیپل کے نیچے ایک بنچ اور سٹیلا کے شہابی رخسار۔ اور اسے اپنی انگلیوں میں تیز خون کی حدت سے جلن محسوس ہونے لگی۔ لیکن اب فیتہ بندھ چکا تھا۔ اور ونتی اسی لمحے فوراً کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ جیسے اس نے ایک بجلی کے کوندے کو لپکتے دیکھا تھا۔ جیسے اس نے تیر کو کمان سے نکلتے دیکھا تھا، جیسے سیاہ آسمان کی تاریکیوں میں اس نے ایک شہاب ثاقب کو نور کی لکیر کھینچتے دیکھا تھا۔

جب وہ کھانا کھا کر سویا تب بھی اس کی آنکھوں میں یہ نور کی لکیر دیر تک کھنچی رہی۔

دوسرے دن بہت سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی مشرق کی طرف کھلتی تھی۔ ابھی ستارے پوری طرح ماند نہ ہوئے تھے۔ اور دور افق پر کالادھاری کی چوٹی کے قریب صبح کا تارا چمک رہا تھا۔ کھڑکی کے گرد داخ کی بیل ایک زمرد کا ہالہ بنائے سو رہی تھی۔ اس کے چوڑے چوڑے سبز پتوں پر اوس کی بوندیں ٹکی ہوئی تھیں۔ اور ان میں اس نے ایک گلدم کو داخ کے قرمزی گچھوں کے درمیان سوئے ہوئے دیکھا۔ گلدم کی چونچ داخ کے دانوں پر ٹکی ہوئی تھی، اور اس کے پر اوس سے بھیگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ نہ جانے یہ گلدم اپنا گھونسلا چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئی تھی۔ شاید اس جنگلی انگور کے قرمزی موتیوں نے اسے لبھا لیا تھا۔ اسی لئے اس کی چونچ ان دانوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ جیسے وہ خواب میں انہیں چوم رہی ہو۔ جیسے وہ اپنے معصوم سپنوں میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ وہ ایک انگڑائی لیکر بستر سے باہر نکلا، اور باغ میں چلا گیا۔ یہ تحصیل تو بہت اچھے مقام پر بنی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ کئی ایکڑ رقبہ زمین ہوگا۔ چاروں طرف ایک وسیع باغ تھا۔ جس کے بیچ میں کچہری تھی۔ نیچے تحصیلدار کے رہنے کا بنگلہ۔ اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا بنگلہ، ایک طرف نوکروں کے کوارٹر، لکڑی کی ریلنگ سے پرے مکی کے کھیت تھے۔ اور دور نیچے گھاٹی پر گھاس لہلہا رہی تھی۔ گھاٹی سے نیچے اتر کر دھان کے کھیت اور پھر وہی ماندر کی ندی اور اس کے پار وہی راستہ جدھر سے وہ کل آیا تھا۔

ابھی چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ جولائی کی بہاریں پر فضا تھیں۔ باغ میں گل داؤدی کی کیاریاں کسی رنگین شطرنج کی بساط کی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ کشمیری سیب ابھی گلابی نہ ہوئے تھے، اور فرنچ سیب تو ابھی بالکل سبز تھے۔ ان کے قریب ہی آڑوؤں کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ

تھا۔ اس جھنڈ کے دامن میں سونف کے پودے کھڑے تھے۔ اور ان کے پرے نیلوفر کی خاردار جھاڑیاں۔ سبزہ یہاں اس قدر گنجان تھا، اور سایہ اس قدر گھنا کہ یہ جگہ سارے باغ سے الگ تھلگ، تاریک اور سکون آمیز معلوم ہوتی تھی۔ پتہ نہیں مالی اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتا۔ ورنہ یہاں اگر تھوڑی سی جگہ صاف کر کے ایک چبوترہ سا بنا دیا جائے تو دوپہر کو پڑھنے کیلئے یہ جگہ سب سے عمدہ رہے گی۔ یہ سوچتا سوچتا وہ گھاٹی سے نیچے اترنے لگا۔ بھیگی ہوئی لانبی گھاس پر پھسلن اس قدر تھی کہ وہ بہت تیزی سے گھاٹی کے نیچے پہونچ گیا۔ یہاں ایک راستہ ٹنگیوں کے درختوں میں سے گزر کر ندی کی طرف جاتا تھا، اور وہ اس راستے پر ہو چلا جہاں ٹنگیوں کے درختوں کی قطار ختم ہوتی تھی۔ وہاں ایک کھیت کی باڑھ کے قریب اس نے ایک نوجوان عورت کو گایوں بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کا ریوڑ باہر نکالتے ہوئے دیکھا۔ اس کے عقب میں ایک بلند و بالا نوجوان نظر آیا۔ گورا رنگ، کٹیلی آنکھیں، اوپر کو مڑی ہوئی مونچھیں، سپید شلوار اور کھلے کالر والی قمیص پہنے تھا۔ اس نے آہستہ سے نوجوان عورت سے کچھ کہا، اور پھر اوپر کی طرف مڑ گیا۔ مڑتے ہوئے اس کی گردن کے قریب بائیں جبڑے کے پاس شیام کو ایک گہری چوٹ کا نشان نظر آیا۔ عورت کا رنگ اڑ گیا تھا، اور وہ شیام کو حیرانی اور غصے کے ملے جلے جذبات سے تک رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا۔ اور اس نے سیاہ سوسی کی قمیص اور اسی کپڑے کی بھاری شلوار پہن رکھی تھی۔ پاؤں ننگے تھے، ہاتھ میں چھڑی۔ رنگ کھلتا سا، چہرے کے خدوخال بے حد متناسب، ٹھوڑی گول نہ تھی، بلکہ نہایت حسین طریق پر خمیدہ جس سے اُس عورت کے عزم کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے شیام کو اس غصے سے دیکھا کہ وہ چند لمحوں کیلئے ٹھٹک گیا۔

وہ بولی۔ "یہ کونسا راستہ ہے۔ یہ راستہ تو ہمارے گھر میں سے گزرتا ہے؟ تم کدھر جانا چاہتے ہو؟"

"میں۔۔۔ میں۔ ندی پر جانا چاہتا تھا۔ اور۔۔۔

"تم کون ہو؟ میں نے تمہیں یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں تحصیلدار صاحب کا لڑکا ہوں کل۔۔۔ کل ہی آیا ہوں۔ معاف کیجئے گا مجھے راستہ بتا دیجئے۔"

اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"تمھیں میرے نام سے کیا۔" اس نے تنک کر کہا۔

"وہ صاحب غالباً آپ کے خاوند تھے۔ وہ گورے چٹے جوان، جن کی گردن پر کسی چوٹ کا نشان ہے۔ جو ابھی آپ سے جدا ہوئے۔" شیام نے شریر لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں۔ وہ یہاں کے تھانیدار ہیں۔ یار احمد خان وہ بھی آپ ہی کی طرح راستہ بھول کر ادھر آنکلے تھے۔" جواب دیتے دیتے اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اور وہ زور زور سے بھینسوں کو لکڑی سے پیٹنے لگی۔

ندی پر پہونچ کر وہ ریوڑ کو پانی میں سے گزارنے لگی۔ نیچے ندی کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ نیلے پتھر کئی جگہوں پر سطح آب سے اوپر اٹھا آئے تھے۔ گائیں بھینسیں یہیں سے گزر رہی تھیں۔ اس جگہ سے اوپر کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر ایک بہت بڑی ڈاب تھی۔ یہاں پانی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس ڈاب کے اوپر پانی ایک ڈھلان سے نیچے بہتا تھا۔ اور اس ڈاب میں داخل ہو جاتا تھا۔ اور جہاں یہ ڈاب ختم ہوتی تھی وہاں گاؤں کے لوگوں نے پتھروں کا بند باندھ دیا تھا۔ تاکہ ڈاب کا پانی ہمیشہ گہرا رہے۔ نیز زیریں حصے میں پانی کم رہے تاکہ مویشیوں کو پار لے جانے میں آسانی ہو۔

"اس ڈاب کا کیا نام ہے؟"

"سنتھال۔"

"تیرنے کے لئے بہت عمدہ جگہ معلوم ہوتی ہے۔"

"کیا کہا۔"

"کچھ نہیں۔ آئی ایم وری ساری۔"

وہ عورت مسکرانے لگی۔ "میں یہاں ہر روز صبح نہاتی ہوں۔ اور ان اوپر کی چٹانوں سے چھلانگیں لگاتی ہوں۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا۔ آج تم آگئے ہو، تحصیلدار کے بیٹے تو تم ہو، لیکن تمہیں ہم غریب لوگوں کو اس طرح تنگ نہ کرنا چاہیئے۔"

شیام نے کہا۔ "تم مجھے اپنا نام بتا دو میں ابھی واپس چلا جاؤں گا۔ میں تو یوں ہی صبح صبح سیر کے لئے نکلا تھا۔ کوئی کام نہ تھا۔ اور۔۔۔ آخر نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے۔ تم نہ بتاؤ گی تو تھانیدار سے پوچھ لوں گا۔"

"نوراں۔" اس نے چھڑی کو ہوا میں پھینکتے ہوئے کہا۔

اور وہ راستے پر مڑ گیا۔

بلحاظ آبادی ماندر ایک گاؤں ہی تھا۔ لیکن تحصیل کا صدر مقام ہونے سے اس میں ایک قصبے کے بہتیرے لوازم موجود تھے۔ تھانہ، تحصیل، شفاخانہ، کسٹم کی چوکی، جنگلات کا مقامی دفتر، شراب اور افیون کا ٹھیکہ، غرضیکہ حکومت کے سارے نمائندہ شعبۓ یہاں موجود تھے۔ بازار میں سوڈا واٹر کی ایک دکان بھی تھی۔ یہ بازار روڑی نالے اور ماندر ندی کے درمیان ایک تنگ سی تلیٹی پر واقع تھا۔ اور دو دفعہ شدید طغیانی آجانے پر بہہ گیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں دکانداروں کو یہ جگہ کیوں اتنی عزیز تھی۔ کیونکہ دو دفعہ طوفان کی نذر ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے پھر بازار یہیں تعمیر کیا تھا۔

دراصل روڑی نالے اور ماندی کے اتصال پر ماندر کے گاؤں کی حد شروع ہوتی تھی، اس لئے بازار بھی موقع پر تھا۔ کیونکہ باہر سے آنیوالے کسان اور گوجر سب سے پہلے اسی بازار میں آتے تھے اور پیشتر اس کے کہ سرکاری محکموں کے لوگ انہیں پھانسیں، بازار والے جہاں تک ان سے بن پڑتا تھا، ان کسانوں اور گوجروں کی متاعِ عزیز پر ہاتھ صاف کر لیتے تھے۔ روڑی نالے کے پار چھایا کا گھر تھا۔ اور اس کے بھائی روشن کی دکان، گویا ایک طرح سے روشن اور اس کی بہن گاؤں کی سرحد سے باہر تھے۔ انکے گھر کے بالکل قریب ہی ماندر کی ندی ایک خطرناک خم کھا کر مڑتی تھی۔ یہ ندی شمال مشرق سے آ رہی تھی۔ میلوں تک وسیع کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اور دور مشرقی افق پر نیلا دھاری کی چوٹی سربلند کئے کھڑی تھیں۔

بازار کے مغرب میں ایک وسیع تلہ تھا، یہ جگہ چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی یا دورے پر آنے والے افسروں کے کیمپ کی جگہ۔ کبھی کبھار اگر کوئی میلہ ہوا تو وہ بھی یہیں لگتا تھا۔ اس تلے سے پرے مغرب میں ایک اور بلند گھاٹی تھی، یہاں گھاٹی کے اوپر پنڈت سروپ کشن کا گھر تھا، اس کے قریب اور بہت سے براہمنوں کے گھر تھے۔ گھاٹی کی سطح مرتفع پر بھی دھان اور مکی کے کھیت تھے۔ یہ سطح مرتفع بلند ہوتے ہوتے ایک طرف تورھڑے کے گاؤں سے مل جاتی تھی، اور دوسری طرف ڈھلوان ہو کر ماندر کے بڑے میدان سے ملحق ہو جاتی تھی۔ جہاں تحصیل اور دیگر سرکاری دفاتر تھے۔ یہیں پر امیر مہاجنوں کے گھر تھے۔ جنوب مغرب میں یہ سطح مرتفع گھٹتے گھٹتے ایک اور چھوٹے سے میدان سے جا ملتی تھی۔ جس کے آخری کنارے پر ماندر کی ندی چکر کاٹ کر پھر آملتی تھی۔ گویا

ماندر گاؤں ایک جزیرہ نما تھا جس کے تین اطراف میں یہ ندی تھی۔ مغرب میں رھڑے کے گاؤں کا پہاڑ۔ اس جنوب مغربی میدان میں پانی کے تین نہایت مصفا چشمے بہتے تھے۔ گاؤں والوں کی نفاست طبع ان ناموں سے ظاہر ہوتی تھی جو انہوں نے چشموں کے رکھ چھوڑے تھے۔ سب سے بڑے چشمے کا نام "چھوہارا" یعنی "کھجور" اس سے چھوٹے چشمے کو لوگ "بادام" کے نام سے پکارتے تھے۔ تیسرے اور آخری چشمے کو لوگ "موتی چور" کہتے تھے۔ موتی چور اور باقی دونوں چشموں کا پانی مل کر کھیتوں میں سے بہتا ہوا ماندر میں جا گرتا تھا۔ یہاں منو کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اور دو پن چکیاں۔ منو کے درختوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے، اور اس جھنڈ کے سائے میں دوپہر کے وقت گڈریئے اپنے ریوڑوں سمیت سویا کرتے تھے۔ کبھی کبھی، جب ترنگ آتی تو چرواہیں پینگیں بڑھاتیں، اور منو کی شاخوں کو چھونے کی کوشش کرتیں۔ گڈریئے گھٹنوں تک پانی میں کھڑے ہاتھوں سے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے اور کئی تو اس کام میں اتنے مشاق ہو گئے تھے، کہ ہاتھوں سے پکڑ کر یا پتھر مار کر مچھلی کو پانی میں زخمی کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ جاں بلب ہو کر سطح پر تیرنے لگتی، پھر وہیں کہیں چولھا گرم کیا جاتا، اور پن چکی والوں سے توا مانگ کر مچھلیاں بھونی جاتیں۔ مکی کی روٹیاں اور سبز مرچیں اور پیاز، اور وہ سوچنے لگا کہ ان گڈریوں کی زندگی میں جہاں ڈکراتی ہوئی کالی بھینس اور پھٹے پرانے کپڑے ہیں، وہاں الغوزے کا وحشی نغمہ، ایک خوبصورت آوارگی، اور رسم ورواج سے آزاد عشق کا غیر ذاتی جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی مہذب زندگی کا اس بربری مسرت سے موازنہ کرنے لگا۔۔۔

اب اس کا معمول ہو گیا کہ وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر آڑوؤں کے جھنڈ میں آ بیٹھتا۔ اور کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔ کریم مالی سے کہہ کر اس نے یہاں ایک چھوٹا سا چبوترہ بنوا لیا تھا، یہ جگہ باغ سے الگ تھلگ اور بالکل اوٹ میں تھی۔ اور دوپہر کتاب پڑھنے میں یا اونگھتے سو جانے میں گزر جاتی۔ کبھی کبھی وہ کسی شاخ سے ایک آڑو توڑ لیتا اور اسے چاقو سے تراش کر کھانے لگتا۔ سونف کے پودوں کی ہلکی ہلکی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی معلوم ہوتی۔ اور کبھی کوئی بلبل پتوں میں چھپی ہوئی چہچہا اٹھتی۔ قدرت بیحد رنگین اور جاذب نظر معلوم ہوتی، اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک جاں بخش طمانیت اور سرور کا احساس ہوتا۔ پتہ نہیں، کیٹس کو بلبل کا نغمہ سن کر کیوں موت کا خیال آیا تھا۔ بلبل تو ایک بے ضرر سا جانور ہے۔ نہایت میٹھے سروں اور اکثر ایک ہی لے میں گاتی ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ بلبل صرف رات کو گاتی ہے۔ وہ دوپہر کو صبح کو شام کو، جب اس کا جی چاہے گاتی ہے، اور گاتی بھی نہیں ہے، بلکہ چہچہاتی ہے، اس کا چہچہانا خوشگوار ہوتا ہے۔ اسی لئے کانوں کو برا معلوم نہیں ہوتا۔ ورنہ جس طرح وہ ہمیشہ ایک تال میں ایک ہی لے میں چہچہاتی ہے، اگر اس کی آواز بھی میٹھی نہ ہو تو آدمی بلبل کے گانے سے بھی اکتا جائے۔ اور اس کا جی تو کبھی بلبل کے گانے کو سن کر مرنے کو نہیں چاہا۔ وہ تو جینا چاہتا ہے۔ دنیا میں بہت سے کام کرنا چاہتا ہے۔ پتہ نہیں کیٹس کو یہ کیا سوجھی کہ پچیس سال کی عمر ہی میں بلبل کا نغمہ سن کر مرنے کی ٹھان لی، اور پھر آخر بلبل کا نغمہ کوئی اتنا شیریں بھی تو نہیں۔ اس نے جنگل کے کئی اور پرندوں کی بولیاں سنی تھیں۔ جو بلبل سے بدرجہا شیریں تھیں۔ دراصل اس بلبل کو یونہی شاعروں نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ورنہ ایمان کی بات یہ ہے کہ سردی کی یخ بستہ راتوں میں جب سارا جنگل خاموش ہوتا ہے، تو چڑھ کی

مدھم سائیں میں بُلبل کے نغمے سے زیادہ مٹھاس ہوتی ہے، جب برسات کی نرم پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔ اس پھوار کی مدھم لے میں جھینگروں اور مینڈکوں کی مسلسل آواز ایک ایسا رومانی تاثر پیدا کرتی ہے کہ بلبل کا نغمہ اس کے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ سوا سترہ ہزار فٹ کی اونچائی پر برفستان کی خوفناک تنہائیوں میں کسی چیل کی آواز کانوں کو بلبل کے نغمے سے بھی زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بلبل کے نغمے کا صوتی تجزیہ کرنے لگا۔ کہ شاید کہیں اس میں موت کی آواز کی بازگشت سنائی دے۔ بلبل بول رہی تھی۔ چک چک چوں رُوں رُوں۔ چک چک چوں روں روں، موت کی آواز؟ واہیات!

یکا یک اس کے کانوں میں ایک اور آواز آئی۔ ”سلام بابوجی!

اس نے آنکھیں کھولدیں، بلبل کا نغمہ جیسے دور گم ہوتا گیا۔ اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ ہات میں درانتی لئے ہوئے سونف کے پودوں کے پاس کھڑی تھی۔ جوان تھی۔ لیکن جوانی میں ادھیڑپنے کے آثار نمایاں تھے۔ جیسے وہ وقت سے پہلے زمانہ بلوغت میں پہونچ گئی تھی۔ اور اب وقت سے پہلے زمانہ بلوغت سے نکل کر ادھیڑپنے میں داخل ہو جانا چاہتی تھی۔ ماتھا فراخ تھا، مانگ سیدھی، لیکن کانوں پر بال بے شمار مینڈیوں میں گندھے ہوئے تھے۔ ان مینڈیوں کو گوندھ کر اس نے انہیں کانوں کے اوپر لپیٹ رکھا تھا۔ بالوں کا یہ فیشن اسے اب معلوم ہوا نیا نہ تھا، بہت پرانا تھا۔ ورنہ پہلے وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہ جو کالج کی شوخ لڑکیاں اور میمیں اس طرح اپنے بال سنوارتی ہیں یہ کوئی بہت ہی بلند قسم کی جدت ہے۔ جدت؟ معلوم ہوتا ہے کہ جدت اس دنیا میں کہیں نہیں ہے اس عورت کے بال سَتّھے سے چپڑے ہوئے تھے۔ کنپٹیوں اور رخساروں پر بھوری بھوری جھائیاں تھیں۔ لب نیلے، ناک ستواں، آنکھیں اب بھی جاذب نظر تھیں۔ لیکن بھوؤں کے کناروں پر آنکھوں میں، سارے چہرے پر ایسی ناامیدی کا پرتو تھا، جیسے اس عورت کو زمانے نے بہت بری طرح استعمال کیا ہے۔ گردن کا گوشت ڈھلک رہا تھا اور اُسے چھپانے کے لئے اس نے سبز منکوں کی چھ لڑیوں والی مالا پہن رکھی تھی۔ ایسی مالا جو کسی زمانہ میں ملکہ میری کی تصویروں میں نظر آتی تھی۔ سرخ چھینٹ کی قمیص کے نیچے چھاتیاں ڈھلکی ہوئی تھیں۔ رنگ کبھی گورا ہوگا۔ اب جیسے اس رنگ میں کسی نے کیچڑ ملا دی تھی۔

اس نے اپنی درانتی ایک دو بار بے چینی سے ہلائی۔ وہ شاید اس کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لا سکی

تھی۔ اس کے رخساروں پر ایک ہلکی سی سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔ اور وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ یہ عورت اب بھی شرما سکتی ہے۔ جب تک عورت شرما سکتی ہے اس وقت تک اس کی فطری پاکیزگی سے ناامید نہ ہونا چاہئیے۔

”میرا نام سیداں ہے۔ میں کریم مالی کی بہو ہوں۔“ وہ درانتی ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اباجی نے مجھے بھیجا ہے کہ میں ان سونف کے پودوں کو یہاں سے کاٹ دوں۔“

”اچھا تو تم سیداں ہو۔“ وہ سیداں کی رام کہانی پہلے غلام حسین سے سن چکا تھا۔ لیکن اب تک اس نے سیداں کو دیکھا نہ تھا۔ ہاں، غالباً یہی عورت سیداں ہو سکتی تھی۔ ”اچھا تو تم سیداں ہو۔“ اس نے اپنے لفظوں پر زور دیکر کہا تا کہ سیداں جان جائے کہ وہ جانتا ہے۔ کہ وہ کیا جانتا ہے۔ ”عبدل کی بیوی۔“

”جی ہاں“ سیداں نے نگاہیں نیچی کر لیں اور قمیص کو کونوں پر سے کھینچنے لگی۔

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”ذرا خیال رہے کہ یہ سونف کے پودے سارے نہ کاٹ ڈالنا۔ ورنہ اس کنج کی ساری مہک جاتی رہے گی۔ ذرا انہیں چھدرا کر دو بس۔“

سیداں سونف کے پودے کاٹنے لگی چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے بے جھجک پوچھ لیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم اپنی شادی کے کچھ عرصے کے بعد کسی پولیس کے سپاہی کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔“

”ہاں، یہ صحیح ہے۔“ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”پھر کیا ہوا۔ تم واپس کیوں آ گئیں۔ کیا اس نے تمھیں چھوڑ دیا۔ یا تمہیں اس سے محبت نہ تھی۔“

وہ پودے کاٹتے کاٹتے رک گئی۔ اور درانتی کو زمین پر رکھ کر بولی ”مجھے اس سے محبت تھی؟ یا شاید وہ دن ہی اور تھے؟“ اس نے اک آہ بھر کر کہا۔ ”تب وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔“

”پھر؟“

”ہم دونوں یہاں سے بھاگ گئے۔ وہ پولیس میں ملازم تھا۔ اس کے خلاف رپورٹ ہوئی۔ اغوا کا کیس تھا۔ میں کسی دوسرے کی بیاہتا تھی۔ ہم دونوں قصوروار تھے۔ جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ پھر ہم یہاں سے بچ کر بہت دور دوسرے علاقے میں چلے گئے جہاں ہمیں کوئی پہچانتا نہ

تھا۔"

چند لمحے خاموش رہی۔

پھر وہ بولی۔ "میں تو غریب گھر کی لڑکی تھی۔ محنت مزدوری سے مجھے کوئی عار نہ تھا۔ لیکن وہ پولیس میں رہ چکا تھا۔ مفت مال ہڑپ کرنے کا اور لوگوں پر رعب جمانے کا اسے چسکہ لگا تھا، اب وہ ایک بھاگے ہوئے ملزم کی طرح گھوم رہا تھا۔ اسے اپنی نوکری چھن جانے کا بہت غم تھا۔"

"لیکن تب بھی وہ تمہیں پیار کرتا ہوگا نا۔"

"ہاں بہت پیار کرتا تھا۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "فاقے کراتا تھا، ہر روز پیٹتا تھا، ہر روز رات کو ہم بستری کرتا تھا۔۔۔ تھوڑے ہی عرصے میں زندگی تلخ ہوگئی۔ پھر میں اسے چھوڑ کر بھاگ آئی۔ یہاں میرے خاوند نے میرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔" وہ اور بھی تلخ لہجے میں بولی پھر ایک دم چپ ہو کر پودوں کو چھدرا کرنے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "سچ ہے، محبت کو بھی روٹی کی حاجت ہے، محبت بھی چاہے وہ کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو، محض خالی خولی ہم بستری کے سہارے نہیں جی سکتی۔ عشق کو بھی روٹی چاہیئے۔"

"جی ہاں، بابو جی، جب تک پیٹ میں روٹی نہ ہو، کوئی بات نہیں سوجھتی۔۔۔ لیکن آدمی جوانی میں، جب خون میں آگ ہوتی ہے، کبھی کبھار کوئی ایسی بات کر بیٹھتا ہے کہ پھر اسے ساری عمر پچھتانا پڑتا ہے۔۔۔ یہ آپ کے ہاں جو چھایا آتی ہے، اس کے ساتھ بھی ایک ایسی ہی واردات ہو چکی ہے۔"

"موسی چھایا کے ساتھ؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اُس نے نہایت تیقن سے ایک معاندانہ مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اسی، آپ کی موسی چھایا دیوی کے ساتھ۔ یہ پہلے اپنے خاوند کے ہمراہ موضع گوراہ میں رہتی تھی۔ وہاں اسے ماسٹر امجد حسین سے جو آج کل یہاں لگا ہوا ہے، عشق ہو گیا تھا۔ بڑی مدت چرچا رہا اس بات کا۔ یہ گھر سے بھاگ کر دو دن ان کے پاس بھی رہی۔ لیکن بعد میں اس کے خاوند نے بہت شور مچایا۔ اور ان کی برادری کے براہمنوں نے وہ اودھم مچایا کہ امجد حسین کو چپکے سے گوراہ سے چلا جانا پڑا۔ آپ کو پتہ نہیں اس بات کا؟؟"

"نہیں تو۔"

"سارا گاؤں اس بات کو جانتا ہے۔ برادری، اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔ گاؤں کے باہر روڑی کے نالے پر اس نے اپنا مکان بنا رکھا ہے۔ وہیں یہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ خاوند نے اسے نکال دیا ہے۔ بہت مدت ہوئی یہ اس سے بچھڑ چکی ہے۔ اور اب یہاں اپنی لڑکی ونتی کے ساتھ رہتی ہے' جیالال اس کے بڑے بھائی کا نام ہے، وہ ان دونوں ماں بیٹیوں کی خبر گیری کرتا ہے۔ ورنہ اگر برادری کا بس چلے تو انہیں گاؤں سے ننگا کر کے نکلوادیں۔ یہ برہمن لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں جی، مگر ایمان کی بات ہے کہ یہ عورت بھی بڑی جیدار ہے۔ کیا مجال کہ کسی کے سامنے دبے۔ اس کے خاوند نے اسے پرائیچت کرنے کو کہا تھا۔ لیکن یہ نہ مانی۔ یہاں بھی برادری کہتی ہے کہ پرائیچت کرلو۔ اور اپنی لڑکی کو پنڈت سروپ کشن کے لڑکے درگاداس سے بیاہ دو۔ مگر یہ عورت ہے کہ نہ پرائیچت کرتی ہے، نہ اپنی لڑکی کا گونہ پنڈت سروپ کشن کے لڑکے کو دینے پر رضامند ہوتی ہے۔ گاؤں کے باہر اپنے بھائی کے ساتھ اس کی اپنی الگ دکان ہے۔ وہاں خود دکان پر بیٹھتی ہے۔ اور سب گاہکوں سے بڑی ہوشیاری سے نبٹتی ہے۔ اور دیکھئے نا، یہاں بھی اگر برادری ناراض ہے تو کیا ہوا۔ اس نے پلڑا برابر رکھنے کے لئے یہاں سب سرکاری افسروں سے بنا رکھی ہے۔ دیکھئے آپ کے گھر کس طرح آتی جاتی ہے۔ خالہ بنی ہوئی ہے۔ چڑیل کہیں کی۔ کٹنی۔ کیسے ہر وقت لتر لتر باتیں بناتی ہے۔ جو پہلے تحصیلدار تھے، انکے گھر میں بھی اسی طرح خالہ بہن بنی ہوئی تھی۔ دوسرے افسروں کے ہاں بھی بے روک ٹوک آتی جاتی ہے۔ دوپٹہ دیکھئے کس طرح سنوار کر اوڑھتی ہے۔ ایک پلو ٹخنوں تک آتا ہے۔ اور کس بانکپن سے مٹک مٹک کر ترچھی چلتی ہے، مومولے کی طرح۔ مجھے اس کا چلنا ذرا اچھا نہیں لگتا۔ آخر عورت کو کچھ تو شرم و حیا چاہیئے۔ لیکن اس نے تو بالکل ہی اگ سگ گنوا دی ہے۔"

اس نے سیداں کے نسائی حسد کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ان براہمنوں سے میل ملاپ کیوں نہیں کرلیتی۔ آخر اسے اس گاؤں میں رہنا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ۔ افسر لوگ تو چلتی پھرتی چھاؤں ہیں، آج یہاں، کل وہاں، اور پھر سرکاری عہدیداروں کا کیا اعتبار۔ پرائیچت کرلے ہرج ہی کیا ہے۔"

"پرائیچت کیسے کرے۔" سیداں نے اور قریب سرک کر کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ اس کی امجد حسین سے بدستور آشنائی ہے۔ وہ چاہے اس کی اتنی پروانہ کرتا ہو لیکن یہ اس پر جان چھڑکتی

ہے۔ وہ اب بھی اس کے گھر آتا جاتا ہے۔ یہ اس کی ہر طرح خاطر و مدارت کرتی ہے۔ اگر اسے روپے پیسے کی بھی ضرورت ہو تو انکار نہیں کرتی۔ امجد حسین شادی شدہ ہے۔ اس کا لڑکا بنا ہے، ادھر آپ کے لاہور میں پڑھتا ہے۔ یہ اس لڑکے کے لئے بھی خرچہ دیتی ہے۔ مالدار عورت ہے۔۔۔ہاں آں، دکان بڑی اچھی طرح چلاتی ہے۔ بڑے بڑے ہوشیار مہاجنوں کے کان کاٹتی ہے بلکہ میرے خیال میں تو اس کے بھائی جیالال کی دکان اتنی اچھی نہ چلتی ہوگی۔ گاہکوں کو میٹھی میٹھی باتیں کر کے لبھا لیتی ہے۔"

شیام نے کہا۔ "پرایشچیت کرے۔ یہاں کون پوچھتا ہے۔ اور ونتی کی شادی بھی پنڈت سروپ کشن کے لڑکے سے کردے۔ بس پھر چین ہی چین ہے۔"

سیداں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بابو جی۔ یوں دیکھا جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے،" "دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ پنڈت سروپ کشن ہی کو لے لو۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا کمینہ آدمی نہیں دیکھا۔ یوں جب دیکھو ماتھے پر تلک، سفید براق اچکن، صافہ گلے میں حمائل، لبوں پر متین مسکراہٹ، ہمیشہ بگلے بھگت نظر آتے ہیں۔ لیکن بابو جی کیا بتاؤں، بس کچھ نہ پوچھئے۔ بڑا بد چلن ہے۔ سیداں سب کچھ جانتی ہے۔ اس گاؤں کے بچے بچے کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے، یہ پنڈت جی ونتی کا گونہ کیوں مانگتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے لڑکے درگا داس کو اور کوئی لڑکی نہیں دیتا۔ گو یہاں براہمنوں کی برادری کے سردار ہیں، لیکن اس کے لڑکے کی اور کوئی منگنی نہیں آتی۔ سبھی کنی کاٹ جاتے ہیں۔ آپ نے درگا داس کو دیکھا ہے۔ دائیں آنکھ سے کانا اور پھر لنگڑا کر گھسٹتا ہوا چلتا ہے۔ بڑی عجیب شکل ہے اس کی۔"

یہ کہہ کر سیداں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر یکایک اس نے اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی کو روک لیا۔ اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "یونہی آپ کا اتنا وقت ضائع کیا ہے اور ابھی یہ جھنڈ سارا ٹھیک کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز درانتی چلانے لگی۔

جولائی کے اواخر میں جب گھاٹیوں کی لمبی لمبی گھاس میں سرکنڈے نکلنے شروع ہوئے، سبز ناخوں میں میٹھا رس اترنے لگا، اور سیبوں کی رنگت گلابی ہونے لگی، اسے نائب تحصیلدار نے شکار پر مدعو کیا، وہ شکاری نہ تھا۔ گو وہ بندوق اچھی طرح چلا لیتا تھا۔ لیکن شکار کرنے میں اسے کوئی خاص لطف نہ آتا تھا۔ اور نہ ہی وہ جنگل کے نہتے جانوروں کو کسی درخت کی اونچی مچان پر بیٹھ کر بندوق کی گولی سے ہلاک کرنے کو انسانی بہادری یا شجاعت کی معراج خیال کرتا تھا۔ لیکن علی جو، نائب تحصیلدار، جہاں ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا حساس فرد تھا وہاں وہ ایک مشاق شکاری بھی تھا۔ اور اکثر دسویں پندرھویں دن شکار پر جایا کرتا تھا۔ اب کے شیام نے اس لئے دعوت منظور کر لی کہ جائے شکار ماندر سے بہت قریب تھی، کوئی تین چار میل کی دوری پر سوائی کا گھنا جنگل تھا۔ جہاں تیتر لومڑی، سور اور ریچھ بافراط ملتے تھے۔ اس نے سوچا، چلو اچھی خاصی پکنک رہے گی۔ اور پھر نائب تحصیلدار علی جو کو وہ پسند بھی کرتا تھا اور اکثر اس سے دلچسپ ادبی اور فلسفیانی بحثیں رہا کرتی تھیں۔ وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ اس نے سوچا۔

وہ رات انہوں نے سوائی کے جنگل میں گزاری۔ ایک چھوٹے سے ٹلے پر خیمہ لگایا گیا۔ اور اس کے چاروں طرف ایک حلقے کی شکل میں آگ سلگا دی گئی۔ چوکیدار بھی آگ کے قریب تعینات کر دیئے گئے۔ تاکہ کبھی کھٹکا ہو تو فوراً اطلاع دیں۔ جنگل کے جانور آگ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس لئے شکاری رات کو اپنے قریب آگ سلگا کر سوتے ہیں۔ اگر جنگل زیادہ خطرناک ہو، اور اس میں شیر، چیتے یا ہاتھی ہوں تو آگ کا ایک حلقہ کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ دو تین حلقے آگ کے خیمے کے گرد بنا دیئے جاتے ہیں، کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شیر یا چیتے نے آگ کے ایک حلقے کو پار کر کے شکاری

کو خود شکار کر لیا ہے۔ لیکن یہ سوائی کا جنگل اس قدر خطرناک نہ سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی لئے یہاں آگ کا ایک ہی حلقہ کافی سمجھا گیا۔

نائب تحصیلدار علی جُو ایک دلچسپ انسان تھا۔ میانہ قد، بھاری فربہ جسم، جو شراب کے استعمال سے اور بھی فربہ ہوتا جا رہا تھا۔ سانولا رنگ تھا۔ چگی ڈاڑھی۔ پانچوں وقت نماز ادا کرتا تھا۔ نچلے جبڑے میں بائیں طرف ہونٹوں کے کونے کے قریب ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ اور جب وہ بے خیالی میں زور سے اندر سانس کھینچتا تو اس ٹوٹے ہوئے دانت والی جگہ سے ایک عجیب سیٹی کی سی آواز پیدا ہوتی۔ فلسفے اور ادب میں خاصی دسترس رکھتا تھا۔ طبابت کا بھی شوق تھا۔

"لیکن آپ طبیب کب سے بنے؟" شیام نے خیمے کے فلیپ کو رسی سے باندھتے ہوئے پوچھا۔

وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ علی جو اپنے ٹوٹے ہوئے دانت سے سیٹی بجا کر بولا۔ "ہوں؟"

"میں نے کہا آپ طبیب کب سے بنے۔"

"بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ پرانے زمانے میں آپ کو معلوم ہے، طب اور فلسفہ اور ادب اکٹھے پڑھائے جاتے تھے۔ دراصل حکمت، فلسفہ اور ادب ایک ہی علم خیال کیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم تو انگریزوں کے وقت کی ہے، ورنہ پہلے ایک حکیم شاعر بھی ہوتا تھا۔ اور فلسفہ داں بھی۔۔۔ بات دراصل یہ ہے شیام صاحب کہ اس علم کی لغو تقسیم جو آپ آجکل دیکھ رہے ہیں۔ مغربی تہذیب ہی کا ایک شاخسانہ ہے۔ زندگی بدتر ہوتی جا رہی ہے۔۔۔"

"یوں، کہیئے کہ زندگی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس علم میں اب اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ ہمیں اس کی تین شاخیں بنانا پڑی ہیں۔ اور اب یہ تینوں شعبے ادب، فلسفہ اور حکمت اس قدر وسیع ہو گئے ہیں، کہ کسی ایک کا مطالعہ بھی برسوں کا کام ہے۔ اس سے کم نہیں۔ اسے انسانی ترقی سمجھئے۔" شیام نے جواب دیا۔

"انسانی ترقی نہیں۔ میں تو اسے ترقی معکوس سمجھتا ہوں۔ ایک طبیب اس وقت تک صحیح طبیب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ تھوڑا بہت ادیب اور فلسفہ داں نہ ہو۔ اور یہی میں ایک اچھے ادیب یا فلاسفر کے لئے ضروری سمجھتا ہوں، اسے علم کے ان باقی دو شعبوں سے بھی آگاہ ہونا

چاہئے۔ ورنہ اس کا تجزیہ، اس کا مطالعہ، اس کا ادراک ادھورا رہ جائے گا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ زندگی اب بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اب اس شکار کے مسئلے ہی کو لیجئے۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ جاگیر تھا۔ میرا مطلب ہے یہ علاقہ ابھی باقاعدہ ریاست نہ بنا تھا۔ اس وقت آپ شکار کا مزہ دیکھتے۔ اب دیکھئے ہمارے پاس لے دے کر صرف دس بارہ آدمی ہیں، اب ان دس آدمیوں سے شکار میں کیا خاک لطف آ سکتا ہے۔ شکار کرنے کا لطف تو جب ہے کہ چار پانسو آدمی ساتھ ہیں، لاٹھیاں یا بندوقیں ہات میں لئے ہوئے جنگل کا پتہ پتہ چھان مارتے ہیں۔ آوازیں دیتے ہوئے ایک طرف سے شروع ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایک نیم دائرے کی صورت میں جنگل کے ایک کنارے سے شروع ہوتے ہیں، اور شکاریوں کے مچان کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں۔ جنگلی پرند، چرند، جانور، سبھی اسی نیم دائرے کو بڑھتا دیکھ کر مخوف ہو کر اسی نیم دائرے کی قوس کے آگے بھاگتے ہیں، اور سیدھے وہاں آ جاتے ہیں۔ جہاں انہیں لانا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی شکار کی مچان کی طرف۔ بس پھر وہ بندوقیں چلتی ہیں۔ ڈز۔ ڈز۔ ڈز۔ سارا جنگل گونج اٹھتا ہے۔ سور چیخیں مارتے ہیں، زخمی چیتے غراتے ہیں، ریچھ مرتے مرتے جھاڑیوں سے الجھتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے اس آفت ناگہانی سے پناہ مانگتے ہوئے اپنی مردہ ماؤں کے تھنوں کو سونگھتے ہیں اور جھاڑیوں میں چھپتے پھرتے ہیں، اور بیحد حیران ہوتے ہیں۔ ایک چاڑھ میں بیس تیس جنگلی جانور شکار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت مزہ تھا شکار کا۔ اب کیا ہے۔ دس بارہ آدمی، مردہ دلی سے کام کرتے ہیں۔ کہیں مچان غلط بندھی ہوئی ہے، کہیں شکار کا پتہ ہی نہیں۔ شکار ہے تو ہنکئے اس قدر کم ہیں کہ کوئی سڑا بُسا گیدڑ ہی قابو میں آتا ہے۔ اب گیدڑ یا خرگوش کا شکار بھی کوئی شکار ہے؟ بات دراصل یہ ہے شیام صاحب کہ اب شکار شکار نہیں رہا۔ بلکہ اک گناہ بے لذت۔" اور علی جُو کے منہ سے پھر سیٹی کی آواز نکلنے لگی۔

"جاگیردار کے وقت میں تو بیگار سے کام لیا جاتا ہو گا۔" شیام نے پوچھا۔

"ہاں، پولیس والے گاؤں کے گاؤں باندھ لاتے تھے۔ جو سامنے آیا لاٹھی سے آگے دھکیل لیا گیا۔ اس طرح شکار ہوتا تھا۔ سینکڑوں آدمی ہنکئے بنے ہوئے ہیں، جاگیردار صاحب کیلئے مضبوط مچانیں بنائی جا رہی ہیں۔ انکے عملے کیلئے دودھ مکھن، مرغیاں، انڈے، عورتیں، شراب، ہر چیز بافراط مہیا کی جا رہی ہیں، جب جا کر کہیں شکار ہوتا تھا۔"

"لیکن جاگیردار تو بدستور موجود ہیں۔"

"ہاں، لیکن یہ تو میں بندوبست سے پہلے کی بات کرتا ہوں۔ ریاست بن جانے کے بعد اب وہ بات نہیں رہی۔ اور پھر اب لوگ بھی وہ نہیں رہے۔ رعیت اپنے آپ کو رعیت نہیں سمجھتی۔"

شیام نے کہا۔ "اسے بھی انسانی ترقی سمجھئے۔ عوام میں سیاسی بیداری پھیل رہی ہے۔"

"سیاسی بیداری! اجی صاحب! یہ بس نئی اصطلاحیں ہیں، اور کیا، میں خوب سمجھتا ہوں یہ سیاسی بیداری! جہاں پہلے جاگیردار لوٹتے تھے، وہاں اب لیڈر لوٹتے ہیں۔ عوام تو ایک غیر منظم، منتشر قوت ہے۔ اسے سنبھالنا، اسے استعمال کرنا چند سمجھدار لوگوں کا کام رہا ہے۔ شروع سے چند لوگ بہت سے لوگوں پر حکومت کرتے آئے ہیں، ہمیشہ سے، چاہے یہ حکومت جاگیردارانہ ہو، یا جمہوریت، یا آمریت، شیام صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں ہیں۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، انہیں اپنے قابو میں لانے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ حاکموں نے حکومت کرنا چھوڑ دیا۔ ورنہ حالات کبھی ایسے نہ ہوتے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے بھی یہی لوگ تھے، دم نہ مار سکتے۔ اور یہ شکار بھی تو ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کا ایک حربہ تھا۔ سینکڑوں آدمی اس کام پر لگائے جاتے تھے۔ انہیں بید اور ڈنڈے کی سزا دی جاتی تھی۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو چند راتوں کے لئے گھر سے بے گھر کیا جاتا تھا۔ تب جا کر کہیں ان لوگوں کے دلوں میں حکومت کا رعب بیٹھتا تھا۔ اور وہ نہایت خوش ہو کر لگان، بیگار، چنگی، جنگل کا محصول اور دیگر ٹیکس اور محاصلات ادا کرتے تھے۔ اور اب دیکھئے حاکموں نے شکار کھیلنا بھی ترک کر دیا ہے۔ اب لوگ لگان، مالیہ ادا کرنے سے انکار کرتے پھرتے ہیں۔ یہ ٹیکس معاف کر دو، وہ محصول اڑا دو۔ بھلا اس طرح بھی کبھی حکومت ہوئی ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ دو چار سال اور رہ گئے ہیں پھر آرام سے پنشن پا کر گھر چلے جائیں گے۔ مگر بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ اب اس کام میں جی نہیں لگتا۔"

علی جو نے دو ایک جمائیاں لیں اور پھر کروٹ بدل کر خراٹے لینے لگا۔ لیکن شیام کی آنکھوں میں نیند نہ آئی۔ علی جو کی باتوں سے ایک وحشی بے رحمی کی بو آتی تھی۔ باتیں کڑوی تھیں لیکن ان میں صداقت ضرور تھی۔ حکومت چاہے جمہوری یا اشتراکی ہو۔ جبر اور تشدد اس کی بنیاد ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ حکومت ہو۔ کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس کرائے بغیر اس سے کوئی اچھا کام نہیں کروایا جا سکتا۔ اس نے سوچا اگر حکومت نہ ہو تو پھر کیا ہو شاید انسانی سماج ایک جنگل بن جائے گا۔ اب بھی انسانی سماج کیا ایک جنگل

نہیں ہے۔ تہذیب کے چند سطحی لوازم سے قطع نظر کیا لیکن اب بھی انسانی سماج میں جنگل کا قانون نہیں برتا جاتا؟

لیکن شاید کہیں فرق ضرور تھا۔ جنگل میں اور انسانی سماج میں، علم میں معتدبہ اضافہ ہوا تھا۔ انسان دیگر جانوروں کی نسبت زیادہ منظم اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ آبادی بھی بڑھ گئی تھی۔ سائنس نے بھی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لیکن یہ جنگل ابھی تک جنگل ہے۔ وحشی، خطرناک، غیر منظم، لیکن دوسری طرف حکومت کا خطرناک جوا ہے۔ ریاست کا منظم ظلم، جو انسانی روح کے شانوں پر اک بار گراں ثابت ہو رہا تھا۔ اور اسے آزادی کی نازک اور ہلکی اور خوشگوار فضا میں اڑنے سے روک رہا تھا۔ کیا کوئی ایسی حکومت ہو سکتی ہے، جو حکومت نہ ہو، جو جبر پر قائم نہ ہو، جہاں دنیا کے آزاد انسان اک آزاد انداز سے ایک دوسرے سے آزاد تعاون کر سکیں، جبر واستبداد کے بغیر۔ شاید یہ انسانی زندگی کی معراج ہو گی، شاید اس منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے ہمیں اشتراکی رہگذار پر چلنا ہو گا۔ لیکن دنیا میں ابھی علی جو ایسے لوگوں کی حکومت ہے۔ اچھے لوگ، پڑھے لکھے، عالم و فاضل لوگ، ادیب بھی ہوتے ہیں، شاعری سے بھی مس رکھتے ہیں۔ پانچ وقت نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ ان کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ احباب میں بھی محبوب ہوتے ہیں۔ لیکن۔ لیکن۔۔۔ وہ خیمے کا فلیپ کھول کر باہر نکل آیا۔ کیونکہ خیمے کے اندر اسے اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اور ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ سامنے کی دوسری آرام کرسی پر نائب تحصیلدار کا شکاری کتا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آہٹ پر چونکا۔ غرایا اور پھر اسے پہچان کر اس نے کان ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اور اسی طرح اونگھنے لگا۔

آگ کے حلقے سے ہلکا سا دھواں بلند ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی شعلوں کی زبانیں اوپر لپک جاتیں۔ دو چوکیدار بندوق ہات میں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ حلقے کے باہر تاریک جنگل کھڑا تھا۔ اپنے سارے بھید اور اسرار چھپائے ہوئے خاموش، ڈراؤنا، اک تاریک دیوار کی طرح، جس میں کہیں درز نہ دکھائی دیتی ہو، جس میں کہیں سے روشنی کی کرن اندر نہ آ سکتی ہو۔ یہ جنگل جیسے اس آگ کے حلقے کو ہڑپ کرنے کے لئے تیار تھا۔ سینکڑوں برسوں سے یہ جنگل یہاں کھڑا تھا۔ اور ایسے کئی آگ کے حلقے ہضم کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ آگ بجھ گئی تھی، اور زمین پر پھر اسی طرح سبزہ اگ آیا تھا۔ سبزہ اور خاردار جھاڑیاں، جن کی اوٹ میں کسی چیتے کی سبز آنکھیں خوفناک طور پر چمکتی تھیں۔

یہ جنگل خاموش تھا، یہ آسمان خاموش تھا۔ تاروں سے خالی سیاہ آسمان گویا جنگل کا بڑا بھائی تھا۔

اس پراسرار ہیبت ناک خاموشی کے پاس شیام کے سوال کا کیا جواب تھا۔ قدرت کے یہ دونوں اولیں فرزند اپنے ادراک میں اک حقیر انسان کے سوال کا کیا جواب دینا چاہتے تھے۔ حکومت جبر کے بغیر؟ حکومت جبر کے بغیر؟ کیا کوئی چیز اس سیاہ جنگل اور سیاہ آسمان کا سینہ چیر کر اس سوال کا جواب نہ لا سکتی تھی۔

وہ یہی سوچتا سوچتا سو گیا۔ اور جب وہ جاگا تو صبح کاذب ہو چکی تھی۔ تاریکی کا غبار اڑتا ہوا کم ہو رہا تھا۔ فضا میں اک تازگی تھی۔ جنگل کی گھاس شبنم فشاں، آگ کا حلقہ بجھ کر راکھ ہو گیا تھا۔ چوکیدار اسی حلقے کے قریب تھک کر سو گئے تھے۔ اور دور تاڑ کے دو چھوٹے چھوٹے درختوں کے درمیان ایک ریچھنی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے جھول کے ساتھ جا رہی تھی!

"آج آپ بہت سویرے جاگ گئے۔" علی جُو نے پوچھا۔

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ رات کو نیند بھی اچھی طرح نہیں آئی۔"

"شاید غیر مانوس جگہ سونے کی وجہ سے۔" نائب تحصیلدار نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میرے خیال میں آپ اگر ایک جوشاندہ پی لیں۔ میں ابھی تجویز کئے دیتا ہوں۔ یہیں جنگل میں سے سب جڑی بوٹیاں مل جائیں گی۔ بنفشے کے پھول اور پتیاں، اُنبج، جنگلی سونف، پودینہ، اور سنبلو کی جڑیں۔ بس ایک جوشاندہ پینے سے ہی آپ کی طبیعت راس ہو جائے گی۔"

شیام چپکا ہو رہا۔ سوچنے لگا۔ اب جوشاندہ تو پینا ہی پڑے گا۔ انکار کرنا فضول ہے۔

"او ہری، ہری، رادھے، موہن سنگھ، گلے۔ کہاں مر گئے سب؟"

موہن سنگھ دوڑتا ہوا آیا۔ قریب آ کر ہات جوڑ کر کہنے لگا۔ "حضور کیا حکم ہے۔"

"دیکھنا موہن۔" علی جُو نے اس سے نہایت شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ "آپ کے لئے ایک جوشاندہ تیار کرنا ہے۔ یہیں جنگل میں سب چیزیں مل جائیں گی۔ بنفشے کے پھول اور پتیاں، انبج اور سنبلو کی جڑیں۔ جنگلی پودینہ، اور سونف۔ سونف اس جنگل میں شاید مشکل سے ملے۔ بہر حال باقی بوٹیاں تو ضرور مل جائیں گی۔ شاباش ابھی دو منٹ میں یہ کام ہو جائے۔"

"ابھی لیجئے سرکار۔"

وہ چلا گیا تو شیام نے علی جو سے کہا۔ "بڑا خوبرو جوان ہے۔"

علی جو بولا۔ "راجپوت ہے۔ اپنے جسم کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ شکار کا بہت شوقین ہے۔ ماندر

میں اس کی اپنی زمین بھی ہے۔ اور ایک پن چکی، جب میں شکار کے لئے کہیں جاتا ہوں، یہ ضرور میرے ہمراہ آتا ہے۔ بہت حلیم، منکسر المزاج لڑکا ہے۔ غرور اور اکڑ، اس میں نام کو بھی نہیں۔"

شیام نے جوشاندہ پیا، علی جو نے چائے۔ اس کے بعد گلے شکاری نے آکر اطلاع دی۔

"حضور، مچان پر تشریف لے چلئے۔ چاڑھ شروع کی جائے۔"

نائب تحصیلدار صاحب بولے۔ "بھئی، چاڑھ کے لئے ہینکئے بہت کم ہیں۔ اگر آپ اور موہن سنگھ، مدان اور پیر کے دیہاتوں سے کچھ آدمی اور لے آئیں تو ذرا چاڑھ کا لطف رہے گا۔ ورنہ یہ مچان تو میرے خیال میں یونہی بندھی رہے گی۔" پھر وہ شیام سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "آپ نے ابھی مدان اور پیر کے دیہات تو نہ دیکھے ہونگے؟ اس علاقے کے خوبصورت ترین دیہات وہی ہیں۔ اور پیروا کا مقام تو یوں بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اگست کے وسط میں وہاں ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ وہاں کہتے ہیں پانڈوؤں کے پرانے محل ہیں، اور پھر وہیں بابا پیر کی قبر بھی ہے۔ اس لئے یہ مقام ہندوؤں مسلمانوں دونوں کے لئے بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اگست کے وسط میں یہاں جو میلہ لگتا ہے۔ اسے دیکھنے کیلئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ دو تین دن خوب رونق رہتی ہے۔"

شیام نے کہا۔ "عجیب بات ہے۔ ایک ہی مقام اور مذہبی اعتبار سے ہندوؤں مسلمانوں دونوں کیلئے قابل احترام ہو۔"

علی جو ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "شیام صاحب۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندوؤں مسلمانوں کے تعلقات انہیں پچھلے بیس سالوں میں کشیدہ ہوئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ رہا یہ کہ ایک ہی مقام مذہبی اعتبار سے ہندوؤں مسلمانوں کے لئے کیسے متبرک ہو سکتا ہے، تو اس کی ایک نہیں سینکڑوں مثالیں ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں بالعموم اور شہروں میں بھی کبھی کبھار ایسے مقامات ملتے ہیں۔ دراصل اس میں ہمارے بزرگوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیا تھا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و کلچر میں سمونے کے لئے یہ مقام بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یہاں پیر کی قبر اور پانڈوں کے محل ساتھ ساتھ ہیں اننت ناگ میں مسلمانوں کی عبادت گاہ اور ہندوؤں کا مقدس تالاب ایک ہی جگہ پر ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کرتے ہوئے بھی ایک خاص اخوت اور یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اکثر دیہاتوں میں مندر، دھرم شالائیں اور مسجدیں ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ ان دنوں آرتی اور باجے کا جھگڑا نہ تھا۔ کیونکہ

دلوں میں مغائرت نہ تھی۔ اب جھگڑا انہی جگہوں پر زیادہ ہوتا ہے جہاں مندر اور مسجد ساتھ ساتھ ہوں۔ مقام شکر ہے، کہ یہ وبا ہمارے دیہاتوں میں ابھی نہیں پہونچی۔ آپ پیر کے میلہ پر ضرور چلئے گا۔ یہ میلہ دیکھ کر آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔

"یہ دیہات یہاں سے کتنی دور ہیں۔"

"بہت دور نہیں۔ اس سوائی کے جنگل سے ایک راستہ مدان کے گاؤں کو جاتا ہے۔ چڑھائی کا راستہ ہے، بس یہاں سے کوئی دوڈھائی میل ہوگا، ایک اور راستہ یہاں سے نیچے اتر کر اس باؤلی سے جا ملتا ہے۔ جو آپ نے مہنڈر کو آتے ہوئے اپنے راستے میں دیکھی ہوگی۔ وہاں سے پیر کا گاؤں میں چار میل کے قریب ہوگا۔"

شیام کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے، میں ابھی ان لوگوں کے ساتھ جا کر یہ دیہات دیکھ آتا ہوں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔"

"بہت اچھا۔" علی جو بولا۔ "لیکن بندوق ساتھ لیتے جائیے۔"

گلے اور موہن سنگھ کے ساتھ وہ جنگل کی خمدار پگڈنڈی پر روانہ ہوا، آگے آگے گلا شکاری تھا۔ اور پیچھے موہن سنگھ، اور درمیان میں وہ خود۔

گلا ایک کہنہ مشق شکاری تھا۔ بوڑھا، سفید ڈاڑھی، لیکن جسم اخروٹ کی لکڑی کی طرح مضبوط اور توانا۔ جنگل کے چپے چپے سے واقف، آنکھیں عقاب کی سی، اور ناک باز کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی، گال صاف تانبے کی طرح دہکتے تھے۔ ایسا صحت مند بوڑھا شیام نے اس سے پہلے کم ہی دیکھا تھا۔

"گلے، تمھاری عمر کیا ہوگی؟"

"پتہ نہیں صاحب، حساب نہیں جانتا، کوئی تین بیس کے قریب ہوگی۔" (ساٹھ سال کے قریب)

"کب سے شکار کھیلنا شروع کیا۔"

"جب سے ہوش سنبھالا ہے صاحب، شروع ہی سے اس کام کا شوق تھا۔ اس جنگل نے اپنے ناخنوں سے بہتیرے گھاؤ بھی لگائے ہیں، لیکن یہ شکار کا چسکا صاحب ایسا ہے کہ کبھی چھوٹتا ہی نہیں۔"

موہن سنگھ بولا۔ ''ایک گھاؤ تو گلے کے دل میں بھی ہے۔ اور ابھی تک شاید اسی طرح موجود ہے۔'' پھر وہ شیام سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''صاحب گلے کی بیوی کو اسی جنگل نے نگل لیا تھا۔ ایک دفعہ وہ بیچاری جنگل میں لکڑی چننے گئی کہ ایک چیتے نے اسے آدبوچا۔ گلے کو اپنی نوجوان بیوی سے بڑی محبت تھی۔۔۔''

گلے نے اک آہ بھر کر کہا۔ ''اس وقت کی کیا بات کرتے ہو موہن جانے دو۔''

''تم نے پھر شادی نہیں کی۔'' شیام نے پوچھا۔

''پہلی بار جو شادی کی تھی، کیا بنا؟ دوبارہ شادی کر کے کیا کرتا۔'' گلے نے آہستہ سے کہا۔ ''اب تو اسی جنگل سے شادی رچائی ہے۔''

یکایک پاس کی جھاڑی سے دو تیتر اڑے، گلے نے اسی وقت بندوق سیدھی کی اور ''دھائیں دھائیں۔'' دوسرے لمحے میں دونوں طائر پھڑ پھڑاتے ہوئے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں جا گرے۔ وہ تینوں ان جھاڑیوں کی طرف دوڑے۔ ایک کے پر شکستہ ہو چکے تھے۔ اور چھرے پیٹ کو چھید کر پار ہو گئے تھے۔ دوسرے کی گردن سے ابھی گرم گرم لہو بہہ رہا تھا۔ ایک نر تھا ایک مادہ۔

''بیچارا اجوڑا۔'' شیام نے کہا۔

گلے نے شیام کی آواز کا ترحم محسوس کر لیا۔ بولا۔ ''اس جنگل نے مجھ پر کب ترس کھایا تھا۔ صاحب اس وقت میری عمر بیس بائیس برس کی تھی۔ نور نیشاں کو میں دھراٹ کوٹ سے بھگا کر لایا تھا۔ جنگلوں میں چھپتے چھپتے ہم یہاں اپنے علاقے میں آئے تھے۔ کبھی کسی کسان کے گھر رہ جاتے، کبھی جنگلوں ہی میں بسیرا کر لیتے۔ جو کچھ ملتا کھا پی لیتے۔ کبھی تو مکئی کی روٹی اور ساگ ملتا۔ تو کبھی جنگلی پھل اور پودوں کی جڑیں۔ جب نور نیشاں راستہ چلتے چلتے تھک جاتی تو میں اسے اس کی کمزوری پر شرمندہ کر کے اسے دو چار میل اور پیدل چلاتا۔ لیکن جب وہ بالکل ہی تھک کر چور ہو جاتی، پھر میں اسے اپنے کندھوں پر چڑھا لیتا۔ اور وہ وہیں میرے شانوں پر بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔ اس کے سر کے بال کھل جاتے اور میری آنکھوں پر چھا جاتے۔۔۔''

بوڑھا دیر تک خاموش رہا۔ وہ دونوں سر جھکائے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ گلا چلتے چلتے رک گیا۔ اور بندوق زمین پر کھڑی کر کے ان کی طرف مڑ کر بولا۔ ''صاحب اگر مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہوں تو جنگل سے زیادہ دلفریب جگہ اور کوئی نہیں ہوتی۔ مجھے وہ دن اب

بھی اسی طرح یاد ہیں۔ جیسے کل کی بات ہو، ہم جنگل میں الاؤ لگا لیتے۔ اور چنا ٹھوڑوں کو آگ میں جلا کر ان میں سے نیزے نکال نکال کر کھاتے۔ میں اس کے منہ میں نیزے ڈالتا وہ میرے منہ میں۔ اور پھر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے تھے، اور وہ میری نگاہوں کا بھید پا کر چپ ہو جاتی تھی اور شرم سے نگاہیں جھکا لیتی تھی۔

الاؤ کی آگ جلتی رہتی، اور جب وہ چیڑھ کے نکیلے جھومروں کے بستر پر سو جاتی اور سارے جنگل میں سناٹا چھا جاتا، صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آتی، کہیں دور کوئی اُلو بول اٹھتا، یا کوئی گیدڑ بھوک سے بیتاب ہو کر چلاتا۔۔۔ میں رات بھر پہرہ دیا کرتا...... صبح ہوتے ہی اسے جگا دیا کرتا۔ اور پھر میں اسی بستر پر سو جاتا اور وہ بندوق لے کر پہرہ دیا کرتی۔ حتیٰ کہ سورج سر پر آجاتا اور ہم پھر اٹھ کر چل دیتے۔ صاحب، جی چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ دن پھر واپس آجائیں۔ لیکن وقت تو تیتر کی اڑان ہے، ایک دفعہ زد سے نکل گیا پھر کبھی قابو میں نہیں آتا۔۔۔ ایک سال ہم اپنے گھر بڑی ہنسی خوشی سے رہے۔ پھر جب وہ ایک دفعہ جنگل میں لکڑیاں چننے کے لئے گئی۔ سہ پہر کو جب میں کھیتوں سے گھر لوٹا تو وہ ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔ نور نیشاں پھر کبھی واپس نہ آئی۔ میں جنگل میں نور نیشاں کو ڈھونڈنے گیا۔ لیکن اسے کہیں نہ پایا۔ دوسرے دن ایک جھاڑی کے نیچے مجھے اس کی ہڈیاں ملیں۔ اسے ایک آدم خور چیتے نے کھا لیا تھا۔ میری نور نیشاں کو۔ میرے ہاتوں میں اس کی کھوپری تھی، اور اس کے سنہرے بال۔ جو کبھی میری آنکھوں پر چھا جاتے تھے۔۔۔''

گلے نے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا، اور ناک بھی۔ پھر خاموشی سے چڑھائی چڑھنے لگا۔

موہن سنگھ بولا'' گلے نے اس علاقے میں شاید ہی کسی چیتے کو زندہ چھوڑا ہو، جہاں اس نے کسی چیتے کی بو پائی، وہیں فوراً پہونچ جاتا ہے۔ دوسرے علاقے کے لوگ بھی گلے کو چیتے کے شکار لئے دور دور سے بلواتے ہیں، اور یہاں تو یہ بات مشہور ہے کہ جس جنگل میں گلا موجود ہو، اس جنگل میں چیتا نہیں رہ سکتا۔ اس کی بو پا کر فوراً بھاگ جاتا ہے۔''

گلا پھر بولا۔ ''لیکن صاحب، دل میں ایک ہی ارمان ہے۔ اس وقت تک بے شمار چیتوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنا چکا ہوں۔ کئی دفعہ تو ان سے دوبدو لڑائی بھی ہوئی ہے۔ لیکن صاحب، معلوم نہیں، وہ کونسا چیتا تھا۔ جی میں ہر وقت یہ کسک سی رہتی ہے۔ یہ ارمان ہر وقت دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔''

شیام بولا۔ ”ہاں ہر نئے چیتے کے شکار پر تمہارا انتقام پھر تازہ ہو جاتا ہوگا۔“

”بس صاحب یہی بات ہے۔“

چڑھائی ختم ہو گئی۔ اب ایک سر سبز قطعہ سامنے تھا۔ یہاں سے دو پگڈنڈیاں جاتی تھیں۔ ایک شمال کو، دوسری مغرب کو۔ ایک اوپر کو جاتی تھی۔ ایک نیچے کی طرف۔ یہاں جنگلی کیلوں کا جھنڈ تھا۔ اور اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا چشمہ، اس جگہ کو دیکھ کر جیسے شیام کی ٹانگوں نے جواب دیدیا۔ اس نے گلے اور موہن سنگھ سے کہا۔ ”بھئی تم لوگ اب دیہات میں جا کر لوگوں کو لے آؤ۔ مجھ سے تو آگے چلا نہیں جاتا۔ میں تمہارا یہیں انتظار کروں گا۔“

گلا کہنے لگا۔ ”میں مدان جاتا ہوں، اس چڑھائی کے رستے۔ موہن تم پیر کے گاؤں سے کسانوں کو لے آؤ۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”دیکھنا باؤلی پر زیادہ دیر نہ بیٹھنا آج دوپہر تک چاڑھ شروع ہو جانی چاہیئے۔ نہیں تو نائب تحصیلدار صاحب خفا ہونگے۔“

جب وہ دونوں چلے گئے تو شیام نے اپنی جوتوں کے تسمے کھول دئے۔ پھر جوتے اتار کر اُس نے اپنے پاؤں جرابوں سے نکال لئے، اور انہیں سبز اور ٹھنڈی گھاس پر رکھ دیا۔ وہ اپنے پاؤں اس ٹھنڈی ملائم مخملیں گھاس پر پھیرنے لگا۔ اس کی رگ و پے میں یہ سکون آمیز، ٹھنڈی ملائمت سرایت کرتی گئی۔ حتیٰ کہ سفر کی تھکن اک سانپ کی کینچلی کی طرح اس کے جسم سے اتر گئی۔ اور وہ اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ جنگل کے گہرے سناٹے میں صرف جھرنے کی ترل رل ترل رل ترل رل سنائی دیتی تھی۔ لیکن یہ آواز بھی اس قدر مدھم، میٹھی اور مسلسل تھی کہ آواز ہوتے ہوئے بھی بے آواز بن گئی تھی۔ کیلوں کے جھنڈ میں سبز کیلوں کا پور لٹک رہا تھا۔ اور اس کے آخر میں کاسنی پتوں کا ایک جھومر لرز رہا تھا۔ اور اسے احساس ہوا گویا وہ اپنے سامنے جھرنے کی دوشیزہ کو رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ جس کے ماتھے پر کاسنی جھومر لرز رہا تھا۔ اور جس کے سبز لہنگے پر چشمے کے نقرئی پانی کے تار گندھے ہوئے تھے۔ اور یہ ترل رل ترل رل کی آواز اسی حسینہ کے پائیل اور خلخالوں کی خوش آئند جھنکار تھی۔۔۔۔ وہ دیر تک قدرت کے اس رقصِ دوام کو آنکھیں بند کئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہی گہرا سناٹا، وہی چشمہ، وہی پگڈنڈیاں، بندوق اس کے قریب ایک چٹان سے لگی کھڑی تھی۔ ہاں وہ سحر افروز رقص کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس کی پیاس چمک اٹھی۔ اور وہ چشمے کے کنارے لیٹ گیا۔ اور اس نے اپنے لب چشمے کی سطح سے ملا دیئے۔ جیسے وہ چشمے کی دوشیزہ کے

لب چومنا چاہتا ہو۔ ہاں یہ ایک بوسہ طویل ہی تو تھا۔ اُسی طرح میٹھا، جاں بخش، فرحت آمیز۔ اس بوسے نے اس کی پیاس بجھا دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ دونوں شکاری واپس نہ آئے تھے۔ نہ جانے کب تک واپس آئیں گے۔ یکایک اس کا جی گھومنے کو چاہا۔ اور اس کے قدم بے اختیار نچلی پگڈنڈی کی طرف مڑ گئے۔

یہ راستہ ایک خطرناک ڈھلان پر چکر کاٹتا ہوا نیچے جاتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو وہ گھنے جنگل کے بیچ میں چلتا رہا۔ دور دیہ درخت اس قدر گھنے تھے کہ وہ چند گز کے فاصلے سے آگے کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر چلتے ہوئے اس کے دل میں کسی نامعلوم خوف کا احساس جاگ اٹھتا، اور اس کی گردن کے پچھلے حصے پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں، اور محسوس کرتا جیسے اس کے کان کسی نامعلوم آواز، کسی نامعلوم خوفناک آواز کو سننے کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں، جیسے اس کے پیچھے پیچھے کوئی خوفناک سبز آنکھوں والا چیتا دبے پاؤں آ رہا ہے۔ اور وہ بے اختیار مڑ کر دیکھتا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ آگے پیچھے راستہ خالی تھا۔ یہ اس کا واہمہ ہی تھا۔ نہیں، وہ اب اک تہذیب یافتہ انسان نہ تھا۔ بلکہ جنگل ہی کا ایک جانور، جیسے آج سے ہزاروں سال پہلے وہ تھا۔ اس کے اعصاب میں، اعضا میں، عروقوں میں، شریانوں میں، گوشت کے ایک ایک عضلہ میں، وہی وحشی انسان پھر بیدار ہو گیا تھا۔ یہ بھی جنگل ہی کا معجزہ تھا۔ اس کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی، سینکڑوں سال کی محنت سے حاصل کی ہوئی تہذیب کا ملمع کتنا پتلا تھا۔

اب درخت چھدرے ہو گئے تھے۔ چھدرے ہوتے ہوتے درخت ختم ہو گئے۔ اب یہ راستہ بھی گھاس میں سے گزر رہا تھا۔ اس کے نیچے مکی کے کھیت تھے۔ یہ راستہ چکر کاٹتا ہوا انجیروں کے ایک جھنڈ میں گم ہو جاتا تھا۔ پھر انجیروں کے جھنڈ کے نیچے سے کچھ فاصلے پر اسے وہی پرانا راستہ نظر آیا۔ جس راستے سے وہ ماندر میں آیا تھا۔ شمال مشرق میں ماندر کی ندی تھی، اور اس کے پار اس کا گھر۔ اب اس کا جی واپس شکار پر جانے کو نہ چاہا۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ دیر انجیروں کے جھنڈ کے نیچے باؤلی پر آرام کرے گا، اور وہیں موہن سنگھ کا انتظار کرے گا۔ اور پھر موہن سنگھ کے ذریعے نائب تحصیلدار کو کہلوا بھیجے گا، کہ وہ واپس گھر جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ تیز تیز قدموں سے نیچے اُترنے لگا۔ لیکن انجیروں کے جھنڈ کے قریب پہونچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ نیچے باؤلی سے ایک مرد اور ایک عورت کی گفتگو کی آواز آ رہی تھی۔ دونوں آوازیں اس کی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے آہستہ سے

جھانک کر دیکھا مرد موہن سنگھ تھا۔ عورت وہی لڑکی جو اسے پہلی بار ادھر آتے ہوئے یہاں ملی تھی۔

لڑکی کہہ رہی تھی۔ "مجھے اس کی پروا نہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ میری ماں خوش ہوتی ہے یا ناراض ہوتی ہے۔ میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔ لیکن یاد رکھو اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو میں اپنے ہاتوں سے تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔"

موہن سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔" جان بوجھ کر انجان بنتی ہو۔ سو بار آزما چکی ہو۔ جب جی چاہے پھر آزما کر دیکھ لو۔ موہن سنگھ راجپوت ہے، اپنے قول کا سچا ہے اس کی محبت کوئی کچا دھاگا نہیں۔"

لڑکی بولی۔"شاید تم یہ سمجھتے ہو گے کہ میں اچھوت ہوں، غریب ہوں، گاؤں والوں نے ہمیں باہر نکال رکھا ہے۔ اس لئے تم مجھ سے بے کھٹکے محبت کی میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے دھوکا دے سکتے ہو۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے دیوی کی سوگند ہے، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی، تو میں تمہیں اور تمہارے گاؤں والوں کو کچا کھا جاؤں گی۔ وقت آنے دو میں خود ان برہمنوں کے لئے کالی ماتا بن جاؤں گی۔ انہوں نے سمجھا کیا ہے۔"

موہن سنگھ بولا۔ "تم یوں ہی شبہ کرتی ہو، گاؤں میں کسی کو اس بات کا علم بھی نہیں۔ اور تم۔۔۔"

شیام کھانسا، پھر اس نے اپنے قدموں سے چلنے کی آواز پیدا کی تاکہ ان لوگوں کو اپنی آمد سے خبردار کر دے۔ اس نے کافی سن لیا تھا۔ زیادہ سننا بیکار تھا۔ وہی عشق و محبت کی فرسودہ باتیں۔ میں یہ کردوں گا اور تم وہ کروگی۔ راجپوت مرد، اچھوت عورت، براہمنوں کا سماج، نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ یہ عورت ایک حرامی بچہ جنے گی، اور کیا کریگی۔ الن کہیں کی۔

موہن سنگھ اسے جھنڈ سے نیچے اترتا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لڑکی کی آنکھیں اب بھی کسی نامعلوم غصے سے چمک رہی تھیں۔

شیام اس انداز سے بولا۔ جیسے وہ ان دونوں سے معافی مانگ رہا ہو، اس دخل در معقولات پر۔ "بھئی، میں وہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا یونہی یہ راستہ پکڑ کر نیچے اتر آیا۔ اب یہاں تک آ گیا ہوں، تو واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تم نائب تحصیلدار صاحب سے کہہ دینا اور میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ میں تو اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہات ہلایا۔ اور ندی کو جانیوالے راستے پر

گامزن ہو گیا۔

موہن سنگھ اور وہ لڑکی دیر تک خاموش بیٹھے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ نظر سے اوجھل ہو گیا پھر لڑکی بولی۔ "میرے خیال میں اس نے سب کچھ سن لیا ہے۔"

موہن سنگھ اپنی مہین مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "سن لیا ہے تو میں کب کسی کی پروا کرتا ہوں۔ میں راجپوت ہوں۔ اپنے قول کا سچا ہوں۔ اور۔۔۔"

لڑکی تنک کر بولی۔ "بس بس زیادہ ڈینگ نہ مارو۔ رہنے دو اپنی راجپوتی شان۔ دیکھ لوں گی یہ راجپوتی شان بھی۔ ابھی تو چھپ چھپ کر ملتے ہو۔ جس دن برادری میں رسوائی ہوگی۔ اس دن مجھ سے بات کرنا۔"

اور شیام راستے میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ ذات پات کو اڑا دینے سے کم سے کم ایک بہتر نسل تو پیدا ہو سکتی ہے۔ اب اس لڑکی ہی کو لو۔ چمار اور براہمن کے امتزاج سے کیا چیز بن گئی۔ ہے براہمنوں کی خوبصورتی، نزاکت، شعریت اور پاکیزگی۔ چمار کی مضبوطی، شوخی، شرارت، غصہ، کس طرح نئے جوتے کی طرح چرر رر چرر رر کرتی ہے سالی، اور وہ موہن سنگھ دیکھو۔ وہاں سے نائب تحصیلدار نے کس کام پر بھیجا ہے اور یہاں جناب اپنی محبوبہ سے گلنچپ کر رہے ہیں۔ پھر وہ اپنی زیر نفسی کیفیت کا تجزیہ کرنے لگا۔ بچہ جی، دراصل تم اس نوجوان لڑکے اور لڑکی کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر حسد سے جل بھن گئے ہو۔ لاشعوری طور پر تم اپنے آپ کو موہن سنگھ کی جگہ بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، کیوں ٹھیک ہے نا۔ اور اس کے دل کا ایک حصہ، اس کے دل کے دوسرے حصے کی کمینگی پر مسکرانے لگا۔

جب وہ گھر پہونچا تو اسے بہت زوروں کی بھوک لگ آئی تھی۔ باہر ناخ کی چھاؤں میں روی اور نمی کھیل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک دم خوشی سے چلا اٹھے۔ "بھاپا جی، بھاپا جی، آپ کی منگنی آئی ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" نمی خوشی سے تالی بجا کر بولی۔ "آپ کی سگائی آئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے روی اور نمی دونوں گھر کے اندر چلاتے ہوئے بھاگ گئے۔ اور وہ ان کے پیچھے پیچھے داخل ہوا۔ حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اندر آنگن میں ایک مونڈھے پر اس کی ماں بیٹھی تھی اور دوسرے پر چھایا۔ اسے دیکھ کر

دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ اور وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں، شیام کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ لیکن روی نمی نے اسے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ اور اسے گھسیٹتے ہوئے، بلکہ اس کے ساتھ خود گھسٹتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کپڑوں والے کمرے میں ایک چھوٹا سا بکس دھرا تھا۔ جو غالباً صبح ہی ڈاک کے ذریعہ آیا تھا۔

اس نے انجان بن کر نمی سے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں بھیا جی کی منگنی ہے۔"

روی بولا۔ "اس میں سگائی بند ہے۔"

"یعنی جس لڑکی سے میں شادی کرنے والا ہوں، وہ اس میں بند ہے؟" شیام نے پوچھا۔

یہ سوال ان دونوں بچوں کیلئے ذرا ٹیڑھا تھا۔ یکایک اسے چھایا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر چھایا اور اس کی ماتا جی کھڑی تھیں۔

چھایا بولی۔ "نہیں بیٹا۔ اس بکس میں دلہن بند نہیں منگنی کا شگن ہے۔ دلہن ایک اور بکس میں آئے گی۔"

شیام کی ماتا مسکراتے ہوئے بولیں۔ "ایک سال کے بعد ڈولی میں بند ہو کر آئے گی۔"

"اہاہا۔" روی اور نمی خوشی سے تالی بجا کر ناچنے لگے۔ "بی بی ڈولی میں بند ہو کر آئے گی۔ ایک سال کے بعد۔" اور اسی طرح ناچتے ناچتے کمرے کے باہر چلے گئے۔ شیام نے کہا۔ "ماں مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"شکار سے بہت جلد واپس آ گئے۔ شکار کیا؟"

"کچھ نہیں، میں تو بہت پہلے ہی چلا آیا طبیعت ٹھیک نہ تھی۔"

چھایا بولی۔ "مبارک ہو بیٹا۔ بڑی شاندار منگنی آئی ہے۔ پانسو روپیہ نقد اور ایک چاندی کا تھال اور۔۔۔"

"ماتا جی کو مبارک باد دیجئے۔ میں تو قربانی کا بکرا ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"ناں، ناں، بیٹا ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے اچھے بیٹے۔"

چھایا بولی۔ "ہنستے ہیں بابو صاحب۔ جب دلہن کا منہ دیکھیں گے، پھر۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"ماں۔ مجھے کھانا چاہیئے۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ اور یہ کہہ کر وہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔

کھانا کھاتے ہوئے اس نے اپنی ماتا سے پوچھا۔ "یہ آپ کو کیا سوجھی۔"

"بیٹا، گھر بہت اچھا ہے، اس کے پتا چھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں، شریف گھرانہ ہے، خاندان بالکل کھرا ہے۔ لڑکی آٹھویں جماعت پاس ہے، ہارمونیم بجاتی ہے۔"

ہارمونیم کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں اک اور تصویر کھنچنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک آٹھویں جماعت پاس لڑکی، جیسی کہ اک آٹھویں جماعت پاس لڑکی کی شکل ہوتی ہے۔ اک ہارمونیم کے سروں پر گردن نیوڑھائے مشق کر رہی ہے۔ ساون کے نظارے ہیں۔ ساون کے نظارے ہیں۔ لل لل لا۔ لل لل لا۔ لل للل لا۔ اور نوالہ اس کے منہ سے باہر جا گرا۔ اور وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ اپنی کمر پر دونوں ہات رکھ کے بے اختیار ہنستا گیا۔ ہنسی کا فوارہ تھا کہ جس نے سارے کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" اس کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس بات پر ہنس رہے ہو۔ بھلا اس میں ہنسی کی کونسی بات ہے۔ ایسے گھرانے کہیں بھلا روز روز ملا کرتے ہیں۔ آج کل کے لڑکوں کی تو بس عقل ہی ماری گئی ہے۔" وہ ذرا غصے سے بولیں۔ "لڑکی تمہاری پھوپی نے دیکھ لی ہے۔ وہ کہتی ہیں لڑکیوں جیسی لڑکی ہے۔ سگھڑ، سمجھدار ہے، فیشن ایبل بھی ہے۔"

اس نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہا۔ "فیشن سے آپ کی کیا مراد ہے، غالباً اونچی ایڑی کے جوتے پہنتی ہو گی، بالوں میں لمبے لمبے کلپ لگاتی ہو گی۔ ٹیڑھی مانگ نکال کر بالوں کو کانوں کے اوپر سنوارتی ہو گی۔ چوٹی گوندھ کر پیچھے اتنا لمبا زر کا لہریہ لگاتی ہو گی کہ میل دو میل تک لوگوں کو نظر آئے۔ لبوں پر لال روشنائی ایسا لپ سٹک۔ گالوں پر سرخ غازہ، لمبے لمبے ناخنوں پر بوٹ پالش، "دل کی جلن۔" "پریتم کے خطوط" پڑھتی ہو گی، اور سینما کی شائق تو ضرور ہو گی۔ دل کی آس، پرانا خاندان، نکمی دیدی۔ اس نے ضرور دیکھی ہو نگی۔ ٹھیک ہے اور کیا چاہیئے۔ بس چین ہی چین ہے۔"

"اب تم سے کون الجھے۔" شیام کی والدہ نے آزردہ ہو کر کہا۔ "میں نے ابھی پنڈت سروپ کشن جی کو بلایا تھا۔ سگائی کی تاریخ پندرہ ستمبر نکلی ہے۔ پندرہ ستمبر تک تو تمہیں چھٹیاں ہیں، ایک دو دن دیر سے بھی چلے گئے تو کیا ہرج ہو گا۔"

یہ جولائی کا آخری ہفتہ تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ ابھی بہت عرصہ پڑا ہے۔ دیکھا جائے گا۔
یہ سوچ کر اس نے اپنے دل سے اس معاملے کو نکال دیا۔ اور اطمینان سے کھانے میں منہمک ہو گیا۔

سہ پہر تک وہ اپنے کنج میں پڑا غالب کا مصور دیوان دیکھتا رہا۔ غالب کے دیوان میں اسے ہر بار اک نیا لطف حاصل ہوتا تھا۔ بار بار پڑھنے پر بھی اس کا جی غالب سے نہ اکتاتا تھا۔ اور شاعروں میں یہ بات نہ تھی۔ غالب کا ہر شعر اسے اک ایسا جواہر ریزہ نظر آتا، جس کے ہر پہلو سے اک نئی شعاع کا انعکاس ہوتا تھا۔ پرانے معانی نئے معانی میں مدغم ہو جاتے۔ شعاعوں کا رخ بدل جاتا، اور ایک ہی شعر دل کی مختلف اضطراری حالتوں کا آئینہ دار بن جاتا۔ یہ جوہر اسے بہت کم شاعروں میں نظر آیا تھا، آج اس کا جی غیر معمولی طور پر اداس ہو گیا۔ اور اس اداسی کو غالب کے مطالعے نے اور بھی جلا دی اور وہ شاید اس اداسی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ڈھونڈے ہے پھر مغنی آتش نفس کو جی   جسکی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

چغتائی نے بے حد اچھی تصویر بنائی ہے۔ اس نے مصور دیوان کے صفحے پلٹتے ہوئے سوچا۔ مجھے تو اس رقاصہ کے پایل کی ہر حرکت اک نفس آتشیں معلوم ہوتی ہے۔ سازندے کے ساز میں وہ برق فنا نہیں۔ جو خود اس کی آنکھوں میں ہے۔

ڈھونڈے ہے پھر مغنی آتش نفس کو جی   جسکی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

یکایک اسے خیال آیا کہ اس کا مغنی آتش نفس اس وقت کسی بوسیدہ ہارمونیم کے کنارے بیٹھا گا رہا ہو گا۔ ساون کے نظارے ہیں۔ لل لل لا۔ لل لل لا۔ اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کسی کو کیا حق ہے کہ یوں اسے کسی کے پلے باندھ دے۔ جیسے وہ کوئی بھیڑ بکری یا غلام ہو۔ دراصل اس قسم کی شادی غلامی ہی کا رواج تھا۔ ورنہ آزاد ملکوں میں تو اس قسم کی شادی کو ایک بدعت سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ نہیں، یہ بدعت نہ تھی۔ اور اگر بدعت تھی، تو اسی نظام زندگی کی ایک ضروری بدعت تھی۔ بھلا جہاں سماجی زندگی کے دو مختلف خانے ہوں، ایک میں مرد رہتے ہوں، دوسرے میں عورتیں اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی کوئی سبیل نہ ہو، وہاں اس قسم کی شادی کے علاوہ اور کونسا رواج پنپ سکتا تھا۔ اور بھلا دوسری قسم کی شادی میں کونسا آرام تھا۔ پہلے لڑکی کا انتخاب کرو۔ اچھا لڑکی بھی چن لی۔ پھر اس سے محبت جتاؤ۔ اول تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ تمہیں نِپٹ شہدا سمجھ کر تمہاری

محبت کو ٹھکرا دے اور تمہیں پھر اپنے انتخاب پر نظر ثانی کرنا پڑے۔ اچھا اگر یہ معاملہ بھی طے ہو گیا، تو پھر عشق کرو۔ نظمیں لکھو۔ اگر خود نہ لکھ سکو تو دوسروں سے لکھواؤ۔ خط لکھو۔ خوشبوؤں والے لفافے استعمال کرو۔ اب اگر لڑکی مان جائے، تو پھر والدین کی رضامندی کی پخ ساتھ لگی رہتی ہے۔ چلئے یہ معاملہ بھی طے ہو گیا۔ اور کورٹ شپ کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ پھر آیا ہنی مون۔ اور پتہ چلا کہ ایں ہم دونوں کے مزاج تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اب بتایئے؟ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے، کہ سماج ٹھیک دو الگ خانوں میں منقسم رہے۔ ایک میں مرد، دوسرے میں عورتیں۔ شادی کے لئے اپنے ایک خانے میں ہاتھ ڈالا نام نکلا۔ ”شیام۔“ دوسرے خانے میں ہاتھ ڈالا۔ نام نکلا۔ ”سہاگن۔“ دونوں کو تاگے سے جوڑ کر دس آدمیوں کے سامنے باندھ دیا۔ چلئے شیام اور سہاگن کا بیاہ ہو گیا۔ اور پیتل کا بینڈ باجہ بجنے لگا۔ شیام کو جتنی چڑ اس پیتل کے بینڈ باجے سے تھی، اتنی شاید ہارمونیم سے بھی نہ تھی۔ یعنی ہر بیاہ میں یہ پیتل کا بینڈ باجہ ضرور ہو گا۔ چاہے لڑکے کا باپ اس بیاہ میں شامل ہو یا نہ ہو، چاہے سارے براتی شادی میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔ لیکن یہ پیتل کا بینڈ ضرور شامل ہو گا۔ دولہا آنکھ سے کانا، ٹانگ سے لنجا ہو۔ لیکن بینڈ ضرور گائے گا، تیری چھبی من موہن شیام۔ دل کو بھائے جائے۔ دل کو لبھائے جائے۔ دلہن ایسی کھتری چڑیل ہو کہ ڈائن کو بھی دیکھ کر غش آئے۔ لیکن بینڈ باجے کی رجائیت ملاحظہ ہو کس مسرت بھرے لہجے میں گا رہا ہے۔ تو ہے مرے من کی آس۔ من کی آس تو ہے۔۔۔ سارے براتی کھانا کھا کر رخصت بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ بینڈ اب بھی گائے جا رہا ہے، ”کاہے کرتا دیر براتی۔ دیر براتی۔“ اس دلدوز آواز میں یہ بینڈ اس سوال کو بار بار دہراتا ہے کہ آدمی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اور وہ سوچتا ہے، کہ کاش اس کے پاس کوئی ایسی سارنگی ہو کہ جس کے بجانے پر دنیا بھر کے بینڈ بجانے والے اپنے اپنے ساز لے کر اس کے پاس دوڑے آئیں اور وہ اپنی سارنگی کو بجاتا ہوا انہیں سمندر میں لے جائے اور وہیں انہیں ہمیشہ کے لئے غرق کر دے۔ جس طرح اس مشہور کہانی میں ایک سارنگی والے نے گاؤں کے چوہوں سے کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس دنیا میں کوئی ایسی سحر انگیز سارنگی نہیں اور بیچارے شیام کو اپنی شادی کے موقع پر اسی کرخت، نفرت انگیز بینڈ کے بے ہنگم شور کو سننا پڑے گا۔۔۔

وہ کنج سے اٹھ کر باغ میں گھومنے لگا۔ باغ میں گھومتا گھومتا وہ اس کے آخری مغربی کونے پر چلا

گیا۔ یہاں ایک ٹیلہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اور یہاں سے وادی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ نیچے قدموں میں دھان کے کھیتوں کے پرے ندی بہتی تھی۔ اور اس کے بعد ایک وسیع وادی میں دھان کے کھیتوں کے بیچوں بیچ چکر کاٹتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ مغربی سلسلہ ہائے کوہ پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور ہر لحظہ سبز جنگل اک سیاہ غبار میں لپٹے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ساری وادی اور کہستانوں کے جنگل اور دھان کے کھیت اور ندی کا نقرئی پانی اس سیاہی میں گم ہو گئے۔ اب مغربی افق کی لالی میں سلسلہ ہائے کوہ کی چوٹیوں کی لکیریں اس قدر صاف نظر آتی تھیں گویا کسی نے پنسل سے ان چوٹیوں کو واضح کر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ یہ لکیریں بھی مدھم ہوتی گئیں۔ مغربی آسمان پر بادلوں کا رنگ ٹمیالا ہو گیا۔ ہاں اس مقام پر جہاں سورج غروب ہوا تھا، بادلوں کے درمیان اب ایک سنہری کھڑکی سی بنی نظر آتی تھی۔ شاید نیلے آسمان نے اس دُنیا کے لوگوں کو مدعو کرنے کیلئے یہ جنتی کھڑکی کھول دی تھی۔ چند ثانیوں کیلئے۔ یا شاید پریوں کی ملکہ، اس کے بچپن کی کہانیوں کی ملکہ، اس طلائی کھڑکی میں سے اس بھوری کائنات کو دیکھ رہی تھی، جہاں شادیاں لاٹری کی طرح سرانجام دی جاتی ہیں۔ اور لاٹریاں شادی کی سی شان و شوکت کے ساتھ۔ جہاں پریوں کے پر پیدا ہوتے ہی قینچ کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں کوئی خوبصورت ملکوتی شہزادہ بچانے کے لئے نہیں آتا۔ جہاں حسن روپے کے پیمانے پر تلتا ہے، نہ کہ پھولوں کے پیمانے پر۔ اور اسے پانچ پھولوں والی شہزادی کی کہانی یاد آئی، جو اس قدر خوبصورت اور نازک اندام تھی، کہ اگر ایک پلڑے میں شہزادی ہو اور دوسرے پلڑے میں پانچ پھول تو دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ اس نے سوچا عورتیں اب بھی شہزادیاں ہیں، وہ اب بھی پریوں کی طرح خوبصورت ہیں، ہاں ان کے تلنے کا پیمانہ بدل گیا ہے۔ کوئی عورت پانچ روپے پر تل جاتی ہے، کوئی پانسو پر۔ کوئی پانچ ہزار پر۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ صرف پیمانے الگ الگ ہیں۔ پریوں کی تہذیب کا پیمانہ پھول ہیں۔ آدمیوں کی تہذیب کا پیمانہ روپیہ۔ کونسا پیمانہ بہتر ہے۔ پھول یا روپیہ۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ ابھی یہاں تک ہی سوچ سکا تھا، کہ اس کے کانوں میں غلام حسین کی آواز آئی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔

غلام حسین اپنی کہی ہوئی بات کو دہرانے لگا۔ "حضور! تحصیلدار صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔"

رات کافی بھیگ چکی تھی، کہ یکایک گاؤں میں اک شور پیدا ہوا۔ بہت سے لوگوں کی مختلف آوازیں مختلف اطراف سے سنائی دے رہی تھیں۔ تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آوازیں۔ وادی میں لوگ ایک دوسرے کو بلا رہے تھے۔ اور یہ مختلف بلاوے گھاٹیوں میں گونجتے ہوئے ایک ہولناک تاثر پیدا کر رہے تھے۔ شیام جاگ اٹھا۔ گھر میں سب لوگ جاگ اٹھے تھے۔ باہر باغ میں سوئے ہوئے چرند پرند بھی بے چین ہو کر شور مچا رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ غلام حسین جو ہمیشہ آنگن میں سویا کرتا تھا، اٹھ کر باہر پتہ لگانے گیا تھا، کہ کیا معاملہ ہے، جب وہ لوٹا تب معلوم ہوا کہ یہ نائب تحصیلدار صاحب شکار سے واپس آ رہے تھے۔ اور موہن سنگھ کو سوائی کے جنگل میں کسی سورنی نے شدید طور پر زخمی کر دیا۔ اور لوگ اسے اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ شیام نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور اپنے والد کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

باہر اک عجیب نظارہ تھا۔ آس پاس کی گھاٹیوں، ڈھلانوں، اور وادیوں کی تنگنایوں میں لوگ ایک دوسرے کو بلاتے ہوئے ماندر کی ندی کی طرف جا رہے تھے۔ تاریکی میں راستہ ڈھونڈنے کے لئے ہر ایک ہاتھ میں دینیوں کے گٹھے تھے۔ یہ دینیاں جو چیڑھ کے تنے سے نکالی جاتی ہیں، چیڑھ کے جیکن سے بھری ہوتی ہیں۔ اور موم بتی کی طرح جلتی ہیں۔ یہ جنگلی موم بتیاں گھاٹیوں کے مختلف کونوں سے جلتی اور ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ سینکڑوں مومی شمعدان، کوئی اونچی جگہ پر، کوئی کسی ڈھلان پر جیسے ستارے آسمان سے نیچے اتر آئے تھے۔ ساری وادی بلند بانگ بلاووں سے گونج رہی تھی۔ ندی پر ان شمعوں کی اک قطار سی بنی ہوئی تھی۔ اور دینیوں کے شعلے ماندر کے سیاہ پانی میں چمک رہے تھے۔ اور ایک پالکی کو جسے بہت سے لوگ اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ شکاری کا جلوس،

شکاری جو خود شکار ہو گیا۔

اس نے اپنے والد سے کہا۔ ”پتاجی، میں بھی ذرا ندی تک جاتا ہوں۔“

اس کے والد بولے۔ ”غلام حسین کو ساتھ لے جاؤ۔“

راستے میں اسے بہت سے لوگ ملے، جو اس کی طرح ندی کی طرف جا رہے تھے۔ کئی لوگ ندی سے ہو کر واپس لوٹ رہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ دو چار آدمی کھڑے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”یہ سب علی جو نائب تحصیلدار کی کارستانی ہے۔ بچارے غریب راجپوت کو سورنی سے پھڑوا دیا۔ سنا ہے کہ علی جو بہت مدت سے در پردہ موہن سنگھ کے خلاف سازشیں کر رہا تھا۔“

کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اجی اس میں علی جو بیچارے کا کیا قصور ہے وہ موہن سنگھ تو ہے ہی ایسا اڑبینگ، اکھڑ، اڑب آدمی۔ وہ بھلا کب کسی کی سنتا ہے۔ شکار کا اس قدر شوقین، کہ خود تو پن چکی پر کبھی بیٹھا نہیں۔ نوکر کو بٹھا رکھا ہے۔ وہ چاہے سیاہ کرے یا سفید، بھلا نوکر کب اس طرح دیانتداری سے کام کرتے ہیں۔“

”جی اس میں اس کا اکھڑپنا کیا ہے، سب کچھ کمبخت اس ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ میرے چچا کا لڑکا تھا۔ کیا بتاؤں۔ تم نے تو رادھے اسے دیکھا تھا۔ کیسا کڑیل جوان تھا۔“

رادھے بولا۔ ”ہاں۔ بڑا گبرو جوان تھا۔ ذرا ایک سگرٹ دینا۔

”۔۔۔ تو جناب بس وہ بھی بڑا شکار کا شوقین تھا۔ ادھر سرکاری رکھ میں چپکے چپکے شکار کیا کرتا۔ کبھی کوئی ریچھ مار ڈالا، کبھی کوئی سور، کئی لومڑیوں کی کھالیں اس نے اپنے گھر میں لٹکا رکھی تھیں۔ یہ لو سگرٹ۔ بس جناب ایک دفعہ سردیوں کے دنوں میں جب گھٹنوں گھٹنوں برف پڑی ہوئی تھی وہ رکھ میں شکار کے لئے گیا۔ اور وہاں ایک ریچھ نے اسے گھائل کر ڈالا۔ شام کو جب وہ گھر نہ آیا تو دوسرے دن ڈھونڈیا پڑی۔ آخر گاؤں کے لوگ اسے اٹھا کر لائے اور گھر میں رکھا۔ دوا دارو کرتے رہے۔ لیکن زخم بہت گہرے تھے۔ خون بہت نکل چکا تھا۔ چند روز کے بعد مر گیا۔“

شیام بولا۔ ”لیکن تم لوگ اسے ہسپتال کیوں نہ لے گئے؟“

رادھے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”صاحب، وہ۔ ذرا۔ یہ معاملہ ٹیڑھا سا تھا۔ کیونکہ مرنے والا رکھ میں شکار کیا کرتا تھا، سرکاری رکھ میں۔ پھر شکار کا لائسنس بھی اس کے پاس نہ تھا۔

اس ڈر کے مارے اس کے رشتہ دار اسے ہسپتال نہ لے گئے۔ کیونکہ اگر وہ ہسپتال میں جاتا تو ڈاکٹر اس کے زخم دیکھتا پھر پولیس کو بھی پتہ چل جاتا۔ یہاں آپ دیکھئے نا، کچہری، پولیس، شفاخانہ ساتھ ساتھ ہیں۔ اس پر مقدمہ بنتا۔ اس ڈر کے مارے لوگ اسے ہسپتال نہ لے گئے اور گھر پر ہی جو کچھ بن پڑا کرتے رہے۔ اس کی آئی ہوئی تھی، مر گیا۔“

”موہن سنگھ کے پاس تو لائسنس ہے۔“ ایک بولا۔

”ہاں بھئی ہو گا۔“

”اگر نہ بھی ہو تو کیا ہرج ہے۔ یہ معاملہ دوسرا ہے۔ وہ نائب تحصیلدار صاحب کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ حاکم اسے خود بچا لیں گے۔“

”بیچارے کی جان بچ جائے۔ ہسپتال میں لا رہے ہیں اسے شاید۔“

”ہاں ڈاگدر (ڈاکٹر) بھی ندی پر گیا ہے۔ ایک کمپونڈر اس کے ساتھ تھا۔ وہی کانا بام دیو یا کیا نام ہے اس کا۔ آؤ ہم بھی ندی پر چلیں۔“

”لیکن وہ لوگ تو ادھر ہی آ رہے ہیں۔“

”پھر بھی چلنے میں کیا ہرج ہے۔ جو لوگ پالکی میں اٹھا کر اسے لائے ہیں، ان کے ہات بٹائیں گے۔ بھئی یہ اپنے گاؤں کا معاملہ ہے۔“

لیکن شیام ندی پر نہ گیا۔ وہ وہیں ماندر کو جانے والے راستے پر ناخ کے ٹیڑھے میڑھے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ غلام حسین بولا۔ ”یہ کمبخت سورنی بہت بری ہوتی ہے۔ اگر حاملہ ہو یا بچوں والی ہو تو بس خدا اس سے بچائے۔ دیکھیں بچارے موہن سنگھ کا کیا بنتا ہے۔ سنا ہے بڑے گہرے زخم آئے ہیں۔“

ندی سے آنے والے لوگوں کا شور بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگ دینیوں کے گٹھے ہاتھ میں لئے واپس چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے گھوڑے، خچر، سر جھکائے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ علی جو پیدل چل رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کی باگ ڈھیلی ہو کر گھوڑے کے پاؤں میں لٹک رہی تھی۔ علی جو نے شیام کو نہیں دیکھا۔

اب پالکی بالکل قریب آ گئی۔ ایک چارپائی میں لمبے لمبے ڈانڈ باندھ کر یہ پالکی بنائی گئی تھی۔ اور وہ موہن سنگھ کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اسے پیٹ کے بل لٹا رکھا تھا۔

پالکی گزر گئی۔ لوگ چلے گئے۔ شیام خاموش کھڑا رہا۔

غلام حسین نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہات رکھا۔ "چلئے، صاحب۔" نیچے گھاٹی پر سے کوئی آرہا تھا۔ اس کے ہات میں دینیوں کا گٹھا نہ تھا۔ نووارد جب بالکل قریب آگیا تو شیام نے اسے پہچانا۔

"چندرا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

یہ باؤلی والی لڑکی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی، جیسے اس کا سانس تیز چلنے لگا۔ اور چھاتیاں زور زور سے ہلنے لگیں۔ اس نے اپنے لب دانتوں تلے دبانے اور آنسوؤں کو آنکھوں میں آنے سے روک دیا۔ بولی "ہسپتال جاؤں گی وہ جہاں جائے گا وہیں جاؤں گی۔

غلام حسین بولا۔ "دنیا کیا کہے گی۔"

"وہ دنیا کا نہیں ہے وہ میرا ہے۔"

شیام بولا۔ "چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

یونہی بے سوچے سمجھے اس نے یہ فقرہ کہہ دیا تھا۔ اور وہ لڑکی کی آنکھوں میں نگاہ تشکر نہ دیکھ سکا۔

وہ سیدھا آپریشن روم میں چلا گیا۔ ڈاکٹر، موہن سنگھ کے سرہانے کھڑا اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ بام دیو کمپونڈر زخم دھو رہا تھا۔ پانی کی سفید دھار دیوار پر ٹنگی ہوئی ربڑ کی نلی سے نکل کر زخموں پر پڑتی تھی۔ اور لہو سے سرخ ہو جاتی تھی۔ ساری پیٹھ زخموں سے بھری پڑی تھی۔ کمر سے لے کر بائیں شانے تک اک گہرا شگاف تھا۔ یہاں غالباً سورنی نے سونڈ لگایا تھا۔

بام دیو بولا۔ "یہ بہنچ سورنی بھی بڑی ماں چ ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب یہ بہنچ حاملہ ہوتی ہے۔ دیکھئے۔ سونڈ یہاں کمر پر لگا اور گوشت کو ادھیڑتا ہوا شانے تک چلا گیا ہے۔ بہنچ۔"

بام دیو ماں اور بہن کی گالی غیر ارادی طور پر ہر وقت استعمال کرتا تھا۔ اور اب یہ گالیاں اس کی زندگی کا جزو، اس کی گفتگو کا تکیہ کلام بن گئی تھیں۔ ان گالیوں کو اس نے مخفف کر لیا تھا۔ ماں چ۔ بہن چ۔ اور انہیں پوری طرح ادا نہیں کرتا تھا بس بار بار اسی طرح کہتا تھا۔ بہنچ مانچ۔ وہ انہیں ان گنت بار دہراتا تھا۔ اس طرح کہ اب یہ گالیاں اس کی شخصیت کا ایک لازمہ بن گئی تھیں۔ اس کا قد

ٹھنگنا تھا، چہرہ سانولا اور لمبوترا، رخساروں کی ہڈیاں بالکل نکلی ہوئیں۔ جن کے نیچے گالوں کے سیاہ گڑھے تھے، ایک آنکھ سے کانا تھا، شراب خوب پیتا تھا، دل کا بہت نیک تھا، بیماروں کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔ شاید اسی لئے بہت سے لوگ اس کی بد زبانی کو برداشت کر لیتے تھے۔

شیام بولا۔ "یہ بچ جائے گا؟" اس کی آواز میں ناامیدی تھی۔

پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر جواب دے، بام دیو بول اٹھا۔ اجی بہنچنے کو اس میں کیا ہے۔ اسپائنل کارڈ سلامت ہے۔ ہم نے بہنچ اس سے بھی خطرناک کیس اچھے ہوتے دیکھے ہیں۔ یہ تو بہنچ کوئی اتنا ماں چ خطرناک کیس نہیں ہے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب، آپ کا کیا خیال ہے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "سنا ہے، اس سورنی کے ساتھ بچوں کا جھول تھا، علی جو صاحب نے اس پر جو گولی چلائی تو وہ زخمی ہو گئی۔ مری نہیں اور بچے ادھر ادھر بکھر گئے۔ یہ بپھری ہوئی ایک طرف کو دراتی ہوئی چلی گئی۔ سامنے موہن سنگھ آگیا۔ اس تیزی سے سورنی نے اس پر حملہ کیا کہ موہن سنگھ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ پیٹ کے بل نیچے گر پڑا۔ سورنی اسے سونڈ سے چیرتی ہوئی آگے جنگل میں غائب ہو گئی۔۔۔ نبض کمزور ہے جلدی کرو۔ بام دیو میں اسے کلوروفارم کی دوسری خوراک نہیں سنگھا سکتا۔ یہ اسے برداشت نہ کر سکے گا۔"

بام دیو بولا۔ "ابھی لیجئے۔ میں ابھی بہنچ سب کام ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ اس سورنی کی ماں کے دودھ میں حکم کا نہلا۔ کس طرح اس کڑیل جوان کا بہنچ قیمہ بنا کے رکھ دیا ہے۔"

شیام کا جی متلانے لگا۔ وہ آپریشن روم سے باہر چلا آیا۔ باہر دروازے سے چندرا لگی کھڑی تھی۔ اس کی خاموش نگاہوں کی التجا، وہ ابدی سوال، جوان نازک گھڑیوں میں زبان پر نہیں آتا۔ لیکن ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ہر آنسو میں جھلک اٹھتا ہے۔ وہی ابدی سوال اس اچھوت، بے یار و مددگار، لیکن دل میں عزم صالح رکھنے والی نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ یہ وہ نازک لمحے ہوتے ہیں جب انسان کی ساری طاقت گویائی نگاہوں میں مبدل ہو جاتی ہے۔

شیام نے اس کے کندھے پر ہات رکھ کر اسے تسلی آمیز انداز میں تھپتھپایا۔ بولا: "ڈاکٹر کہہ رہا ہے موہن سنگھ اچھا ہو جائے گا۔ اور بام دیو کمپونڈر تو کہتا ہے کہ (گالی اس کے لبوں پر آکر رک گئی) کوئی فکر کی بات نہیں۔"

"موہن کو کہاں رکھیں گے۔ گھر پر یا ہسپتال میں؟" چندرا نے پوچھا۔ "غالباً ہسپتال میں۔ وارڈ میں داخل کرینگے۔ مگر اس کی مرہم پٹی کیسے ہو سکے گی؟"

چندرا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تب تو میں یہاں ٹھہر سکوں گی۔ گھر پر تو اس کے رشتے دار مجھے گھسنے نہ دیں گے۔"

"کیا اس کے رشتے دار یہاں موجود ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ موہن سنگھ بالکل تنہا ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔"

"نہیں، اس کی والدہ کا ایک بھائی ہے، اور اس کی گھر والی، موضع دھڑے میں رہتے ہیں۔" پھر وہ سرگوشی میں بولی۔ "وہ اس وقت یہاں موجود ہیں۔ باہر ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"۔۔۔ پھر رک کر بولی۔۔۔ "وہی موہن کے بعد اس کی زمین، جائداد، پن چکی وغیرہ کے مالک ہوں گے۔ اگر آج موہن مر جائے تو۔۔۔" وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔

"فکر نہ کرو۔" شیام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "موہن اچھا ہو جائیگا۔"

"موہن کبھی اچھا نہ ہو گا، اگر اس کی تیمارداری اس کے یہ رشتے دار کرینگے۔ میں ان باتوں کو خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں ان رشتے داروں کو خوب سمجھتی ہوں۔ کبھی ہمارے بھی رشتہ دار تھے۔ آج گاؤں والوں نے ہمیں دیس نکالا دیدیا ہے۔ وہ کیا ہمارے میت ہیں۔ ہم سے تو وہ آنکھیں بھی نہیں ملاتے۔ چور ڈاکو، کمینے۔"

پھر وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "موہن کی تیمارداری میں کرونگی۔" پھر وہ شیام کے آگے ہات جوڑ کر کہنے لگی۔ "تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ میں عمر بھر نہیں اتار سکتی۔ ایک احسان مجھ پر اور کرو۔ ڈاکٹر سے کہہ کر مجھے یہاں موہن کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت دلوا دو۔"

"لیکن" شیام کہنے لگا۔ "یہ کیسے ممکن ہو گا۔ اس کے رشتے دار کیسے مانیں گے۔ گاؤں والے شور مچائیں گے۔ یہ براہمنوں کا گاؤں ہے۔ پنڈت سروپ کشن۔۔۔ جگ ہنسائی ہو گی۔ خود تمھاری ماں۔۔۔"

"میری ماں کی آپ فکر نہ کریں" اس سے میں خود نبٹ لوں گی۔۔۔ جگ ہنسائی کی میں پروا نہیں کرتی، اور پنڈت سروپ کشن بولے گا، تو میں اس کا منہ جھلس دوں گی۔۔۔ ہاں، یہ اس کے رشتے داروں والی بات ذرا ٹیڑھی ہے۔ لیکن اگر آپ۔۔۔" وہ پھر شیام کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے

دیکھنے لگی۔ ہونٹ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اک زلف رخسار پر لہرائی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی دل گداز چمک جن میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

شیام کو جیسے اپنے گلے میں کوئی چیز پھنستی ہوئی معلوم ہوئی۔ کمبخت یہ لڑکی نہیں جانتی کہ وہ کتنی حسین ہے۔ ایسا حسن بڑا خطرناک ہوتا ہے۔۔۔ سٹیلا سب کچھ جانتی ہے، وہ اپنے حسن کے سارے حدود اربع سے واقع ہے۔ اس کی ساری دلکشی، موہنی، جاذبیت سے پورے طور پر آگاہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کی مار کہاں تک ہے۔ اور کس حد سے آگے بڑھنا اس کے لئے ایک بیوقوفی ہو گا۔ لیکن اس حسن سادہ کی کم آگاہی، اس کا انجان پن ہی اسے سب سے زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔ سٹیلا کا حسن الجبرا ہے، چندرا کا حسن ایتھر کی لہر، سورج کی کرن، غروب آفتاب کا سونا۔

چندرا گھبرا کر بولی۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟"

شیام اپنے خیالات کے زیر نفسی رجحان پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "گھبراؤ نہیں، میں پوری کوشش کروں گا۔ بہر حال آج کی رات تو تم یہیں رہ سکتی ہو، میں بام دیو سے کہہ دوں گا۔ اور کل ڈاکٹر سے بھی بات کروں گا۔"

شیام نے پہلے ڈاکٹر سے بات کی۔ ڈاکٹر پس و پیش کرنے لگا "بڑا بے ڈھب معاملہ ہے۔" تیمارداری کے لئے ہر کس و ناکس کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں اس کلیئے کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ موہن سنگھ کی والدہ کا بھائی اس کا صحیح اور جائز وارث ہے، اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔ وہ اگر اس کی خبر گیری کرنا چاہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے نا۔ اور پھر یہ لڑکی اچھوت ہے۔ گاؤں والوں نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ موہن سنگھ کے رشتے دار اعتراض کر سکتے ہیں، کہ راجپوت کا جنم بھرشٹ ہو رہا ہے۔ براہمن اعتراض کریں گے، عرضی داغیں گے۔ میرے خلاف کارروائی ہو گی دیکھئے نا۔ اس معاملے کو آپ اتنا آسان نہ سمجھئے، اور پھر میں مسلمان ہوں۔ یہ سمجھا جائے گا کہ اس شخص نے جان بوجھ کر مذہبی مداخلت کی۔۔۔ دیکھئے آپ خود اس معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہیں۔۔۔"

پھر شیام نے بام دیو سے بات کی۔ وہ بولا۔ "اجی اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں بہنچ ابھی اس ماں پچ معاملے کو سلجھاتا ہوں۔ یہ لڑکی بھی رہے، اور کیا نام بہنچ اس کے رشتے دار بہنچ بھی رہیں۔ آپ

بالکل فکر نہ کریں۔"

شیام نے کہا۔ "ایک اور بات غور طلب یہ ہے کہ موہن سنگھ کے وارث عین ممکن ہے اس کی نگہداشت اچھی طرح نہ کریں اور اسے الٹا گزند پہونچانے کی سوچیں۔ کیونکہ اس کی موت سے انہیں بہت سا مالی فائدہ ہوگا۔ بر عکس اس کے چندرا۔۔۔" شیام نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔

ڈاکٹر بھی، اس معاملے کو سمجھ گیا اور بام دیو بھی۔ لیکن دونوں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ دینے سے ہچکچاتے تھے۔ آخر دوسرے دن بعد دوپہر جب موہن سنگھ کو ہوش آیا تو اس نے خود اس امر کا فیصلہ کیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ صرف چندرا ہی اس کی تیمار داری کرے۔ وہ اور کسی کے ہات میں اپنے آپ کو سونپنے کے لئے تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے رشتے دار گالیاں بکتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ اور چندرا نے اپنی چارپائی وارڈ میں موہن سنگھ کے قریب بچھالی۔

اس واقعہ کے تین چار روز بعد اس کی ملاقات علی جو سے ہوئی۔ علی جو اسے دیکھتے ہی بولا۔

"عزیزم۔ مبارک ہو۔ اب مٹھائی کھلواؤ نا۔"

"کیوں؟"

"ہم سے چھپاتے ہو۔ سنا ہے، تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ کسی بڑے اچھے گھرانے میں، سنا ہے منگنی میں پانسو روپیہ آیا ہے۔"

شیام نے آزردہ ہو کر کہا۔ "نائب تحصیلدار صاحب، آپ سے کیا پردہ مجھے تو اس میں خوشی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا نظر آتا۔ پانسو روپے سے زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ زندگی رفاقت اور محبت سے بسر ہوتی ہے۔ اور میں اس لڑکی کو جانتا تک نہیں، اس کی صورت تک سے نا آشنا ہوں۔ اب بتائیے یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔"

نائب تحصیلدار نے کہا۔ "ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو تم کیا سمجھو گے۔ سینکڑوں برسوں کے آزمائے رسم ورواج دو چار کتابی نظریوں سے نہیں جھٹلائے جاسکتے۔ تمہارے ذہن میں شاید مغربی کورٹ شپ کی دلفریبیاں گھوم رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ مغرب میں بھی شادی اسی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح یہاں، یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ وہاں بھی گھر، خاندان، ذات پات اسی طرح دیکھی جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے، کہ لارڈ کا لڑکا کسی مزدور کی لڑکی سے

شادی کرلے۔ میری ملاقات ایک دفعہ ایک امریکن پادری سے ہوئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ امریکہ کے شہروں اور قصبوں میں بھی شادی کے وقت حسب نسب کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر قصبے اور ہر شہر میں چند خاندان شرفا کے ہوتے ہیں۔ پھر کچھ خاندان ان سے کم درجے پر، پھر بساطی، کنجڑے، قصاب، نائی، دھوبی، وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے دائروں میں رہ کر شادی بیاہ کرتے ہیں۔ دیہات میں جو زمیندار لوگ ہیں ان میں بھی حسب نسب کا اتنا ہی خیال ہے۔ دراصل بات یہ ہے شیام صاحب کہ حسب نسب بڑی چیز ہے۔ جو سید ہے وہ سید ہے۔ اس کی یہ برتری سینکڑوں سالوں سے چلی آرہی ہے۔ اور محض دو چار خالی خولی باتوں سے نہیں جھٹلائی جاسکتی۔ جو چمار ہے وہ چمار ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ دنیا کا قاعدہ ہی یہی ہے۔ ادھر مغرب میں بھی لاکھوں شادیاں ان جماعتی دائروں کے اندر رہ کر والدین کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں کہ کورٹ شپ شادی سے پہلے شروع ہوتی ہے، یہاں شادی کے بعد۔ اور میرے خیال میں شیام صاحب، دوسرا طریق پہلے طریق سے زیادہ محفوظ اور خوبصورت ہے۔ آخر محض کورٹ شپ سے تو کسی کا مزاج نہیں بدلا جاسکتا؟ میں آپ سے کھلے لفظوں میں کہتا ہوں کہ اپنے جماعتی دائرے میں رہ کر شادی کرنا بہت اچھا ہوتا ہے۔ دیکھئے ہمارے ہاں مسلمانوں میں یہ رسم ہے کہ ہم اپنے ہی خاندان میں شادی کرلیتے ہیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے مزاج سے پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ خاندانی پیار کی وجہ سے صلح و آشتی کا رجحان پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ زندگی آرام سے گزر جاتی ہے۔ اب موہن سنگھ کو لیجئے۔ راجپوت ہے، خوبصورت ہے، اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، صاحب جائداد ہے۔ لیکن دیکھئے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں تباہ کر رہا ہے۔ اس اچھوت لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ جسے ساری برادری نے خارج کر دیا ہے۔ کیا اس کا نتیجہ اچھا نکل سکتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ سماج بڑی بھاری طاقت ہے۔ سماج انسان کی اجتماعی عقل اجتماعی قوت کا دوسرا نام ہے۔ سماج سے انحراف کسی صورت میں اچھا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ براہمن لوگ ابھی سے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ کس طرح موہن سنگھ اور چندرا کو الگ کر دیا جائے۔ اگر موہن سنگھ کو گاؤں میں رہنا ہے تو اسے برادری کے آگے سر جھکانا ہوگا۔ اور شیام صاحب بات دراصل یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو زندہ رہنے کے لئے، پیٹ پالنے کے لئے، آگے بڑھنے کے لئے، کسی نہ کسی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ وہ قیمت ہے جو

ایک فرد اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے سماج کو ادا کرتا ہے۔ چھایا کے معاملے ہی کو لیجئے۔ برادری سے انحراف کرکے اس نے کیا لیا۔ میں محبت کا قائل ضرور ہوں۔ اگر اسے ایک مسلمان سے محبت ہے تو جزاک اللہ۔ لیکن وہ ہندنی ہے، ہندو رہنا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں جہاں مذہب اور محبت کی آویزش ہو۔ میں ہمیشہ مذہب کو ترجیح دیتا ہوں۔ محبت، صاحب، آخر میں ایک سفلی، نفسانی، ذہنی جذبہ ہے۔ اور مذہب ایک عرشی، خدائی، الہامی چیز ہے۔ میں تو اس قسم کی محبت کو حرام سمجھتا ہوں۔ چاہے ایسی محبت کوئی ہندو عورت کرے یا مسلمان عورت۔ اور پھر آخر ایسی محبت سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ میں نے تو آج تک کوئی ایسی محبت پروان چڑھتی نہیں دیکھی۔ ہاں اگر دونوں فریق ایک مذہب اختیار کرلیں، تب بات اور ہے، لیکن آپ کے ہاں تو اس بات کی بھی اجازت نہیں۔ دراصل بات یہ ہے شیام صاحب کہ زندگی ان دنوں کچھ ایسی پیچیدہ ہوگئی ہے، کہ جو آدمی زندہ رہنا چاہتا ہے، اسے سماج کی بنائی ہوئی چار دیواری کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ اور میں نے تو چھایا کو کئی بار مشورہ دیا ہے کہ وہ برادری کے کہنے پر اپنی لڑکی کی شادی پنڈت سروپ کشن کے لڑکے سے کردے۔ بس سب جھگڑے فساد مٹ جائیں گے۔ اگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے یا اس کے اعمال پر نکتہ چینی بھی کرے تو میرا ذمہ۔ یہ پنڈت سروپ کشن بڑا عیار براہمن ہے۔ گاؤں کے سارے براہمن اس کی مٹھی میں ہیں۔ میں اسے خوب سمجھتا ہوں۔ مگر صاحب اس سے بنا کر ہی رکھنا پڑتی ہے۔ مگر چھایا ہے کہ میری بات مانتی ہی نہیں۔ تریاہٹ ہے اور کیا۔"

"تو آخر یہ چاہتی کیا ہے؟" شیام نے پوچھا۔

"یہ دراصل ونتی کی شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک لڑکا بلبھدر۔ ہے تو وہ بھی براہمن، مگر غریب ہے۔ جائداد وغیرہ بھی کوئی خاص نہیں۔"

"پھر یہ ایسی بیوقوفی کیوں کرنا چاہتی ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ یہ چھایا بڑے کینڈے کی عورت ہے۔ اپنی من مانی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ جو بلبھدر ہے، ذرا اچھا شکیل جوان ہے۔ اور دسویں جماعت پاس ہے، اور یہاں سکول میں مدرس ہے۔ کسی دن میں اسے آپ سے ملاؤں گا۔ وہ ونتی پر بری طرح مرتا ہے۔ گاؤں کے کئی اور لونڈے بھی مرتے ہونگے۔ لیکن اس کا عشق سب سے زیادہ بدنام ہے۔۔۔ کچھ اس وجہ سے بھی اور کچھ یہ بات بھی ہے، کہ شاید ونتی کو بھی اس لڑکے سے تھوڑا بہت انس ہے۔ چھایا اس کی

شادی بلبھدر سے کرنا چاہتی ہے۔ پھر بلبھدر کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ اس کا خیال ہوگا کہ اسے گھر داماد بناکر رکھے گی۔ برخلاف اس کے پنڈت سروپ کشن کا لڑکا بڑا بدصورت ہے، بیوقوف ہے، جاہل ہے، مگر صاحب، آخر ہے تو پنڈت سروپ کشن کا لڑکا۔ بات دراصل یہ ہے شیام صاحب کہ۔۔۔"

شیام نے گھبرا کر جلدی سے مصافحہ کیا۔ بولا۔ "معاف کیجئے نائب تحصیلدار صاحب، مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔ اجازت دیجئے۔"

علی جو بولا۔ "اچھا اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ میرا ابھی اب نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

اور شیام راستے پر چلتے چلتے سوچنے لگا۔ علی جو کی باتیں کتنی ٹھوس ہوتی ہیں۔ ٹھوس، صحیح، مجرب۔ جیسے کسی ڈاکٹر کا نسخہ۔ ان باتوں میں جامعیت ہے، لیکن حرکت نہیں۔ کیا حرکت، اضطراب، بغاوت کے بغیر انسان ترقی کرسکتا ہے۔ خود انسانی سماج نے پچھلے چند ہزار سالوں میں جو ترقی کی ہے، کیا اسی حرکت اور بغاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ مذہب کے پیغمبر کیا باغی نہ تھے۔ کیا انہوں نے اپنے سماج سے انحراف نہ کیا تھا۔ کیا وہ اپنے وقت میں دھریئے نہ سمجھے جاتے تھے۔ اگر زندگی ایک جگہ جم کر بیٹھے رہنے کا نام ہے تو پھر۔۔۔ موت کسے کہتے ہیں؟ اگر انسان کے دل میں اس فطری بغاوت کا شعلہ بلند نہ ہوتا، تو وہ شاید آج اسی طرح جنگلوں میں لنگور کی طرح دم لٹکائے درختوں پر پھلانگتا پھرتا۔ لیکن علی جو بہت دلچسپ آدمی ہے۔ پورا سوفطائی ہے۔ سو فیصدی سوفسطائی۔ لیکن اس میں تیقن تو ہے۔ شیام کے اعتقادات نے ابھی کوئی ٹھوس صورت اختیار نہ کی تھی۔ وہ ایک مبہم، اضطراری، پارے کی طرح سیال اور مائع حالت میں تھے۔ اس نے سوچا میں کبھی کچھ سوچتا ہوں، کبھی کچھ لاشعور سے چند رجحانات ابھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان کی پہونچ کیا ہوگی۔ ان کے بہاؤ کا کیا رخ ہوگا۔ زندگی کی داستان کیا صورت اختیار کرے گی۔

یکایک وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے سے ونتی چلی آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی۔ جس میں سرخ سرخ سیب جھانک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ونتی کی چال میں لغزش پیدا ہوگئی۔ اس کے قدم آہستہ ہوگئے۔ وہ دونوں اس تنگ رہگزار پر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک طرف سنبلوں کی جھاڑیاں تھیں، دوسری طرف ترناری کی بیل۔ شیام نے دیکھا کہ ونتی نے نینوں کا سپید

دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے۔ جسکی شفاف اوٹ میں شانوں پر لہرائے ہوئے گیسو جھانک رہے ہیں۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ چہرے پر اک جاں بخش تازگی تھی۔ اور رس بھرے ہونٹوں کے کونے کسی نامعلوم جذبہ کے زیر اثر کانپ رہے تھے۔ شیام کی نگاہ اس کے پاؤں کی طرف گئی۔ مسکرا کر بولا۔

”فیتہ اب تنگ تو نہیں کرتا؟“

وہ ہنسی۔ ہاں اس کی ہنسی سب سے دلکش تھی۔ اس ہنسی میں نہ صرف عام عورتوں کی ہنسی کی سی چاشنی، نزاکت اور چاندی گھلی ہوئی تھی، بلکہ اسے احساس ہوا کہ اس ہنسی میں کسی حسین ترین نغمے کی مکمل غنائیت موجود ہے۔ اس کے دل میں اس ہنسی کو بار بار سننے کی خواہش جاگ اٹھی۔

وہ شوخی سے کہنے لگا۔ ”اگر تمہیں یہ کمبخت فیتہ پھر کبھی تنگ کرے۔۔۔“

وہ پھر ہنسی کہنے لگی۔ ”سیب کھائیے نا۔ آپ کے باغ کے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔ ”میں اپنے باغ کے سیب نہیں کھایا کرتا۔“

اور پھر شیام نے ونتی کے چہرے پر گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے۔ وہ اپنے نینوں کے شفاف پردے سے اپنی چھاتیوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ جہاں اُس کے سینے کے طائر مضطرب انداز سے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، یا شاید نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے، پکے ہوئے پھل کی طرح۔ اور شیام کے دل میں ان پھلوں کو توڑ لینے کی خواہش تڑپنے لگی۔ ایک ضدی بچے کی طرح۔ میں چندا ماما لوں گا، میں چندا ماما لوں گا۔ میں وہ موٹر لوں گا۔ مجھے وہ لال چڑیا لادو۔ شیام کے لئے یہ احساس نیا نہ تھا۔ اور وہ اسے دبا دینے میں ہر بار کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنے احساس کی ضدی جبلت پر، ہر بار حیران بھی ہو جاتا تھا۔ بار بار دبائے جانے کے بعد بھی احساس دل کے کسی کونے میں سے پھر ابھر آتا تھا۔ وہ اس جنسی کشش کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بلکہ سٹیلا کے ساتھ بیٹھ کر اس نے کئی بار اس جنسی کشش کا شدید ترین بے رحمی سے تجزیہ بھی کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح تجزیہ کر کے وہ جنسی کشش کے احساس پر قابو پالے گا۔ لیکن یہ کشش ہر بار ایک ضدی بچے کی طرح مچل اٹھتی تھی۔ یہ کیا بات ہے کہ دو نوجوان مرد عورت ایک دوسرے سے ناآشنا ہوتے ہوئے، ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی، ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں کہ ساری زمین اور سارا آسمان گھوم گھوم کر ایک ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور زمین اور آسمان کا یہ سنہری سنگم ان دو دلوں کی دھڑکنوں میں اس طرح سما جاتا ہے، کہ وہ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ دو

ہیں یا ایک۔ ایک ہیں یا دو۔۔۔

ونتی نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ آپ حیران کیوں ہو گئے ہیں۔“

”میں سوچ رہا تھا۔“ شیام نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کہ ترناری کے یہ سپید سپید پھول کتنے بھلے ہیں۔ انکی مہک کتنی عجیب ہے۔“

ونتی بولی۔ ”ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔ میں آج ترناری کے پھول اپنے جوڑے میں لگاؤں گی۔ آپ کو اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا ان پھولوں کو چن دیجئے۔ انکی خاردار شاخوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

شیام نے ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن اس گنجان سبزے سے گھری ہوئی پگڈنڈی پر کہیں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ نہایت احتیاط سے پھولوں کے گچھے اتارنے لگا۔ اور ونتی وہیں جھنڈ کے نیچے سبزے پر بیٹھ کر اپنے جوڑے کو سنوارنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ”بس۔“ اس نے اپنے جوڑے میں پھول ٹکا لئے تھے۔ اور گجرے بنانے کے لئے اپنے دوپٹے میں پھول بھر لئے تھے۔ شیام کو ایسا معلوم ہوا جیسے ونتی خود ترناری کی بیل بن گئی ہے۔ وہی لچک، وہی خم، وہی پھول۔ سیاہ بالوں کے جوڑے میں ترناری کے سپید پھول اس طرح چمک رہے تھے۔ جیسے اندھیاری رات میں تاروں بھری کہکشاں، اور اب وہ داد طلب نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شیام مسکرا کر بولا۔ ”گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ لیکن شاید آپ اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں گی۔ بلبھدر سے پوچھ لیجئے گا۔“

لیکن ونتی نے شاید اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ کیونکہ اس نے شرما کر آنکھیں نیچے جھکالی تھیں۔ اور اب گرگابی کی لوک سے زمین کرید رہی تھی۔

وہ بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہ کمبخت فیتہ پھر تنگ کر رہا ہے۔ لائیے۔“ اور وہ اس کے قدموں کی طرف جھکا۔

لیکن ونتی ہنستے ہوئے اک وحشی ہرنی کی طرح چوکڑی بھر کر بھاگ گئی۔

اور شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں شیام نے باغ کے مغربی ٹیلے پر بیٹھے بیٹھے محسوس کیا کہ وہ آج اکیلا نہیں ہے، جیسے ونتی اب بھی اس کے ساتھ ہے، جیسے وہ اس کی مدھم شہد آگیں سانس کو اب بھی اپنی جبیں پر محسوس کر رہا ہے، جیسے اُس کی حنائی انگلیوں کے لمس سے اُس کے دل کے

ویرانے میں گلاب کے پھول کھلتے جارہے ہیں۔ جیسے اُس کی ہنسی کے حسین ترین نغمے نے ساری کائنات کو اپنی مکمل غنائیت سے معمور کر دیا ہے، جیسے یہ مہکتی ہوئی فضا، یہ ندی کا ترنم خیز پانی، یہ دھان کے خمار آگیں کھیت، اُسی سحر آگیں ہنسی کی لے پر کانپتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جیسے ترناری کے لاکھوں سپید پھول اس بیل سے اڑاڑ کر آسمان کی طرف جارہے ہیں اور اُنہوں نے رات کے سیاہ جوڑے میں ایک تاروں بھری کہکشاں بناڈالی ہے کائنات کے ذرے ذرے میں، زندگی کے کونے کونے میں، روح کے گوشے گوشے میں وہ آج ایک نئی ہستی کے لطیف لمس کا احساس کر رہا تھا اس سے پہلے آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اور شیام کا دل کسی نامعلوم خوف، کسی نامعلوم حسن کے احساس سے لرزنے لگا اور وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”ٹھہر اے دل۔۔۔ ٹھہر اے دل۔۔۔“

باب دوم

عمل

پنڈت سروپ کشن کا دو منزلہ مکان مہنڈرا اور موضع دھڑہ کی بیچ کی گھاٹی میں ایک بلند جگہ پر واقع تھا۔ یہاں سے ساری وادی کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ غالباً وادی کی سطح مرتفع پر یہ سب سے اونچی جگہ تھی اور براہمنوں کا سردار ہونے کی وجہ سے اس کی شان کے شایاں تھی۔ اُس کے مکان کے آس پاس اور بھی کئی براہمنوں اور امیر مہاجنوں کے گھر تھے۔ اس مکان سے ایک طرف توروڑی نالہ اور اُس کا تلہ اور ماندر کے بازار قدموں میں نظر آتے تھے، تو دوسری طرف تحصیل اور دیگر سرکاری دفاتر۔ اور اس کے بعد یہ گھاٹی گرتے گرتے ماندر کی ندی سے جا ملی تھی، اور اُس کے بعد دھان کے کھیتوں کا میدان اور آخر میں سلسلہ ہائے کوہ۔ شمال مشرق سے لے کر جنوب مغرب تک ساری وادی کا ہالہ یہاں سے بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس مکان کے زیریں حصے سے ملحق ایک کچا سا گھر بھی تھا۔ اسے "بانڈی" کہتے تھے یعنی مویشی خانہ۔ اس بانڈی کے آگے ایک کھیت کے کنارے کنارے بڑی اونچی باڑھ کھڑی کی گئی تھی۔ اس کھیت میں بینگن اور سبز مرچیں، اور بھنڈی توری اور کانشی پھل اور دیگر ترکاریاں بوئی ہوتی تھیں، اس سے پرے پنڈت سروپ کشن کے چھوٹے بھائی بسنت کشن کا گھر تھا۔ بسنت کشن کو پنڈت جی اور گاؤں والے اچھا نہ سمجھتے تھے اس لئے وہ عموماً لوگوں سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا، اس کی باتیں، اُس کے اطوار لوگوں کو پسند نہ تھے اور پھر وہ اپنے بڑے بھائی جتنا امیر بھی نہ تھا۔ پنڈت سروپ کشن کے مکان کے شمال مغرب میں دور تک اُس کے کھیت تھے۔ ان میں مکی اُگی ہوئی تھی۔ ان کھیتوں کے پرے درختوں کی اوٹ میں دھرم شالہ تھی۔ جہاں ایک اونچے منو کی چوٹی پر ایک کیسری جھنڈ لہرا رہا تھا۔ پنڈت سروپ کشن ایک چھوٹا موٹا جاگیر دار بھی تھا۔ دراصل اس کے بزرگوں کو یہ جاگیر اس دھرم شالہ کے سلسلے میں عطا ہوئی تھی، تاکہ اس دھرم

شالہ کا خرچ چلتا رہے۔ لیکن اب اس دھرم شالہ میں پنڈت سروپ کشن نے ایک پجاری کو رکھ چھوڑا تھا، جو اکثر بیمار رہتا تھا، اور اس پجاری کی والدہ ہی صبح اُٹھ کر پوجاپاٹ کیا کرتی تھی، یہ پجاری خود تو سکھ تھا۔ لیکن اس کی والدہ سناتن دھرمی عقائد کی پابند تھی۔ دھرم شالہ کے ایک کمرے میں یہ پجاری جب کبھی وہ اچھا ہوتا گوروگرنتھ صاحب کا پاٹھ کیا کرتا۔ اور اُس کی باریک، منمنی، بیمار آواز ایک کراہت آمیز تسلسل کے ساتھ اُس پگڈنڈی پر جانے والے مسافروں کو سنائی دیتی، جو دھرم شالہ کے قریب سے نیچے بازار کو جاتی تھی۔ دھرم شالہ کے ایک کمرے میں شوجی کی پوجا ہوتی تھی۔ اور صبح وشام پجاری کی والدہ یا کوئی اور بھگت آکر گھنٹہ بجاتا تھا۔ باہر منو کے درخت کے نیچے چند پتھر کی مورتیاں پڑی تھیں۔ اور شیام اُن مورتیوں کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے مختلف مندروں میں مورتیاں دیکھی تھیں، موجودہ دور کے سنگتراشوں کی بنائی ہوئی، لیکن وہ ان مورتیوں کے غلط تناسب، اور غیر جمالی خدوخال دیکھ کر منغّض ہو جایا کرتا تھا، لیکن اس گمنام جگہ میں پڑی ہوئی ان مورتیوں کو دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ یہ مورتیاں آج سے سینکڑوں سال پہلے سنگتراشوں نے بنائی تھیں، یہ مورتیاں ثابت وسالم بھی نہ تھیں، بلکہ ٹوٹی پھوٹی شکستہ حالت میں پڑی تھیں اور یہاں اس دھرم شالہ میں اُن کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ وہ منو کے درخت کے نیچے بکھری پڑی تھیں، اور غالباً اُن پر کوئی جل بھی نہ چڑھاتا تھا۔ اُن سے زیادہ تو اُس پتھر کی پوجا ہوتی، جس پر کسی اناڑی سنگتراش نے ایک ناگ اور اُس کا پھن بنا رکھا تھا، اسے گاؤں کی عورتیں ہر روز دودھ سے دھویا کرتی تھیں۔

ان شکستہ مورتیوں میں ایک دیوی کا سر بھی تھا، اس قدر خوبصورت کہ اس پر یونانی اصنام گروں کی کاری گری کا دھوکا ہوتا تھا۔ دراصل اس کی تراش خراش صاف کہے دیتی تھی کہ اس مورتی کے سنگتراش کے ہر فن پر یونانی اصنام گروں کا اثر پڑا ہے، خاص طور پر بالوں کے باندھنے کا انداز تو قطعاً غیر ملکی تھا۔ اُس نے پجاری سے پوچھا۔ "یہ مورتی یہاں کیسے آئی؟"

"جی، یہ پنڈت سروپ کشن جی کے دادا کو زمین کھودتے وقت ملی تھی، اس دھرم شالہ کے پاس یہ اور دیگر مورتیاں جو اس کے ساتھ پڑی ہیں، یہیں سے ملی تھیں جب وہ یہاں اس کھیت میں" اُس نے دھرم شالہ سے ملحق کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مینڈھ کو چوڑا کرنے کے لئے زمین کھود رہے تھے، اُن کی کدالی کسی سخت چہرے سے ٹکرائی اور زمین سے لہو کی دھار بہہ نکلی، وہ

کانپ گئے، اور آہستہ سے مٹی پرے ہٹانے لگے جب اُنہوں نے مٹی پرے کی تو انہیں اس دیوی کا سر نظر آیا خون میں لت پت۔"

"لیکن یہ سر تو پتھر کا ہے۔" شیام نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اس میں سے خون کی دھار کیسے......؟"

"جی ہاں، لیکن یہ تو دیوی کا سر تھا، اور پنڈت سروپ کشن کے دادا سے انجان پنے میں یہ خون ہوا تھا۔ بہر حال وہ زمین کھودنے لگے۔ تاکہ دیوی کے دھڑ کو بھی نکالا جائے۔ زمین کھودتے کھودتے اُنہیں اور بہت سی اشیا ملیں ان میں ایک وہ تصویر بھی ہے جب رام سیتا اور لکشمن بن باس کو جارہے ہیں۔ آپ نے وہ سندر مورتی دیکھی، اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مورتیاں نکلیں۔ لیکن دیوی کا دھڑ کہیں نظر نہ آیا۔ دیوی الوپ ہو گئی تھی۔"

"وہ کیوں؟"

پجاری نے شیام کے سوال کا جواب نہ دیا۔ بولا "تب پنڈت سروپ کشن کے دادا بہت گھبرائے۔ وہ بڑے ہی بھگت، نیک، پرماتما سے ڈرنے والے آدمی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اُن سے قصور ہوا ہے۔ اور دیوی الوپ ہو گئی ہیں، تو انہوں نے اپنے اپرادھ کو مٹانے کے لئے چالیس دن کا برت رکھا اسی برت میں انہوں نے اپنے پران تیاگ دیئے۔ اب اسی منو کے نیچے، وہ دیکھئے، ان کی سمادھ ہے، دور دور سے لوگ اس کی پوجا کو آتے ہیں"

سمادھ کی پوجا ہوتی تھی، لیکن مورتیاں حیران و پریشان اُسی شکستہ حالت میں پڑی تھیں وہ دیوی اب بھی کتنی پاکیزہ، کتنی حسین نظر آرہی تھی۔ لبوں پر اب بھی وہی لازوال مسکراہٹ تھی۔ بے شک اس صراحی کی طرح نازک اور مرمریں گردن سے لہو بہا ہو گا۔ جب یہ سر دھڑ سے جدا ہوا ہو گا شاید اس وقت سنگتراش کا جگر لہو ہوا ہو گا۔ جس نے اپنی روح کی ساری خوبصورتی اور رعنائی اس پتھر کی مورت میں ڈال دی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس دنیا میں ہر خوبصورت چیز ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے، اور یہ بدصورت سمادھیں، قبریں، اور اناڑی سنگتراشوں کی تراشی ہوئی مورتیاں اور پتھر کی سلیں جن پر چوڑے پھن والے ناگ ہوتے ہیں، صدیوں تک صحیح وسلامت رہتی ہیں۔ انہیں دودھ میں نہلایا جاتا ہے، اُن پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ گاؤں کی کنواریاں اور بہوئیں، اپنی زندگی کی بہترین منتیں اُن سے مانگتی ہیں۔ اور وہ جو لازوال حسن کی مالک ہے، وہ جس کے لبوں کے تبسم میں

کسی بھولے بچے کی معصومیت جھلک رہی ہے، جس کی جبیں پر کسی ان دیکھے آسمان کا غیر فانی نور چمک رہا ہے، خاک میں اٹی پڑی ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس مورتی کی گردن سے اب بھی لہو بہہ رہا ہے۔ بہتا رہے گا اُس وقت تک کہ جب تک وحشی انسان کے سینے میں اُس روشنی کی کرن نہیں پھوٹتی، جس نے اس پتھر کے ٹکڑے کے ذرے ذرے میں اکمل ترین رعنائی اور موہنی پھونک دی تھی......

پنڈت سروپ کشن اس دھرم شالہ کا سرکاری پروہت تھا۔ عمر بیالیس برس کے قریب ہو گی، قد غیر معمولی طور پر لانبا، جو اُس کے براہمنی وقار میں بھی اضافہ کرتا تھا، فراخ ماتھا، لب پتلے اور شخصی غرور سے خمیدہ، نچلا جبڑا بہت مضبوط، بھویں اوپر کو مڑی ہوئیں، جس طرح مغربی مصور اپنے "شیطان" کی تصویر میں، بناتے ہیں، اور مشرقی مصور کسی خوبصورت نرت کار کی۔ آنکھوں کے اوپر کے پپوٹے غلافی تھے۔ آنکھوں میں ایک بے چین سی چمک، جو ایک گہرے ادراک کا پتہ دیتی تھی۔ ٹھوڑی خمیدہ، بلند گردن، چوڑے شانے، اچکن کے نیچے دھوتی اور چپل یا کھڑاویں، ماتھے پر صندل کا چوڑا تلک، اور دونوں بھوؤں کے درمیان چندن کی سرخ لکیر، ترشول نما، کانوں کی لوؤں پر بھی صندل کی بندیاں نظر آتی تھیں، جن کے درمیان میں اُس نے چاندی کے بُندے سے پہن رکھے تھے، جس کے وسط میں سپید نگینے چمکتے تھے، ایک سپید صافہ اچکن کے اوپر بلند گردن کے دونوں طرف چھاتی پر آویزاں رہتا تھا۔ اُس کی خوبصورتی ایک اجنتا کے دیوتا کی سی خوبصورتی تھی، اور شیام حیران تھا کہ اس خوبصورتی کے اندر اتنی سیاہی کیسے موجود ہو سکتی ہے۔ ہاں ایک دو باتیں ایسی تھیں کہ اُسے شبہ میں ڈال دیتی تھیں۔ ایک تو سروپ کشن کی آنکھوں کی بے قرار چمک، اور اُس کی پتلیوں کا رہ رہ کر ادھر اُدھر گھومنا، جیسے وہ ہر وقت اپنے اردگرد کی فضا کو تشویشناک انداز سے دیکھنے کا عادی ہو۔ اور دوسرے اس کے لبوں کا تبسم، اور اُن کا شخصی غرور۔ جو کبھی کبھی کسی پنہاں بہیمیت کا پتہ دیتا تھا۔ سروپ کشن کے ہونٹ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ چاہے اُس کی ذہنی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تبسم دوام کسی باطنی سکون کا پتہ نہ دیتا تھا، بلکہ کسی خطرناک شاطر طبیعت کا آئینہ دار تھا۔ شیام کو اس امر کا بخوبی تجربہ تھا کہ ایسے لوگ جو ہر وقت مسکراتے رہیں یا ہنستے رہیں کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔

اگر سروپ کشن کے ظاہر میں اجنتا کی تصویروں کی سی رعنائی تھی تو اُس کی بیوی درگا میں

مصری ممیوں کی سی بے جان اور خشک نقاہت، گو اُس کے کولہے کافی چوڑے تھے، لیکن کولہوں سے اوپر وہ بالکل خشک، سوکھی ہوئی، پژمردہ، ایک بے جان ممی کی طرح نظر آتی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں، اور اُن پر زرد مٹیالی سی کھال منڈھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لب بے حد پتلے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ٹھوڑی چھوٹی اور ماتھا بے حد فراخ، تکونا منہ تھا۔ دانتوں پر مسی اور لبوں کو اخروٹ کی چھال سے رنگنے کی بے حد شوقین تھی۔ دانت اچھے تھے لیکن اس کے چہرے پر بدنما معلوم ہوتے۔ یوں معلوم ہوتا کہ باقی سارا چہرہ اچھا خاصہ ہے، مگر یہ دانت برے ہیں یا یوں احساس ہوتا کہ یہ دانت اچھے ہیں، لیکن اگر چہرہ بدل دیا جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ آواز بھاری اور کبھی کبھی ناک میں گنگناتی ہوئی۔ کانوں میں ہمیشہ مرغابی کے پروں کے سیاہ کنڈل پہنا کرتی تھی، مرغابی کے سیاہ کنڈل بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور کسی خوبصورت عورت کی لوؤں میں اُنہیں جھومتے دیکھ کر دل پر نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں صرف کنڈل خوبصورت تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کے ساتھ کنڈل نہیں لٹکائے گئے بلکہ ان خوبصورت کنڈلوں کے ساتھ درگا کا چہرہ لٹکا دیا گیا ہے۔ درگا کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی نفرت، بدصورتی، اور کراہت کا احساس ہوتا تھا۔

درگا کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے لبوں پر ہر وقت ایک نہ بجھنے والی ہوس کی چمک موجود رہتی تھی۔ یہ چمک دیکھنے والے کو پہلی نگاہ ہی میں اُس سے متنفر کر دیتی تھی۔ گو وہ ادھیڑ پنے کے وسط بلکہ آخری ایام میں تھی، لیکن ابھی تک اُس کے سارے انداز کنواریوں کے سے تھے۔ یا یوں کہیے (اگر اس سے زیادہ انصاف کرنا مقصود ہو) کہ نئی نویلی بہوؤں جیسے تھے۔ ان اطوار پر کیوؤں کو گھن آتی تھی۔ اور غالباً ان لوگوں میں سروپ کشن بھی شامل تھا۔ لیکن درگا کے ان اطوار نے اور اُس کی کبھی نہ بجھنے والی ہوس نے اسے پولیس کے سپاہیوں، کچہری کے پیادوں، بازار کے غریب سناروں، مالیوں، اور کمسن لوگوں میں بہت مقبول کر دیا تھا۔ کیا ہوا اگر اُس کے دھڑ سے اوپر کا جسم مصری ممیوں کی طرح تھا۔ اس کے لئے کولھے تو کافی فراخ تھے۔

اجنتا کی تصویر اور مصری ممی نے مل کر درگا داس کو جنم دیا تھا۔ بریڈنگ کراس کی اس سے بری مثال شاید اور کہیں نہ مل سکتی تھی۔ کم از کم شیام تو ایسی مثال سے آگاہ نہ تھا، درگا داس کے شانے فراخ تھے لیکن دھڑ سوکھا ہوا، کسی سوکھے ہوئے درخت کی جڑوں کی طرح جس کے پتے ابھی تک سبز ہوں، بائیں ٹانگ سے لنجا، ایک آنکھ سے کانا۔ لیکن کانا بھی اس طرح کہ آنکھ اندر کو دھنسی ہوئی

اور اُس میں سے ہر وقت پانی رستا رہتا تھا، اوپر کا ہونٹ پتلا اور خوبصورت طریق پر خمیدہ، نچلا بے حد بے ہنگم اور موٹا، جس میں سے دو دانت باہر کو ہر وقت نکلے رہتے تھے۔ ٹھوڑی گول جس کے وسط میں ایک کالا بھدا سا مسا تھا۔ چہرہ تکونا، گال بھرے ہوئے اور پھولے ہوئے، جس سے گول ٹھوڑی اور بھی چھوٹی بلکہ فروعی نظر آتی تھی۔ گھٹے ہوئے ماتھے پر بال ہمیشہ بکھرے رہتے تھے گردن چھوٹی تھی، لیکن ہاتھ مضبوط اور توانا تھے، اور اُنگلیاں لمبی۔ چھڑی رکھنے کے باوجود گھسٹتا ہوا چلتا تھا۔ اور باتیں کرتے ہوئے ایک کھوکھلے انداز میں ہنستا تھا جس سے اکثر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چال میں بلکہ جسم کے سارے اعضا میں فرینکنسٹین کی سی ناہمواری اور جامد کراہت تھی۔

اوائل اگست کی ایک شام کو پنڈت سروپ کشن نے اپنی بیٹھک میں گاؤں کے بہت سے معزز براہمنوں اور مہاجنوں کو ایک ضروری معاملے پر مشورے کے لئے بلایا۔ لگ بھگ چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوں گے اس مجلس میں لالہ بانشی رام، لالہ حکم چند، لالہ پھول چند، لالہ دیپ چند، بسا کھامل، گجامل، پھنجی مل، اور کونڈو رام مہاجنوں کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ یہ لوگ اپنی سانولی رنگت، بلکہ اکثر حالتوں میں کالی رنگت، لمبی ناک اور مسکین لہجے سے پہچانے جا سکتے تھے۔ آواز میں ریشم کی سی ملائمت تھی، لیکن اگر لفظوں کے مفہوم پر غور کرو تو ہر لفظ، ہر فقرہ ایک دو دھاری تلوار کی طرح دونوں طرف کاٹ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ذہنی توازن ہی نے تو ان مہاجنوں کو اتنا امیر بنا دیا تھا اور یہ لوگ اپنی قومی خصوصیت کسی حالت میں بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے نہایت وسیع و عریض پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ہاتھوں میں سونے کی بیش قیمت انگوٹھیوں کی نمائش کر رہے تھے۔ جن میں لال لال نگینے جڑے ہوئے تھے۔ بلکہ لالہ بانشی رام کے پاس تو سونے کی گھڑی بھی تھی۔ جس کے سامنے ایک سونے کی زنجیر لگی تھی۔ اور وہ بار بار سونے کی زنجیر کھینچ کر گھڑی کا وقت دیکھتا تھا۔ جبیں پر شکن ڈال کر اپنی مونچھوں کو سنوارنے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ جو بار بار ہونٹوں کے کونے میں آ گرتی تھیں، سونے کی گھڑی کے علاوہ اُس کی موٹی توند نے بھی اُسے باقی مہاجنوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ جن میں سے کسی کے پاس بھی اتنی موٹی توند نہ تھی۔

اس مجلس میں چند نمائندے گاؤں کے سکھوں کی طرف سے بھی تھے۔ یہ لوگ دراصل نیم سکھ اور نیم سناتن دھرمی ہوتے تھے۔ جیسی ہوا دیکھی اُدھر کا رخ کر لیا اور یہ ان لوگوں ہی پر کیا محدود تھا، گاؤں کے اکثر باشندوں کی یہی حالت تھی۔ واگورو کا نام بھی لیتے تھے اور شیوجی کی پوجا بھی

کرتے تھے۔ جس طرح جی چاہا عبادت کر لی، ان سکھوں میں سردار کھیشر سنگھ، سردار بچتر سنگھ اور سردار کلیائی سنگھ بہت نمایاں تھے۔

موضع دھرہ سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ پنڈت روتر بھان جی، مشر گنگو، بدھو پروہت، اور پنڈت پیڑا رام آج حجامت کرا کے، نئی قمیص پہن کر، ماتھے پر تلک لگا کر، گلے میں مالا ڈالے، کندھے پر انگوچھا رکھے براجمان تھے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ دراصل یہ لوگ کسان تھے، کھیتی باڑی کے کام کاج سے پوری طرح واقف تھے۔ موسم، بیج، پانی، کھاد، جنگل کی جڑی بوٹی، اس قسم کے موضوع پر آپ اُن سے گفتگو کر لیجئے۔ آپ اُن کی معلومات کو بے حد دلچسپ اور بے حد مفید پائیں گے لیکن دھرم شاستروں اور اس قسم کی مذہبی باتوں کی باریکیوں سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ لیکن چونکہ ہزاروں سال سے براہمن چلے آ رہے تھے، اس لئے اب اپنی پنڈتائی کو برقرار رکھنے کے لئے اس مجلس میں بڑے متین اور بزرگ صورت بنے بیٹھے تھے۔ لیکن اُن کے چہروں سے اُن کے خالی الذہن ہونے کا پورا اندازہ ہو جاتا تھا، اور اس جبری متانت کے باوجود یہ لوگ اس مجلس میں بار بار بے چین اور مضطرب ہو اٹھتے تھے، پہلو بدلتے ایک دوسرے سے کھسر پسر کرتے۔ کبھی آنکھیں بند کر کے کوئی انٹ شنٹ غلط اشلوک گنگنانے لگتے۔ تاکہ دوسرے براہمنوں پر اُن کا رعب طاری ہو جائے۔ مذہبی سماج کی روایت پرستی اور جاہلیت یہاں پورے طور پر عیاں نظر آتی تھی۔ درگاداس اس مجلس میں ادھر اُدھر گھستا ہوا لوگوں کو پانی، شربت وغیرہ کے لئے پوچھ رہا تھا۔ اُس کی کھوکھلی ہنسی بار بار کمرے میں گونج اٹھتی۔

"پنڈت سروپ کشن جی کہاں ہیں۔" لالہ بانشی رام نے اپنی طلائی گھڑی کو جیب سے دسویں بار نکالتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ابھی آتے ہیں۔" درگاداس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "اوپر دھیان میں مگن ہیں پوجا کر رہے ہیں خی خی خی۔" وہ ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگا۔

لالہ کونڈو رام بولے۔ "لوہے کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔"

چھایا کا بھائی روشن بولا۔ "بیر کے میلے میں کے دن رہ گئے ہیں۔"

درگاداس بولا۔ "بارہ روز۔ خی خی خی۔ اب کے خوب رونق ہو گی، ہم سب لوگ میلے پر چلیں گے۔ خی خی خی۔ پنڈت روشن لال جی! آپ بھی سب لوگ میلے پر چلیں گے نا۔ خی خی خی۔"

یہ "سب لوگ" سے درگاداس کی کیا مراد تھی، اسے سب لوگ سمجھتے تھے۔ بیٹھک میں ایک قہقہہ پڑا۔ روشن شرمندہ ہو گیا۔ درگاداس کے منہ سے ہنسی کی چیخیں نکل رہی تھیں اُس نے سوچا کہ اُس نے غالباً کوئی نہایت ہی عمدہ مذاق کیا ہے جس پر اب لوگ یوں خوش ہو کر قہقہے لگا رہے ہیں۔

"ہو۔ ہو۔ ہو۔ خا۔ خا۔ خا۔" وہ جھولتا جھولتا ہنس رہا تھا۔ اُس کا نچلا ہونٹ باہر لٹک رہا تھا۔ اور اُس کے سامنے کے دو دانت اس طرح باہر دکھائی دے رہے تھے، جس طرح ہندو مصور اپنی دیومالا کی تصویریں کھینچتے وقت راکششوں کے دانت دکھایا کرتے ہیں۔ وہ سچ مچ اس وقت ایک راکشش معلوم ہو رہا تھا۔

عین اُسی وقت پنڈت سروپ کشن جی بیٹھک کے اندر داخل ہوئے۔ سب لوگوں نے اُٹھ کر اُنہیں نمسکار کیا۔ بیٹھک "پالا گن مہاراج پالا گن مہاراج" کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ پنڈت جی مسکرائے۔ مسکراہٹ اُن کے لبوں سے پھسل کر سارے چہرے پر پھیلتی گئی۔ وہ ایک پروقار طریق پر آگے بڑھتے گئے اور اپنی خالی مسند پر، جہاں گاؤ تکیہ لگا تھا جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے بعد گاؤں کے لوگ پھر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور ساری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ پنڈت جی کی مسند کے قریب دو لکڑی کی چوکیاں لگی تھیں اُن میں ایک پر یوگ واششٹ پڑا تھا۔ اور دوسری چوکی میں ایک پیتل کی تھالی پر ایک گھی کا دیا روشن تھا اور اگر بتی بھی روشن تھی اور اُس کا معطر دھواں کمرے کی فضا میں چکر کاٹتا ہوا پھیل رہا تھا۔

سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ پنڈت جی بولے۔ "سجنو۔ آج میں نے آپ کو ایک نہایت ہی کٹھن بات پر سوچنے کے لئے بلایا ہے۔ کئی دنوں سے میں اس وشے پر سوچ رہا تھا۔ اور اس کے اچھے برے پہلوؤں پر وچار کر رہا تھا۔ من میں سو طرح کی باتیں آتی تھیں۔ دنیاداری اور دھرم کی لڑائی تھی۔ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا، کبھی دوسرے کا۔ اسی تشویش میں دن گزرتے جا رہے تھے۔ سوچتا تھا، آپ لوگوں کو بلاؤں یا نہ بلاؤں۔ لیکن کل رات جب میں سوسی واچن کر کے یوگ واششٹ پڑھنے لگا، میرے سامنے یہ منتر آیا۔" اور اتنا کہہ کر پنڈت جی نے یوگ واششٹ کو کھول کر نہایت اطمینان سے اس کے ورق اُلٹنے شروع کئے۔

کمرے میں ایک گہرا سناٹا تھا صرف ورق الٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی برادری والوں نے جیسے اپنے سانس بھی روک لئے تھے۔

"ہاں یہی منتر تھا۔" پنڈت جی نے بلند آواز میں کہا۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے منتر کا اُچارن کیا۔ اُچارن کے بعد مہاجن تو خاموش بیٹھے رہے لیکن کئی براہمنوں نے بڑے زور سے آہ کی یا واہ کی کسی نے سر ہلایا۔ گویا کہہ رہا ہو، اس منتر کے معنی بس میں ہی سمجھتا ہوں۔ کسی نے لمبی سانس لے کر اس طرح رام رام کہا۔ گویا کہہ رہا تھا اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔ اس منتر میں جو معرفت کا دریا بند ہے، اسے اس خاکسار کے سوا اور کون سمجھ سکتا ہے۔ منتر تو پنڈت پیڑا رام کی سمجھ میں بھی نہ آیا لیکن یہاں کچھ کہنا ضروری تھا، ورنہ ساری پنڈتائی دھری کی دھری رہ جاتی۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے بلند آواز میں بولے۔ "ہے ماتما تیری لیلا پرم پار ہے!" اب اس کا مطلب جو چاہے لے لیجئے۔

درگاداس اپنی کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگا لیکن کسی نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ مشر گنگو بولا۔

"واہگورو جی، یوگ واششٹ تو بس یوگ واششٹ ہے جو اس کا پٹھن پاٹھن کرے، اُس کا تینوں لوک میں بھلا ہوتا ہے۔"

پنڈت سروپ کشن جی مسکراتے ہوئے بولے۔ "اس منتر کا ارتھ یہ ہے کہ زندگی دو دن کا میلہ ہے۔"

درگاداس اپنی کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "خی خی خی، پیر کا میلہ ......"

"درگاداس۔" پنڈت جی نے گرج کر کہا۔ "خاموش رہو۔"

درگاداس کی ہنسی اُس کے گلے میں گڑگڑاہٹ سی پیدا کرتی ہوئی دب گئی، اُس کا نچلا ہونٹ باہر لٹکنے لگا۔ وہ اپنی کانی آنکھ سے بہتے ہوئے پانی کو انگوچھے سے پونچھنے لگا۔

پنڈت جی نے اپنی مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر پھر پہن لیا۔ بولے۔ "سجنو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیون دو دن کا میلہ ہے۔ اسے ہنسی خوشی گزارو۔ لیکن" اور پھر وہ چند ثانئے خاموش رہے اور منتر کا دوسرا مصرعہ پڑھ کر بولے "لیکن اس کے ساتھ تمہارا یہ بھی فرض ہے کہ زندگی کے اس میلے میں اپنے دھرم سے غافل نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دھرم ہی سے مکتی پراپت ہوتی ہے۔"

"ستیہ ہے۔ بالکل سچ ہے۔" کئی براہمنوں نے ایک ساتھ مل کر کہا۔

لالہ بانشی رام بولے۔ "پنڈت جی آپ کی بانی میں امرت گھلا ہوا ہے۔"

پنڈت سروپ کشن نے بہ انداز تشکر لالہ بانشی رام کی طرف دیکھا۔

"لیکن اب یہ بتائیے۔" لالہ بانشی رام نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ آپ نے

آج ہمیں کیوں یاد کیا ہے۔"

لالہ پھنجی مل سنار بولے۔ "میں آج پنڈت جی کے بلاوے پر بہت جلدی اپنی دکان بند کر کے چلا آیا۔ آج ایک گوجر نے اپنی بیوی کی ہنسلی لے جانے کو کہا تھا۔ بے چارا آکر واپس چلا گیا ہو گا۔"

بدھو پروہت اپنے گلے کی مالا درست کرتے ہوئے بولے۔ "ست نام ست نام۔"

سردار بچتر سنگھ نے سردار کھیشر سنگھ کے کان میں کہا۔ "بالکل ایک ایسا ہی اشلوک ہمارے راج گورو سچے بادشاہ نانک بابا نے کہا ہے، وہ یہ اشلوک ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک اشلوک سردار کھیشر سنگھ کے کان میں پھونکا۔

سردار کھیشر سنگھ گاؤں کے پٹواری تھے۔ اور دن بھر کھیتوں میں جریب لئے پھرتے تھے۔ یا کھتونی اور کھیوٹ نمبر کی گردان کرتے رہتے تھے۔ جپ جی صاحب انہوں نے بالکل بے مطلب اور لایعنی طور پر رٹ رکھا تھا۔ اور اس کا پاٹھ وہ اشنان کرتے وقت اتنی جلدی کیا کرتے تھے جیسے اپنے سر سے کوئی بلا ٹال رہے ہوں۔ وہ اس اشلوک کا تو کیا دنیا کے کسی اشلوک کا بھی مطلب نہیں سمجھ سکتے تھے انہیں صرف ایک اشلوک آتا تھا۔ اول نام روپے کا بعد میں نام روپے کا اور سب سے آخر میں سب سے سچا نام روپے کا۔ لیکن اس وقت وہ بھی رموز معرفت کے مفسر بن گئے۔ اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ "بالکل بالکل (وہ ہمیشہ بالکل کو "بل کل" کہا کرتے تھے) یہ باباجی کا ہی اشلوک ہے جو ان ہندوؤں نے یوگ باششٹ میں چرا کر رکھ لیا ہے۔" اور اتنا کہہ کر وہ مسکرائے پھر بچتر سنگھ بھی اُن کی ذہانت طبع پر مسکرانے لگا اور سردار گلھاٹی سنگھ نے جو اس گفتگو سے یکسر محروم رہے تھے، جب اپنے دونوں بھائیوں کو مسکراتے دیکھا تو وہ بھی اس مسکراہٹ میں شامل ہو گئے، پنڈت سروپ کشن نے جب اس تبسم مثلث کو دیکھا، تو اس کے ارکان کو بھی اپنے داد خواہوں میں شامل کر لیا۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ "سردار بچتر سنگھ جی، آج میں نے آپ کو اور باقی سب بھائیوں کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ایک نہایت ہی تکلیف دہ بات کا فیصلہ کیا جائے۔"

سردار گلھاٹی سنگھ بولے۔ "راجگورو کرپا کریں گے آپ فرمائیں وہ کیا تکلیف دہ بات ہے۔"

پنڈت سروپ کشن کی بھویں اور بھی تن گئیں۔ غلافی پپوٹوں کے نیچے آنکھیں اور بھی بے چین ہو گئیں۔ چندن کا ٹیکا جیسے آگ کا شعلہ بن کر چمکنے لگا کہنے لگے "دھرم کی حفاظت کرنا میرا آپ کا سب کا فرض ہے کل جب میں یوگ واششٹ کا یہ منتر پڑھ کر سویا تو میں نے خواب میں اپنے

داداجی کو دیکھا۔"

"ست نام ست نام۔" مشر گنگو نے کہا۔

"میں اُن کے چرنوں میں گر پڑا۔ داداجی کہنے لگے، بیٹا، دھرم کی حفاظت کے لئے اگر تجھے اپنی جان بھی دینا پڑے، تو انکار نہ کیجو۔ جو معاملہ ہے صاف اپنی برادری میں بیان کر دے، برادری تیرا کہا کبھی نہ موڑے گی۔ اتنا کہہ کر داداجی الوپ ہو گئے۔"

"راجگورو۔ راجگورو۔ سچے بادشاہ۔" سردار بچتر سنگھ نے مرعوب لہجے میں کہا۔

"آپ کے داداجی تو سنت تھے۔ سنتوں کا کہا کون موڑ سکتا ہے۔ حکم کیجئے مہاراج۔" لالہ کونڈا مل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

روشن بولا۔ "کیا پھر کسی سے کوئی اپرادھ ہوا ہے۔"

"ہاں۔" پنڈت سروپ کشن گرج کر بولے۔ "آپ کے سامنے آپ کا دھرم ڈبویا جا رہا ہے، اور آپ کو شرم نہیں آتی۔ وہ بدمعاش چندرا جسے آپ نے اور ساری برادری نے اُس کی ماں کے ساتھ اُسے باہر نکال دیا ہے آج پھر اسی گاؤں میں آ کر ایک راجپوت کا جنم بھرشٹ کر رہی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ ایک راجپوت گھرانے کا ستیاناس ہو رہا ہے اور آپ لوگ اس سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ وہ مسلمان ڈاکٹر بھی اس اچھوت عورت کی طرف داری کر رہا ہے۔ اور علانیہ اور کھلم کھلا ہمارے مذہب پر حملہ کر رہا ہے اور آپ لوگ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ سادھے بیٹھے ہیں، سب کچھ سن رہے ہیں اور کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن اس دھرتی پر سے ہمارے دھرم کا ناش ہو جائے گا اور اس گاؤں پر پرماتما کا وہ قہر نازل ہو گا کہ آپ اُس وقت ہاتھ مل مل کر پچھتائیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔"

ساری محفل کانپ رہی تھی۔ صرف مہاجن لوگ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ بانشی رام بولے۔ "پنڈت جی، جو کچھ آپ نے کہا اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ لیکن آپ ہی بتائیے ہم کیا کر سکتے ہیں موہن سنگھ کی طبیعت کو آپ جانتے ہی ہیں وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔ اور اس وقت تو خاص کر جبکہ وہ زخموں سے نڈھال ہسپتال میں پڑا ہے اور چندرا اتنی تندہی سے اُس کی تیمارداری کر رہی ہے، وہ کب ہماری بات سنے گا۔ اُسے اچھا ہو جانے دیجئے، پھر اُسے سمجھائیں گے۔"

"ہاں، ہاں۔" کئی لوگوں نے لالہ بانشی رام سے اتفاق ظاہر کیا۔

"اُسے اچھا ہو جانے دیجئے۔" پنڈت سروپ کشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ چندرا سے شادی کرلے گا۔ اور گاؤں میں ایک اور دوجے کا جنم بھرشٹ ہو جائے گا۔ راکش بدھی والے لوگ بڑھتے جائیں گے اور دیوتاؤں کا دھرم اور خطرے میں پڑ جائے گا۔ میں کہتا ہوں کیا اُس کی تیمارداری اُس کے رشتے دار نہیں کر سکتے۔"

موہن سنگھ کا رشتہ دار بھی وہیں بیٹھا تھا، اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں برادری سے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرے رشتہ دار کا دھرم بچایا جائے۔"

"لیکن۔" لالہ پھنجی مل سنار بولے۔ "یہ بڑی مشکل سی بات ہے۔ ڈاکٹر بڑا بھلا مانس، شریف آدمی ہے۔ آج تک اُس نے کبھی۔۔۔" وہ چپ ہو گئے کیونکہ پنڈت جی نے تیوری چڑھالی تھی اور اُس کی طرف غصے سے دیکھ رہے تھے۔

پنڈت جی بولے۔ "میں آپ کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے خلاف تو ایک رجسٹری اسی وقت حکامِ اعلیٰ کی خدمت میں دینی چاہیئے، باقی رہی چندرا، تو اس کے متعلق بھی میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے درگاداس کو اشارہ کیا، اور کہا۔ "چندرا کی ماں کو بلاؤ۔"

"چندرا کی ماں؟" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

پنڈت جی نے فتح مندانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا بولے۔ "میں نے آج صبح چندرا کی ماں کو بلایا تھا۔ وہ بھی چندرا کی اس حرکت پر خوش نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں اُس سے پتہ چلا کہ چندرا ابھی نابالغ ہے ایک سال عمر کم ہے اگر چندرا کی ماں چاہے تو۔ لیکن ٹھہریئے، ابھی آپ کے سامنے سب باتوں کا فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ میں نے آج صبح سے اُس عورت کو یہاں بٹھا رکھا ہے۔"

درگاداس چندرا کی ماں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اور ہنستا ہوا بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ چندرا کی ماں بیٹھک کی دہلیز سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

بیٹھک میں ایک شور سا بپا ہو گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اب ہر شخص اس معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا جیسے یہ معاملہ صرف اُس کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خوب لہک لہک کر اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کی جا رہی تھی۔

پنڈت جی بلند آواز میں بولے۔ "اب بات یہ ہے، چندرا کی ماں......"

جب چندرا کی ماں درگا کے پاس سے اُٹھ کر اندر چلی گئی، تو درگا جلدی جلدی آنگن میں سے گزرتی ہوئی گھر کے باہر چلی گئی اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے گھر کی مغربی دیوار سے لگ کر گزرتے ہوئے اُس کونے پر جا پہنچی، جہاں سے مکئی کے کھیت شروع ہوتے تھے۔ اُس کے پہنچتے ہی کھیت میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک لمبا تڑنگا گوجر کھیت کے اندر سے نکلا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہائے ہائے۔" درگا اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر لجا کر ناک میں گنگنا کر بولی۔ "میں کیا کرتی، دیکھتے نہیں ہو گھر میں کتنے مہمان آئے ہوئے ہیں!"

وہ باغ میں اپنے کنج میں بیٹھا ہوا خیالات کے کنکوے اُڑا رہا تھا کہ سیداں نے آکر اُسے سلام کیا۔

"سلام بی بی سیداں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "کیا اب سونف کے باقی پودوں کو کاٹنے کا ارادہ ہے۔"

سیداں کے ہاتھ میں درانتی تھی، لیکن سیداں کے ہاتھ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا، کبھی درانتی، کبھی کدالی، کبھی مویشیوں کے لئے گھاس کا گٹھا، کبھی مکئی کے پودوں کا گٹھا، چری، ساگ، کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا کیونکہ وہ خود مزدور تھی۔ اس کی قمیص کہنیوں کے قریب سے پھٹی ہوئی تھی، ہاتھ متواتر کام کرنے سے بدنما اور بدصورت دکھائی دیتے تھے، بھورے، مٹیالے، مینڈک کے ہاتھ پاؤں کی طرح، لیکن کہنیوں کے قریب جہاں پر قمیص پھٹی ہوئی تھی، جلد کی رنگت دودھ کی طرح صاف اور بے داغ دکھائی دیتی تھی۔ بے چاری سیداں مزدور عورت کی جوانی کیا ہے سچ مچ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، دودن میں ساری آب، ساری چمک جاتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فطری حسن مشاطگی کا اس قدر محتاج نہیں ہوتا، اور مزدور عورت کی جوانی اور خوبصورتی دیر تک قائم رہنی چاہئیے کیونکہ وہ مزدور ہے، کام کرتی ہے، اوپر کے طبقے کی عورتوں کی طرح دن بھر ناول، ساری، غازہ، پوڈر کے فیشنوں میں غرق نہیں رہتی۔

لیکن، شیام نے سوچا، اگر ایسی عورت کو دن بھر مشقت کرنے کے بعد پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ ملے تو پھر؟ شیام نے آج تک ایسی عورت نہ دیکھی تھی جو کھانا کھائے بغیر اپنے حسن کی آب و تاب کو برقرار رکھ سکتی ہو۔ گو بعض لوگوں کے ذہن میں سچی خوبصورتی کی یہی معراج ہے۔ سنا ہے کہ

بائرن کسی حسین عورت کو کھانا کھاتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ بہت سی باتیں یونہی بائرن کے متعلق گھڑ لی گئی ہیں، محض فریب نفس کی خاطر، لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ نہایت دیانت داری اور مکمل بے وقوفی کے ساتھ اس کلئیے پر ایمان رکھتے ہیں۔ بہت سے شاعروں کا اگر بس چلے تو بچاری حسین عورت کو محض ہوا میں ہی جینے دیں۔ شاید اسی لئے بہت سے شاعروں نے اُس کی کمر غائب کر دی تھی، اُس نے آج تک کوئی ایسی عورت نہ دیکھی تھی جس کی کمر نہ ہو، اور پھر ایک اور اچنبھے کی بات تھی، حسین عورت کی آنکھوں، بالوں، رخساروں، ہونٹوں، باہوں، پاؤں، ٹخنوں، پنڈلیوں، رانوں، کولھوں، جسم کے ہر ایک عضو کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور ان اعضا کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ لیکن بے چارے پیٹ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ قیاس غالب ہے کہ حسین عورت کا پیٹ نہ ہوتا ہوگا۔ کم از کم ان شاعروں کی لغت میں تو یہ چیز کہیں موجود نہ تھی۔ یہ شاعر اپنے آپ کو خوبصورتی کا پرستار کہتے تھے، اور گو خود کھانا کھائے بغیر ایک لمحہ نہ زندہ رہ سکتے تھے۔ لیکن خوبصورت عورت کے بارے میں وہ اس قسم کی لغویات روا نہ رکھ سکتے تھے۔ اُن کے خیال میں حسن، پیٹ، بچے، بیماری، سماجی نظام اور اس قسم کی لغو باتوں کا پابند نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر وہ کبھی کبھار بھولے بھٹکے اپنی شاعری میں کسی مزدور عورت کی تصویر بھی کھینچتے، تو اُس کے سوگوار حسن کا تذکرہ ایسے دلکش پیرائے میں کرتے کہ وہ مزدور عورت دوسری عورتوں سے بھی زیادہ حسین نظر آتی، اور اگر وہ مزدور عورت پتھر کوٹتی ہوتی تو بھی اُس کے ہات حنائی ہوتے۔ حنائی ہات؟ سیداں کے ہات اُس کے سامنے تھے درحالیکہ سیداں کو ابھی پتھر کوٹنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ حنائی ہات اور شہابی رخسار؟ جب دن بھر کھیتوں میں کام کرنا پڑے، اس کے علاوہ صبح و شام کھانا بھی پکانا پڑے، رات کو خاوند کی غلامی، بچے، نیند پوری نصیب نہ ہو، صبح اُٹھ کر پھر نہاری بناؤ، اور کھانا پکاؤ، اور کھیتوں میں کام کرو، اور اگر اس جانگسل مشقت کے بعد بھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو تو ایسی حالت میں حنائی ہاتوں اور شہابی رخساروں کی جو گت بنتی ہے اُسے یہ شاعر لوگ کیسے جان سکتے ہیں۔ شیام کا چہرہ سرخ ہونے لگا پھر وہ اپنے خیالات کے رجحان پر خود ہی مسکرانے لگا۔ دراصل شیام نے سوچا، میں کچھ کم تعیش پسند اور حسن پرست نہیں ہوں، میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ ان مزدور عورتوں کا حسن جو یقیناً متوسط طبقے اور امیر طبقے کی عورتوں سے زیادہ دلکش، زیادہ ارفع، زیادہ صحت ور ہوتا ہے، سالہا سال تک اسی طرح برقرار رہے لیکن اس کے لئے شاید اس سماج کے سارے نظام کو بدلنا ہوگا۔ اگر

دنیا میں وہ خوبصورتی چاہتا تھا، تو یہ خوبصورتی بھی موجودہ جاہل نظام کو تبدیل کئے بغیر حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ حسین عورت کے خوبصورت ہونٹوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن ہونٹوں کے اندر پنہاں بھوک کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا......ارے وہ کہاں سے کہاں بہک گیا تھا۔

سیداں کہہ رہی تھی۔ ''میں ادھر ترکاری کی کیاریوں میں نلائی کرنے آئی تھی سوچا کہ آپ کو بھی سلام کرتی چلوں۔''

سلام؟ اس لفظ سلام سے اسے بڑی چڑ تھی۔ سچ مچ اُسے چڑ تھی؟ کیا وہ اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اُسے ''سلام'' سے چڑ تھی۔ جھوٹا فریبی، یہ چڑ عملی نہ تھی کتابی تھی۔ تخیلی، اگر اُسے سلام سے چڑ تھی، تو جب لوگ اسے سلام کرتے تھے تو وہ دل ہی دل میں خوش کیوں ہوتا تھا۔ یہ حکومت، یہ محکومی، یہ زنجیر کی دو کڑیاں، وہ کب ان سے آزاد تھا۔ سیداں اُس پر عاشق تو نہ تھی جو اُسے یوں سلام کرنے چلی آئی تھی۔ سیداں اُس کے ہاں کی بہو تھی۔ وہ تحصیل کے حاکم کا لڑکا تھا۔ بس لیکن اگر وہ یہ کہے کہ اسے اس زنجیر کی دونوں کڑیوں سے نفرت تھی، تو اسے اس کے لئے عملی ثبوت دینا ہوگا۔ عملی ثبوت کیا دوں۔ شیام کے دل میں کوئی غصے سے کہنے لگا۔ کیا سیداں کو اپنے کندھوں پر بٹھالوں۔ کیا اسے اپنی گود میں اٹھالوں۔ کیا اس کی گردن میں اپنے بازو ڈال دوں۔ اور رو کر کہوں کامریڈ سیداں، مجھے معاف کردو۔ سماج نے تم پر جو ظلم کئے ہیں، میں اُن کے لئے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ ایک طرح سے میں ہی ان گناہوں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اے کامریڈ سیداں، میرے منہ پر تھوک، میری پیشانی پر تھوک، میرے بالوں میں تھوک، انقلاب زندہ باد۔۔۔ یکا یک وہ زور سے ہنسنے لگا۔۔۔

سیداں حیرانی سے اُس کی طرف تکنے لگی۔ بولی۔ ''کیا بات ہے صاحب۔ کیا بات ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ یونہی ایک خیال دل میں آگیا تھا۔'' اس کی خوش طبعی پھر عود کر آئی۔ بولا۔ بیٹھو، بیٹھو، کوئی نئی بات سناؤ۔ دراصل بات یہ ہے سیداں۔'' وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔ یہ علی جو کا تکیہ کلام ''بات دراصل یہ ہے۔'' اُس کے ذہن پر چھانے لگا تھا۔ بے حد ذلت آمیز اور شرمناک بات ہے کہ وہ اور علی جو کے تکیہ کلام کی نقل کرے۔ وہ رک رک کر بولا۔

''سیداں چھٹیوں میں کوئی کام کاج تو ہوتا نہیں، بس خیالات کے گھوڑے دوڑاتا رہتا ہوں۔''

سیداں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اپنی اپنی قسمت ہے۔ اور ہمیں اتنا کام ہوتا ہے کہ

سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' شیام نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ ''اپنی اپنی قسمت ہے۔'' وہ پھر اُن خیالات کی رو میں نہ بہنا چاہتا تھا۔

جیسے سیداں کو یہ سن کر کسی پر گلہ نہ رہا۔ بشاش لہجے میں بولی۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ گاؤں میں بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔''

''نہیں تو۔ کیا بات ہے۔''

''وہی موہن سنگھ اور چندراوالا قصہ ہے۔''

شیام نے سر ہلایا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ہمہ تن گوش ہے۔

سیداں نے اپنی شلوار کے نیفے سے نسوار کی ڈبیا نکالی۔ ٹین کی چھوٹی سی ڈبیا، جس کے اوپر کے ڈھکنے پر چہرہ دیکھنے کے لئے گول آئینہ لگا ہوا تھا۔ سیداں نے اس آئینے میں دائیں بائیں مڑ کر اپنا چہرہ دیکھا، بالوں کو ٹھیک کیا۔ پھر ڈبیا کھول کر اس میں نسوار کی چٹکی بھری اور اپنے منہ میں دائیں بائیں اوپر نیچے مسوڑھوں پر اچھی طرح مل لی۔

''اُوں اُوں ہوں۔'' اس نے اپنا نچلا جڑا اوپر اٹھاتے ہوئے پان کی پیک کی طرح نسوار کا تھوک پھینکتے ہوئے کہا۔ ''بات یوں ہوئی کہ......'' وہ پھر تھوکنے لگی۔

شیام سوچنے لگا۔ کم از کم عورتوں کو نسوار نہیں چڑھانی چاہئیے۔ اور یہ کھانے کی نسوار تو اور بھی نفرت انگیز ہے، کم از کم عورتوں کو نسوار نہیں کھانی چاہئیے۔ یا ان کو نسوار کھاتے نہیں دیکھنا چاہئیے۔

شاید سیداں نے شیام کے چہرے پر مترشح جذبات کو بھانپ لیا۔ بولی: ''میں نسوار بہت کم استعمال کرتی ہوں۔ دراصل میری ڈاڑھ میں درد ہے۔ اور پھر جب کام زیادہ ہو، یا تھکن زیادہ ہو، تو یہ نسوار ایسے موقعوں پر بہت فائدہ کرتی ہے۔ بڑا سرور آتا ہے۔''

کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد سیداں بولی۔ ''گاؤں کے براہمنوں اور مہاجنوں نے مل کر مسلمان ڈاکٹر پر رجسٹری کردی ہے۔ بڑے حاکموں کو تفتیش کیلئے بلایا ہے۔ کہتے ہیں کہ چندرا کیوں موہن سنگھ کی تیمارداری کرتی ہے۔ جبکہ وہ ایک اچھوت، آوارہ، بدمعاش عورت ہے۔ گاؤں سے نکالی جاچکی ہے۔ اور جبکہ موہن سنگھ کے رشتے دار، اس کی ہر طرح ٹہل کرنے کو موجود ہیں۔ گاؤں

میں اس کا بڑی چرچا ہے۔ پنڈت روپ کشن نے چند دن ہوئے ایک برادری کا اکٹھ کیا تھا۔ سارے گاؤں کے لوگ وہاں پہونچے تھے۔ وہیں اس بات کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر کے خلاف ایک رجسٹری داغ دی جائے، یہ پنڈت سروپ کشن بڑا چالاک ہے۔ جو چاہے، جس طرح چاہے، برادری سے اپنی بات منوالیتا ہے۔"

شیام بولا "بڑے حاکم بیوقوف نہیں ہیں جو اس رجسٹری کے پہونچتے ہی دوڑے آئیں گے۔ ایسی درجنوں، سینکڑوں، رجسٹریاں اُن کے پاس آتی رہتی ہیں۔ خود میرے والد کے اوپر کئی بار رجسٹریاں ہو چکی ہیں۔ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ یقین رکھو، ڈاکٹر کا کوئی بال بیکا بھی نہ کر سکے گا۔ اور نہ کوئی چندرا کو موہن سنگھ کی ٹہل خدمت کرنے سے روک سکتا ہے۔ موہن سنگھ کی مرضی سے تو وہ وہاں رہتی ہے۔"

سیداں بولی۔ "لیکن میں نے ایک اور بات بھی سنی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ چندرا کی ماں کو پھسلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سنا ہے چندرا ابھی نابالغ ہے۔ عمر کی ہونے میں ایک سال کم ہے۔"

شیام نے زور سے کہا۔ "وہ نابالغ نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔"

"اور وہ لوگ چندرا کی ماں سے موہن سنگھ کے خلاف دعویٰ کروائیں گے۔ یہ اغوا کا دعویٰ ہوگا۔ ڈاکٹر بھی اس میں ضرور پھنسے گا اور معطل کیا جائیگا۔ موہن سنگھ کو بھی سزا ہوگی۔ اغوا کا دعویٰ بڑا سخت ہوتا ہے جی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

شیام ہکا بکا رہ گیا۔ یہ بات اُس کے دماغ میں نہ آئی تھی۔

سیداں نے ایک بڑی بوڑھی دانشمند عورت کی طرح سر ہلا کر کہا۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں صاحب۔ یہ پنڈت سروپ کشن بڑا چالاک ہے۔ ایسی سازش کھڑی کرتا ہے، کہ اس کے جال میں سے کوئی نہ نکل سکے۔ میں آج چندرا سے ملی تھی۔ ہسپتال میں موہن سنگھ کا پتہ کرنے گئی تھی۔ بچاری بڑی مغموم نظر آتی تھی۔"

"اسے۔۔۔؟" شیام نے پوچھا۔

"ہاں، اُسے سب پتہ لگ گیا ہے۔ بے چاری بڑی اداس تھی۔"

"کیا اُس نے موہن سنگھ کو اس سازش سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"جی نہیں۔ موہن سنگھ کے زخم ابھی کچے ہیں۔ گو اب وہ خطرے سے باہر ہے، لیکن ابھی وہ حرکت نہیں کر سکتا۔ کمزور بھی بہت ہے۔ ایسی حالت میں اگر اُسے یہ بات بتائی گئی۔ تو نہ معلوم اس پر کیا اثر ہو۔"

شیام نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کیسی عجیب چال ہے۔ واقعی۔۔۔"

سیداں بولی۔ "میرا خیال ہے ابھی تو وہ چندرا کو ڈرائیں گے، دھمکائیں گے، اور اُسے موہن سنگھ سے علیحدہ ہونے پر مجبور کریں گے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر چندرا کو یقین ہو گیا کہ موہن سنگھ کو اُس کے ساتھ رہنے سے سزا ہو جائے گی، اور موہن سنگھ پر اغوا کا مقدمہ بنے گا، اور وہ جیل خانے میں چلا جائیگا، تو وہ پھر موہن سنگھ کو چھوڑ دے گی اور کیا کرے گی بے چاری۔"

شیام نے سوچا کہ کل یا پرسوں وہ ضرور موہن سنگھ کا حال پوچھنے کے لئے شفاخانے جائیگا۔ چندرا بھی وہاں ہوگی۔ اس سے مفصل حال معلوم ہوگا۔ پھر بلند آواز سے سیداں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تم نے بہت بڑی خبر سنائی ہے۔ میں آج شام پتا جی سے اُس کے متعلق بات کروں گا۔"

سیداں اُٹھ کر چلنے لگی۔ پھر آنکھیں جھکا کر مسکین آواز میں بولی۔ "اگر آپ کے پاس ایک روپیہ ہو تو...... بڑی مہربانی ہوگی، مجھے اپنی چھوٹی لڑکی کیلئے ایک قمیص کا کپڑا......"

اُس کی بات ختم ہونے سے پہلے شیام نے اپنے بٹوے سے ایک روپیہ نکال کر اسے دے دیا۔

"سلام صاحب۔"

"سلام"

جب شیام نے گھر آ کر اپنی والدہ سے اس امر کا ذکر کیا، تو اس کی والدہ بولی۔ "بیٹا، دُنیا میں اس قسم کی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں، یہ اجڈ، جاہل لوگ ہیں۔ تہذیب انہیں چھو نہیں گئی، اُونچ نیچ کی انہیں تمیز نہیں۔ تم کو ان لوگوں کی باتوں میں زیادہ دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اور نہ ہی تمہیں ان نیچ لوگوں کے ساتھ اپنا اُٹھنا بیٹھنا رکھنا چاہیئے۔"

اور جب رات کو اُس نے اپنے پتا جی سے بات کی، تو اُنہوں نے بھی اس امر پر کوئی روشنی نہ ڈالی، پہلے تو بڑے غور سے اس کی بات سنتے رہے۔ پھر جب بات ختم ہو گئی تو اُن کے منہ سے ایک بار "ہونہہ" نکلا۔ اور پھر وہ بستر پر کروٹ بدل کر سو گئے۔

لیکن شیام بہت رات گئے جاگتا رہا۔ مدھم پھیکی سی چاندنی تھی۔ جس پر میلے میلے بادلوں کا

غلاف چڑھا ہوا تھا۔ نہ تاریکی تھی نہ سپیدی، باغ کے درختوں پر بھی یہی نیم تاریکی نیم سپیدی طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی کا یہ ملمع جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔ ہوا بالکل خاموش تھی اور درختوں کے پتے اور پھل اور شاخیں اور ڈال بالکل ساکن تھے۔ شیام کو جمود کا یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ اسے یہ سارا منظر مصنوعی اور نقلی معلوم ہونے لگا۔ اُس نے کھڑکی کی طرف سے اپنی نگاہیں ہٹالیں اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ادھ مندھی آنکھوں میں بار بار چندرا کا ذہین بے باک، خوبصورت چہرہ سامنے آجاتا۔ وہ چندرا سے ایک خاص انسیت محسوس کررہا تھا۔ پہلے ہی دن سے جب اُس نے چندرا کو دیکھا تھا اسے اس کے ایک غیر معمولی کردار ہونے کا یقین ہوگیا تھا۔ چندرا بالکل ان پڑھ تھی۔ لیکن وہ جو کچھ کہتی تھی، یا کرتی تھی، اُس سے اپنے موجودہ ماحول سے اس قدر زبردست نفرت کا احساس ہوتا تھا کہ جس کی توقع وہ کسی پڑھی لکھی لڑکی ہی سے کرسکتا تھا۔ نہیں یہ بات غلط تھی۔ پڑھی لکھی لڑکیوں میں بھی اس نے بیباکی، بغاوت اور سرکشی کے اس جذبے کو اس شدید صورت میں کہیں نہ پایا تھا، جو چندرا کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ چندرا کی زخمی لیکن بیباک، معصوم اور قابل اعتماد زندگی میں اس لڑکی کی تصویر دیکھ رہا تھا جو موجودہ نسل میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ شاید چندرا سے اس کی انسیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

چندرا سے اس کا ذہن سروپ کشن کی طرف مڑ گیا۔ اگر چندرا باغی تھی تو سروپ کشن روایت پرست، ایسا کٹر روایت پرست اُس نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھا تھا۔ وہ موجودہ تہذیب سے کہیں بھی، کسی حالت میں بھی، صلح کرنے کو تیار نہ تھا۔ یا شاید وہ سچ مچ اک وحشی، بے درد، سنگدل انسان تھا جسے اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنے اور ستانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کیوں ان دو نوجوان دلوں کی رفاقت کو تباہ برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اُسے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔ شاید زندگی جس دھار پر جارہی تھی، وہ اس کی رو میں اک چٹان بن کر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اور دُنیا کو بتا دینا چاہتا ہے کہ پرانی قدریں اب بھی صحیح ہیں۔ اُسی شدت کے ساتھ زندہ ہیں کہ جس طرح وہ آج سے ہزاروں سال پہلے تھیں۔ اجنتا کی تصویروں کی طرح۔ اور سروپ کشن اسے اجنتا کی تصویروں کی یاد دلاتا تھا۔ لیکن اجنتا کی تصویروں پر نئی زندگی کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ نئی زندگی کی بنیاد اُن نیم جنسی تشکیلات پر نہ رکھی جاسکتی تھی جو اجنتا کے غاروں میں مدھم ہورہی تھیں۔ پھر؟ کس لئے سروپ کشن یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑرہا تھا۔ کس طرح وہ سازش، مکر، فریب کے داؤ چلا کر تاریخ کے

اُس پہاڑ کو روکنے کی کوشش کررہا تھا، جو اک سیلاب عظیم کی صورت میں جمہور کے ضمیر پر چھا رہا تھا۔ اور پرانی قدروں، پرانی روایتوں اور پرانی ریتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لے جارہا تھا۔ یہاں اس ماندر کی وادی میں شاید یہ سیلاب ابھی نہ آیا تھا۔ لیکن کیا چندرا کی باغی طبیعت اس آنے والے طوفان کا پیش خیمہ نہ تھی؟ کیا موہن سنگھ کی سرکشی اُسی نئے دور کی غمازی نہ کررہی تھی؟ سروپ کشن تو مرچکا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے بہاؤ نے تیرا جنازہ اپنی لہروں پر اُچھال کر تجھے گندہ اور ناکارہ سمجھ کر ساحل پر پھینک دیا ہے۔ اپنی موت کو دیکھ، وہ زندگی جو اجنتا کی طرح خوبصورت تھی اب مرچکی ہے۔ یہ نئی زندگی شاید اتنی حسین نہ ہو۔ اس میں اتنی نزاکت، اتنی شیرینی، اتنی لطافت نہ ہو۔ لیکن اس نئی زندگی کی بے پناہ قوت، اس کے شباب، اُس کی تازگی، اُس کے آہنی حسن سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ یکایک شیام کو سروپ کشن پر رحم آنے لگا۔ وہ اسے اس طرح دیکھنے لگا، جیسے وہ کسی مٹی ہوئی تصویر، پرانے کتبے، شکستہ عمارت کو دیکھ رہا ہو۔ وہ ٹیکسلا کے کھنڈروں میں کھڑا تھا اور گائیڈ اسے اس پرانی ہندی یونیورسٹی کی مختلف جگہیں دکھلا رہا تھا۔ "یہ پوجا کا کنواں ہے۔ اس کی جگت دیکھئے۔ یہ پرانی بدروئیں ہیں، یہ ناٹک گھر، یہ مہاراجہ سرکوپ کا محل، یہ سرکوپ کی مورتی ہے۔" یکایک اسے احساس ہوا جیسے گائیڈ کہہ رہا ہے۔ "یہ سروپ کشن ہے۔ اس کے خدوخال دیکھئے۔ ایسے دلاویز نقش اب نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ یہ چندن کا ٹیکا، یہ کانوں میں چاندی کے بندے، کسی زمانے میں پروہت نہیں پہنتے تھے۔" اور شیام جیسے اب تعریفی نگاہوں سے اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا، اور پرانی تہذیب کو سراہ رہا تھا جس نے ایسے دیوتا پیدا کئے تھے۔ لیکن زندگی آثار قدیمہ نہ تھی۔ زندگی بہت آگے نکل چکی تھی۔ پرانی زندگی یکسر مٹ چکی تھی۔ اور سروپ کشن مردہ تھا۔ اس کا آرٹ مردہ ہوچکا تھا۔ اسکی تہذیب مردہ ہوچکی اور گاؤں کے پروہت کی سعیِ ناتمام ایسی تھی جیسے ایک مردہ دوسرے مردے کو زندہ کرنے کی کوشش کرے۔۔۔ مردہ۔۔۔ مردہ۔۔۔ چاردن کی چاندنی، شیام کروٹ بدل کر پھر باہر دیکھنے لگا۔ یہ چاندنی اسی طرح پھیکی اور اُداس تھی۔ مردہ چاندنی، درخت ساکن اور خاموش کھڑے تھے۔ شیام نے سوچا یہ باغ نہیں ہے، گورستان ہے۔ یہ درخت نہیں ہیں، زمین میں گڑے ہوئے مُردے باہر نکل آئے ہیں۔ جیسے یہ سیب کا درخت اپنے دانت نکالے اس کا منہ چڑا رہا ہے۔ شیام نے نفرت سے کہا۔ جاؤ، اپنا منحوس منہ بند کرو، اور زیر زمیں آرام کرو۔ اُس نے زور سے کھڑکی بند کردی۔ اور تکیہ میں منہ چھپا کر سوگیا۔

چندرا اپنے گھر سے واپس لوٹ رہی تھی۔ ماں بیٹی میں بہت جھگڑا ہوا تھا۔ سالہا سال کی صعوبتوں نے اُس کی ماں کے دل میں بغاوت کی آگ سرد کر دی تھی، برادری والوں نے اُسے اور اُس کے خاوند کو بہت دُکھ پہونچائے تھے۔ اور جب اُس کا خاوند مر گیا تھا تو بھی ان مصیبتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ اُن کی تعداد اور اُن کی شدت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ان مظالم نے چندرا کی ماں کا دل کچل ڈالا تھا۔ فاقہ کشی کی زندگی نے دل اور رُوح میں مقابلے کی سکت باقی نہ رہنے دی تھی۔ وہ اب اپنے بڑھاپے کے ایام نسبتاً آرام اور سکھ سے بسر کرنا چاہتی تھی۔ پنڈت سروپ کشن نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ موہن سنگھ اور چندرا کو الگ کرنے میں اس کی مدد کرے، تو وہ مالی اور معاشی طور پر اُسکی مدد کریگا۔ چندرا کو کسی اور گاؤں بیاہنے کے لئے بھی اُس کی پوری پوری مدد کریگا، چندرا کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے گھر جا کر بسے، تو اس کی روح کا بار ہلکا ہوتا تھا۔ اور سروپ کشن اس معاملے میں اُس کی پوری مدد کرنے کی تیار تھا۔ کچھ بھی ہو۔ سروپ کشن اپنی بات کا پکا تھا۔ اگر وہ کسی سے وعدہ کرلے، تو اُس وعدہ کو حتیٰ الامکان ہمیشہ پورا کرتا تھا۔ اس بات کا چندرا کی ماں کو پورا یقین تھا۔ کہ سروپ کشن چاہے دنیا اُلٹ جائے ہمیشہ اپنی سی کر گزرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی جو وعدے اُس نے چندرا کی ماں سے کئے تھے سب پورے کئے۔ ایک ایک کر کے۔ یہ بات سچ ہے کہ انہیں وعدے کہنا بڑی غلطی ہوگی۔ یہ وعدے نہیں، دھمکیاں تھیں، ظلم و ستم میں ڈوبے ہوئے غیر انسانی فعل تھے۔ لیکن پنڈت سروپ کشن نے انہیں ایک ایک کر کے پورا کیا تھا۔ لیکن اُن دنوں چندرا کی ماں کا دل بھی جوان تھا۔ وہ آگ میں تپ سکتا تھا۔ اپنی ہستی، اپنی آن، اپنی عزت برقرار رکھ سکتا تھا۔ ان دنوں اس کا خاوند بھی زندہ تھا۔ اور اگر اسے اپنے خاوند کی کمائی کی

روکھی سوکھی روٹی ہی ملتی تھی تو بھی وہ اُس پر قانع رہ کر گاؤں والوں اور گاؤں کے پروہت کے ہر ظلم وستم کا مقابلہ کرتی تھی۔ لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ جیسے اب اس بوڑھے درخت کی جڑوں میں زمین سے رس کھینچنے کی طاقت کم ہو گئی تھی۔ اور جب رس کم ہو جائے تو درخت بوڑھا، سُوکھا سُوکھا، پژمردہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی حالت چندرا کی ماں کی تھی۔ اب اس سے پہلے جتنی محنت اور مشقت نہ ہو سکتی تھی۔ زندگی کا رس کم ہوتا جارہا تھا۔ اور وہ آگ بھی بجھتی جارہی تھی۔ غالبًا بجھ چکی تھی۔ اب تو وہ یہ چاہتی ہے کہ چندرا بیاہی جائے، اپنے گھر جائے۔ اور پھر پنڈت سروپ کشن چندرا کی ماں کو دھان کا ایک کھیت خرید دے۔ پھر وہ ایک ہالی رکھ لے گی۔ اور آرام سے اپنی زندگی کے آخری دن بسر کریگی، آرام، سکھ، اس کی ساری عمران دو پریوں کو ڈھونڈتے گزری تھی، آرام اور سکھ تو اب بھی کہاں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بڑھاپے کے چارون فاقہ مستی میں بسر نہ ہونگے۔

لیکن چندرا کا نظریہ یہ نہ تھا۔ اُسے گاؤں والوں، برادری، مہاجنوں، براہمنوں، سرکاری عہدیداروں، پنڈت سروپ کشن، کسی پر اعتبار نہ تھا۔ سب ظالم تھے، چور، ڈاکو، اُچکے، بدطینت، انہوں نے زندگی بھر انہیں ستایا تھا۔ اور آج وہ کس طرح، ان کے ہمدرد ہو سکتے تھے۔ ماں بیوقوف تھی، جو آج اُن لوگوں پر اعتبار کر رہی تھی، جنہوں نے اس کی ساری مسرتوں کو اپنے وحشی پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ جیسے بیل مکی کے بھٹوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ گاؤں کے یہ وحشی بیل اُن کی کبھی ہمدرد نہ ہو سکتے تھے۔ اور سروپ کشن پر اعتبار کرنا گویا سانپ پر اعتبار کرنا تھا۔ اسے اپنی ماں کی خوش فہمی پر حیرانی ہو رہی تھی۔ وہ لوگ اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب ایک بار موہن اور اس کے درمیان مغائرت کی لکیر آگئی، تو وہ چندرا اور اُس کی ماں کو یکسر ٹھکرا دیں گے۔

"تم بچی ہو۔ تم اس معاملے کو نہیں سمجھتی ہو۔" اسکی ماں کہتی۔

"یہ میرا معاملہ ہے، اور میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔" چندرا جواب دیتی۔

"یہ اُن کے دھرم، اُن کی برادری، اُن کی عزت کا سوال ہے۔ وہ اس کے لئے ہر ممکن قیمت ادا کرنے کو تیار ہونگے۔"

"وہ تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہ دیں گے۔ اور تم اپنی تلخ زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی تلخ کر دو گی۔ موہن جیل میں جائے گا تو کیا میں زندہ رہوں گی۔ میں تم سے صاف کہتی ہوں، موہن میرا ہے۔ میرا ہے۔ میرا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وہ تیرا کیسے ہوا۔ تیرا اور اُس کا کیا بیاہ ہوا ہے۔"

"ہاں بیاہ ہوا ہے۔ اس زمین کے اوپر اس نیلے آسمان کے تلے ہمارا بیاہ ہوا ہے۔ باؤلی کے کنارے ہم نے اپنا پیمان محبت باندھا ہے۔ یہ ہمیشہ بندھا رہے گا۔ موت بھی اس رشتے کو نہیں توڑ سکتی۔ پرماتما گواہ ہیں۔"

اور چندرا کی ماں کو اپنی جوانی کے دن یاد آئے۔ کبھی اس کے منہ سے بھی ایسی باتیں نکلی تھیں۔ تلخ لہجے میں بولی۔ "اگر ماتما گواہ ہوتے تو برادری ہماری شادی کیوں نہ تسلیم کرتی۔ لیکن پرماتما کی گواہی آجکل کوئی نہیں مانتا۔ برادری کی رضامندی چاہیئے۔"

"برادری جائے چولہے میں، بھاڑ میں۔ برادری نے ہمیں کونسا سکھ پہونچایا ہے، جو میں اُن کی خوشامد کرتی پھروں۔ اور پھر اب میری کون سی برادری ہے۔ میں نے سوچا ہے، اور موہن سنگھ سے بھی صلاح کرلی ہے۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا، پھر ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کسی اور علاقے میں جا بسیں گے، جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ یا ہم پار (پنجاب) چلے جائیں گے۔ ماں دُنیا بڑی وسیع ہے۔ اور اب تو سنا ہے میرپور تک لاری بھی آگئی ہے۔ لاری میں بیٹھے اور جھٹ جہاں جی چاہا چلے گئے۔"

چند لمحوں کے لئے چندرا کی خود اعتمادی نے اس کی ماں کو متاثر کر لیا۔ لیکن پھر وہ سر ہلانے لگی۔ "بیٹی یہ اچھی بات نہ ہوگی۔ اچھی بات نہ ہوگی۔ اس دیوار سے ٹکرا کر میں نے اپنی قسمت ہمیشہ کے لئے پھوڑ لی ہے۔ اب کیا تو پھر اسی ظالم دیوار سے سر ٹکرانا چاہتی ہے۔ میری منو بیٹی چندرا۔"

چندرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جا، ماں۔ یہ لوریاں کسی اور کو دے۔ لے اب میں ایک بار پھر تجھے خبردار کئے دیتی ہوں۔ پنڈت کے خطرناک چنگل میں نہ پھنسنا۔ ورنہ ایسی پچھتائے گی ایسی پچھتائے گی......"

چندرا اپنا فقرہ ناتمام چھوڑ کر چلی آئی۔ غصے اور نفرت سے اس کا چہرہ آگ بھبوکا ہو رہا تھا۔ اُسے اپنی ماں کی بیوقوفی پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ یہ کیوں اس سیدھی سی بات کو نہیں سمجھتی۔ اور جان بُوجھ کر برادری والوں کے ظالم پنجے میں پھنسی جارہی ہے۔ لیکن آج میں نے اسے اچھا خاصا دھمکایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت سروپ کشن کے متعلق اور برادری والوں کے متعلق بہت سے شبہات اُسکے دل میں گڑ گئے ہوں گے۔ ایک دو دفعہ اور سمجھاؤں گی، تو ضرور سیدھے راستے پر آجائے گی، اُف، کس قدر گرمی ہے۔

چندرا ندی پار کر آئی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اس نے سنتقال کی ڈاب کے کنارے ایک انجیر

کے درخت کے تنے میں موہن کے زخموں کے پٹیاں رکھی ہیں، دھونے کے لئے۔ اُس نے سوچا۔ آج بہت گرمی ہے، سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا ہے۔ شاید اس غصے کی وجہ سے، پٹیاں دھو لینے کے بعد آج خوب نہاؤں گی۔

سنتقال کی ڈاب پر اسے نوراں مل گئی۔ نوراں اور چندرا میں گہرا بہناپا تھا۔ اور جب سے نوراں نے چندرا اور موہن سنگھ کے بات سُنی تھی، وہ چندرا سے اور بھی زیادہ پیار کرنے لگی تھی۔ سنتقال کی ڈاب کے اس پار اس کا ریوڑ چر رہا تھا۔ اور وہ اب یہاں ڈاب میں نہانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"آج دن کتنا اچھا ہے۔" نوراں نے باہیں پھیلا کر جیسے ساری کائنات کو اپنے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ پیاری کھلی ہوئی دھوپ ہے۔ اور وہ بادلوں کے سفید ٹکڑے دیکھو۔ سنتقال کی ڈاب میں تیرتے ہوئے کیسے پیارے لگتے ہیں۔ بالکل جیسے بطخوں کے سفید سفید بچے ہوں۔ چندرا، آج تو میں ایک سانس میں سنتقال کو پار کر جاؤنگی۔ آجا، آج مقابلہ رہے۔ اُس دن تو جیت گئی تھی۔ لیکن--- آج--- نوراں خوشی سے ہنسی اور اُس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ندی کی ریت پر لٹو کی طرح گھوم گئی۔

چندرا پٹیاں دھو رہی تھی۔ بولی۔ "میں ذرا ان سے فارغ ہولوں۔ پھر دونوں اکٹھی نہائیں گی۔ ذرا چند گھڑیوں کے لئے صبر کر لے۔"

نوراں کچھ عرصہ کے لئے خاموش بیٹھی رہی اور ریت کھود کھود کر اپنے پاؤں کے اوپر جماتی رہی۔ اچھی طرح تھپتھپانے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ ریت کی تہہ کافی مضبوط ہو گئی ہے۔ تو اس نے آہستہ سے دونوں پاؤں باہر نکال لئے۔ ریت کی دو محرابیں بن گئی تھیں۔ جن کے بیچ میں ریت کی ایک پتلی سی دیوار کھڑی تھی۔

"آہاہا۔" نوراں تالی بجا کر بولی۔ "آہاہا، دونوں محرابیں بن گئیں۔ چندرا، ادھر دیکھ۔"

چندرا مسکراتی ہوئی اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ دراصل دونوں محرابوں کا ایک ہی وقت میں بن جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر ریت کی محراب۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ ندی کے کنارے یہ محرابیں بنایا کرتی تھیں۔ کبھی دائیں پاؤں کی محراب بنتی تھی، کبھی بائیں پاؤں کی۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا کہ دونوں محرابیں بن جائیں۔ جس کی دونوں محرابیں بن جاتیں، وہ شرط جیت جاتی۔ اور شرط بدی جاتی تھی اخروٹوں پر، انجیروں پر، مکی کے بھٹوں پر، اور کبھی کبھار جب بہت ہی پیار آرہا ہو تو گال اور

ہونٹ چومنے پر، لیکن آخری شرط بہت کم بدی جاتی تھی، ہاں دلچسپ ضرور تھی۔ کیونکہ جب ایک لڑکی یہ شرط جیت لیتی، تو ہاری ہوئی لڑکی ندی کے کنارے کنارے دور تک خوشی اور ہراس سے چیخیں مارتی ہوئی بھاگتی جاتی۔ حتیٰ کہ دوسری لڑکی دوڑ کر اُسے پکڑ لیتی اور اس کے گرد باہیں ڈال لیتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ دونوں لڑکیاں بھاگتی بھاگتی ڈاب میں گر جاتیں اور پھر وہیں تیرتے تیرتے اس شرط کا فیصلہ کیا جاتا۔ شاید لاشعوری طور پر لڑکیاں اس وقت عاشق اور محبوب کا کھیل کھیل رہی ہوتیں۔ یہ وہی پرانا کھیل تھا۔ دولھا دُلہن بننا، گڈے گڈی کا بیاہ، آنکھ مچولی۔

چندرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تو نوراں بڑی خوش قسمت ہے۔ آج تو نے دونوں محرابیں بنا ڈالیں۔ ایک اپنی ایک اپنے میاں کی۔ بس اب تو چین ہی چین ہے۔“

نوراں نے بناوٹی غصے سے لات مار کر دونوں محرابیں گرا ڈالیں اور بھاگتی ہوئی چندرا کی طرف آئی۔ چندرا نے اپنے جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر الگ کر دی اور جلدی سے پانی میں کود گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نوراں بھی کپڑے اتار کر ڈاب میں گھس گئی۔ اور دونوں تیرتی ہوئیں، ہاتوں سے پانی کو چیرتی ہوئیں، لاتوں سے پانی کے سپید فوارے بلند کرتی ہوئیں ایک دوسرے کا پیچھا کرنے لگیں۔

اور اگر کوئی اُس وقت ڈاب کی اُونچی چٹانوں پر کھڑا ہو کر اس منظر کو دیکھتا۔ تو اُسے اپنے چاروں طرف اک سوئی ہوئی وادی نظر آتی، کھلی ہوئی سنہری دھوپ نظر آتی، دور مکانوں کی چھتوں سے دُھواں آہستہ آہستہ نکلتا ہوا فضا میں گم ہوتا نظر آتا۔ پھر اُسے اس خمار آلود منظر میں سنتھال کی ڈاب اک نیلم کے نگینے کی طرح جڑی ہوئی نظر آتی۔ جسکی سطح پر سپید بادلوں کے کنول کھلے ہوتے، اور کنارے کے درختوں کی شاخوں کے سائے حیران و لرزاں نظر آتے۔ وہ دیکھتا کہ اس نیلے پانی کی کانپتی ہوئی سطح پر دو جل پریاں بال کھولے، دودھ ایسی باہیں ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کئے آہستہ آہستہ تیر رہی ہیں۔ اور وہ سوچتا کہ اسے فوراً چٹانوں کے نیچے دبک جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کہاوت مشہور ہے کہ اگر جل پریوں کی نظر کسی انسان پر پڑ جائے تو وہ اسی وقت ڈبکی مار کر زیرِ آب سمندر کی تہ میں یا نیلی جھیل کی تہ میں یا ڈاب کی تہ میں چلی جاتی ہیں۔ جہاں اُن کے لئے لعل اور جواہر کے محل بنے ہیں، جنکی کھڑکیوں میں تیلی اور باریک، ریشم سے بھی زیادہ باریک اور ملائم کائی کے سبز پردے سرسراتے ہیں، جہاں محلوں کے باہر رنگا رنگ گھونگھوں کے باغ ہیں۔ جن میں سرو کی طرح اسفنج کے بوٹے کھڑے ہیں۔ جنکی روشوں پر نیلے نیلے سنگریزے بچھے ہیں۔ اور اُن پر خوبصورت

مچھلیاں آہستہ خرام ہیں،...... آہستہ خرام، جیسے یہ دو جل پریاں جو اب سنتھال کی سطح پر بال کھولے، دودھ ایسی باہیں ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کئے، آہستہ آہستہ تیر رہی ہیں۔

لیکن وہاں اُس وقت کوئی بھی آس پاس، دُور تک موجود نہ تھا، جوان جل پریوں کو دیکھ سکتا اور یہ جل پریاں دیر تک انسان کی نظروں سے محفوظ پانی کی کانپتی ہوئی نیلی سطح پر تیرتی رہیں۔

پٹیوں کو اپنی چادر میں ڈالے، دونوں بازو ہلاتی، گنگناتی ہوئی، چندرا دھان کے کھیتوں سے گزر کر گھاٹی چڑھنے لگی، اسے اپنا جسم بہت ہلکا معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ فضا میں اُڑی جا رہی ہے۔ جیسے وہ ماندر کی خنک نرم روندی پر بہتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا، اب وہ بادلوں کے ٹکڑے بھی غائب ہو گئے تھے، نیچے راہگذار پر اُس کے قدموں کے آگے سے گھاس کے ٹڈے اُڑ اُڑ کر اُس کی چادر پر آ بیٹھتے، اور پھر اُچھل کر گھاس کے خوشوں پر بیٹھ جاتے۔ وہ دورویہ بڑھی ہوئی گھاس پر ہات پھیرتی گئی۔ لمبی ملائم گھاس اب پیلی ہو گئی تھی۔ اور خوشوں کے سروں سے بھوری بھوری تریاں لٹک گئی تھیں۔ اور ان میں سے اک عجیب گرم سی خوشبو آتی تھی۔ عجیب، گرم سی خوشبو جو ساری گھاٹی کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے سوچا چند دنوں میں یہ گھاس کاٹنے کے قابل ہو جائے گی۔ پھر یہاں لتیری لگے گی۔ ڈھول بجیں گے، اور گاؤں کے مرد اور عورتیں ہاتوں میں درانتیاں لئے اس گھاس کو کاٹنا شروع کریں گے۔ اُسے لتیری کے دن بہت پسند تھے۔ اُس نے سوچا یہ گھاٹی کچہری کی زمین سے ملحق ہے۔ جب تحصیلدار صاحب گھاس کو کٹوانے کے لئے لتیری لگوائیں گے تو وہ بھی ضرور آئے گی، اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اُسے سب عہدے داروں سے نفرت تھی۔ اُسے تحصیلدار سے بھی سخت نفرت تھی۔ رشوت خور، ایماندار نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کبھی موقع ہات لگے، ڈنک مارنے سے نہیں چوکتے۔ کسانوں کی زبوں حالی کے لئے کیا یہ لوگ کم ذمہ دار تھے۔ اس کی اپنی غربت اور ناداری اور بے عزتی کے لئے کیا وہ ان لوگوں کو بالکل بری الذمہ سمجھ سکتی تھی۔ ہرگز نہیں۔ لیکن شیام ان سے مختلف ہے، اُس نے سوچا، شیام میں ابھی وہ اکڑ، وہ چالاکی، وہ شیطنت نہیں، جو ان دوسرے افسروں کی نگاہوں سے جھلکتی ہے۔ اس کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی

ایسا ہے جیسے وہ کسی اپنے جیسے انسان سے بات کر رہا ہو۔ شیام سے بات کرتے ہوئے اس نے اپنے دل میں کبھی وہ بے چینی، بیتابی، بیقراری، غصہ اور نفرت اور انتقام کا ملا جلا احساس نہیں پایا تھا، جو دوسرے افسروں یا گاؤں کے بڑے لوگوں سے بات کرتے ہوئے اُس کے دل میں آ جاتا تھا۔ اور اُس کا چہرہ غیر ارادی طور پر سرُخ ہو جاتا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اپنے بالمقابل گفتگو کرنے والے کا منہ نوچ ڈالے۔ اور چلا چلا کر کہے۔۔ شیطان! شیطان!! شیطان!!!

یکایک وہ چلتے چلتے ٹھٹک گئی، سامنے سے پنڈت سروپ کشن کا چھوٹا بھائی بسنت کشن سیٹی بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ لا اُبالی، آوارہ، اوباش براہمن تھا۔ دن بھر سیٹی بجاتے رہنا، اور گہیلوں اور راستوں، اور نالوں اور کسیوں پر لڑکیوں کو تاکتے رہنا، یہی اس کا کام ہے۔ پنڈتوں کے اوصاف سے بالکل معرا ہے بیچارہ، گاؤں میں بھولے بھٹکے سے خانہ بدوشوں کا کوئی قبیلہ آ نکلے، بس بسنت کشن کے پو بارہ ہیں۔ دن بھر اُن کی کھپریل کے نیچے بیٹھا ہوا چرس پیتا رہے گا۔

بسنت کشن اپنے بھائی کی طرح لمبا تڑنگا تھا۔ بڑے بڑے ہات پاؤں، اپنے بھائی کی طرح ہر وقت ہنستا رہتا۔ لیکن بس یہاں پر مشابہت ختم ہو جاتی تھی۔ نہ وہ اپنے بڑے بھائی جیسا دماغ رکھتا تھا، نہ اُس جیسی خوبصورتی اُس کے جسم میں تھی۔ پڑھا لکھا بھی واجبی تھا۔ اپنی کھیتی باڑی کا کام بھی توجہ سے نہ کرتا تھا۔ لڑکیوں کو گھورنے اور اُن کے پیچھے بھاگنے کے کام کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس وقت اُس نے لٹھے کی ایک نئی شلوار پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بوٹ تھا۔ لال دھاریوں والی ریشمی قمیص، سر پر صافہ، جس کا ایک شملہ اُس نے گردن کے گرد لپیٹ کر بائیں کندھے پر جھولتا ہوا چھوڑ دیا۔ دوسرا شملہ پگڑی کے اُوپر سے نکل کر دوسرے بازو کی طرف جھول رہا تھا۔ صافے کی نوک سیدھی نہ تھی، بلکہ ٹیڑھی۔ ماتھے کے دائیں طرف آخری کونے میں۔ دائیں آنکھ کے ابرو کے پاس۔ اسی ابرو اور نوک کے درمیان اُس نے سبز رنگ کا ”اوم“ کھدوا رکھا تھا۔

چندرا ایک طرف کو ہٹ گئی۔ بسنت کشن اُس کے قریب آ کر رُک گیا۔ ہنسنے لگا:۔

”ہو ہو ہو...... چندرا رانی کدھر سے آئی ہو؟“

چندرا اس خبیث سے بات بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب بات کا جواب دئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ بولی ”موہن کی پٹیاں دھونے گئی تھی۔“

”ہو ہو ہو۔“ بسنت کشن ہنستے ہوئے بولا۔ پھر اس نے اپنے صافے کی نوک انگوٹھے سے

سنواری اور دو ایک زلفوں کو باہر نکال لیا۔ بولا "اب کے دن اور موہن کی پٹیاں دھوؤ گی۔"

چندرا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "پرمیشور کی کرپا سے اب موہن جلدی اچھا ہو جائے گا۔"

"ہاہاہا۔" بسنت کشن اک زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "پھر چندرا رانی کو کون پوچھے گا؟ موہن تو اپنے گھر چلا جائے گا۔ ہاہاہا۔"

چندرا نے آگے قدم بڑھایا۔ بسنت کشن بولا۔ "ایک بات سنتی جاؤ۔ میری رانی۔"

چندرا نے غصے سے لال پیلے ہو کر کہا۔ "میں تمہاری رانی نہیں ہوں۔ حرامزادے، سور کے بچے، تیری ماں......"

"واہ واہ۔" بسنت کشن نے چندرا کے اُوپر جھولتے ہوئے کہا۔ اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر بولا۔ "یہ گالیاں نہیں ہیں۔ گئو ماتا کی قسم، یہ تو چمیلی کے پھول ہیں چمیلی کے پھول رانی۔" پھر یکایک اپنے چہرے کو بدل کر، اِدھر اُدھر دیکھ کر، مدھم آواز میں کہنے لگا۔ "ایک بات تم سے کہتا ہوں، مذاق نہیں کر رہا۔ گاؤں کے براہمنوں نے متا پکایا ہے۔ تمہارے خلاف۔ وہ تمہیں اور موہن سنگھ کو الگ کر دینے پر تلے ہوئے ہیں، میں بھی وہیں موجود تھا۔ میں سب کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میرے پاس ایک ایسی کنجی ہاتھ آ گئی ہے، کہ اُن کا سب کیا کرایا دھرا رہ جائے گا۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ مجھے یہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس لئے کہ میرے لئے تو براہمن بھنگی، چمار سب برابر ہیں۔ ہاہاہا۔"

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

چندرا نے پوچھا۔ "تم میری مدد کرو گے۔ بتاؤ نا، وہ کیا بات ہے۔"

بسنت کشن کی حریص نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا:۔ "میری رانی میں تمہاری مدد نہ کرونگا تو اور کس کی مدد کروں گا۔ ہائے کیا گوری ملائم کلائی ہے۔ آہ۔۔۔"

ایک زور کا طمانچہ اُس کے منہ پر آن پڑا۔ "یہ لو۔ یہ لو۔ یہ لو۔" دو چار اور گھونسے مکے، طمانچے اور اُس کی پگڑی نیچے آن پڑی۔

پیشتر اس کے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالتا، چندرا وہاں سے جا چکی تھی اور تیز تیز قدموں سے گھاٹی کو پار کر رہی تھی۔

بسنت کشن کچھ دیر غصے سے اُسکی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی جبلی آوارگی عود کر آئی۔ پھر وہ

ہنسنے لگا۔ "ہاہاہا۔ میری چندرا رانی یہ تو پھول تھے، پھول۔" پھر وہ اُسکی طرف دیکھ کر زور زور سے گانے لگا۔

دو پیسے تیر کیتے۔

مرجان گوریاں رناں جنہاں منڈے وی فقیر کیتے۔

(خدا کرے یہ حسین عورتیں مر جائیں جنھوں نے کئی جوانوں کو فقیر بنا دیا ہے)

اُس کی کرخت، بے ہنگم آواز گھاٹی کے گوشے گوشے میں گونج پیدا کرتی گئی۔ حتیٰ کہ چندرا نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر وہ بھی اپنی گردن جھٹکا کر اپنے راستے پر نیچے ندی کی طرف چلا گیا۔

بسنت کشن کی حرکت نے اور اُس کی بُری باتوں نے جیسے چندرا کی رگ رگ میں مرچیں سی لگا دی تھیں۔ جیسے اُس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اور خون کا ہر قطرہ آتش سیال ہو کر اُبل رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ جب وہ گھاٹی کو پار کر چکی تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ جب وہ کچہری کے جنگلے کے قریب سے گزری تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ جب وہ شفاخانے کے دروازے کے اندر داخل ہوئی تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ جب وہ اپنے وارڈ میں داخل ہوئی، جہاں موہن سنگھ چارپائی پر لیٹا ہوا اُسکا انتظار کر رہا تھا، تب بھی وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ لیکن جب اس نے موہن سنگھ کو دیکھا، تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ اُس کی چارپائی سے لگ کر سسکنے لگی۔ وہ اس طرح اس سے پہلے کبھی روئی نہ تھی۔ جیسے اُس کے سینے میں، اُس کے دل میں اُس کی روح کی گہرائیوں میں سالہا سال تک یہ آنسو منجمد ہوتے رہے تھے۔ اک برف کی سل بن کر اُس کی شخصیت کی تہوں میں سما گئے تھے، کہ وہ رو نہ سکتی تھی۔ وہ ہنس سکتی تھی، منہ چڑا سکتی تھی، خنجر کی دھار کی طرح تیز گھاؤ پیدا کر دینے والی باتیں کر سکتی تھی، لیکن رو نہ سکتی تھی۔ لیکن آج جیسے وہ برسوں کی برف، وہ صدیوں کے منجمد آنسو کسی برق تپاں کے لمس سے اُس کے سینے میں، اُس کے دل میں، اُسکی روح کی پنہائیوں میں پگھلے جا رہے تھے۔ اور وہ اپنے محبوب کی چارپائی سے لگی سسک رہی تھی۔ اور اُس کے آنسوؤں کی نمی اور اُن کا نمک اُس کی چادر کو گیلا کر کے اُن پٹیوں میں جذب ہو رہا تھا، جنہیں وہ ابھی ندی سے دھو کر لائی تھی۔ جیسے اس نے اپنے چہرے کی طنزیہ مسکراہٹ بیکار سمجھ کر ہمیشہ کے لئے اُتار پھینکی تھی۔ اور اپنی غریب، بے کس، زخمی زندگی کو اپنے زخمی محبوب کے سامنے ننگا کر دیا تھا۔

موہن سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ لیکن چندرا چارپائی سے لگی روتی رہی۔ اور اس نے اُسے کچھ نہ بتایا۔ موہن سنگھ نے اپنا ہاتھ چندرا کے سر پر رکھا اور دیر تک اپنی اُنگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتا رہا۔ آخر چندرا کے آنسو تھم گئے۔ اور اُس نے آہستہ سے رُک رُک کر سسکیوں کے درمیان ساری حکایت کہہ سنائی۔

موہن سنگھ کی آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ ہو گئیں۔ جیسے وہ آنکھیں ابھی لہو رو دیں گی۔ اُس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ لئے۔

”چند دنوں کی بات ہے چندرا، بس، چند دنوں کی بات ہے۔“ اس نے آہستہ سے رک رک کر کہا۔

”وعدہ کرو موہن تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے۔“ چندرا نے اپنے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

موہن سنگھ نے اپنا دایاں ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”جب تک زندہ ہوں تمہارے ساتھ ہوں۔“ پھر رُک رُک کر کہنے لگا۔ ”فکر نہ کرو۔ بس چند دنوں کے بعد۔۔۔ چند دنوں کے بعد۔۔۔“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور چندرا معلوم نہ کر سکی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں دبانے لگی۔

اگست کے وسط میں اک سہانی صبح کو تحصیلدار صاحب نے کچہری کی زمین میں لتیری لگوائی۔ وسیع باغ اور کھیتوں کی مینڈھوں پر اور ساری گھاٹی پر پیلی پیلی سنہری گھاس سرسرا رہی تھی۔ آج روی اور نمی بہت سویرے اُٹھ کر باغ میں لتیری والوں کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ رسیاں اور رسے بٹے جا رہے تھے، درانتیاں تیز کی جا رہی تھیں۔ شیام کی والدہ بھی آج بہت مشغول تھیں، پچاس ساٹھ آدمیوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرنا تھا، پینے کیلئے گڑ کا شربت اور لسی بھی چاہیئے۔ نوکر اور پیادے بھاگم بھاگ نہایت مستعدی سے مختلف کام سرانجام دے رہے تھے۔ روی اور نمی جگہ جگہ خوشی سے بھاگتے ہوئے شور مچاتے ہوئے گھومتے پھرتے تھے۔

پھر ڈھول والے آ گئے۔ سیاہ لاچے اور دائیں ہاتھ میں چمڑے لی سیاہ پٹی پہنے ہوئے، اُنہوں نے آکر تحصیلدار صاحب کو سلام کیا اور ناخ کے درخت کے نیچے اپنے ڈھول رکھ کر بیٹھ گئے۔

تحصیلدار صاحب نے اندر جا کر کہا۔ ”لو ڈھول والے بھی آ گئے ہیں، شیام کی ماں۔ اب کیا شہنائیاں بھی منگواؤں۔“

شیام کی والدہ مُسکرا کر بولی۔ ”شہنائیاں بھی آ جائیں گی، جب میرے بیٹے کا شگن ہو گا، ہر ایک گھر میں سوا سیر مصری بھیجوں گی۔“

”ہم تو زیادہ لیں گے۔“ چھایا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں تو لڑکے کی موسی ہوں نا، کیوں تحصیلدار صاحب ٹھیک ہے نا۔“

شیام کی والدہ بولی۔ ”تمہاری بات اور ہے چھایا۔“

شیام کی والدہ نے آج چھایا اور ونتی کو بھی بلایا تھا۔

تحصیلدار صاحب نے لتیری کے لئے پچاس آدمی بلائے تھے، لیکن اگر گاؤں میں ایک جگہ لتیری لگی ہو، اور سوندھی سوندھی خوشبو والی گھاس کاٹی جا رہی ہو، لسی اور گڑ کا شربت تقسیم ہو رہا ہو، ڈھول بج رہا ہو تو کس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ بھی اپنی درانتی تیز کر کے لتیری میں شامل نہ ہو جائے۔ اس لئے تحصیلدار نے صرف پچاس آدمیوں کو بلا بھیجا تھا۔ لیکن ہوتے ہوتے تقریباً اس تعداد سے دُگنے آدمی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں براہمن بھی تھے اور مسلمان بھی اور سکھ بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، عورتوں میں سیداں اور چندرا بھی تھیں۔

شربت اور لسی وغیرہ پی کر سب لوگ تیار ہو گئے، ان لوگوں نے گھاس کاٹنے کیلئے سب سے پہلے گھاٹی کو چنا۔ جو اک ڈھلان کی صورت میں نیچے دھان کے کھیتوں سے جا ملتی تھی۔ یہاں سارے لتیری والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے کا سردار مشر گنگو بنا۔ دوسرے کا ڈُلا۔ دونوں کے ساتھ چالیس پچاس کے قریب آدمی تھے۔ ایک حصے کو باغ کے اُس سرے پر بٹھایا گیا، جہاں سے گھاٹی شروع ہوتی تھی۔ یہ حصہ مشر گنگو کے سپُرد کیا گیا۔ ڈُلے سردار نے اپنے آدمیوں کو لے کر ڈھلان کے وسط میں پھیلا دیا۔ اب اس طرح سے گویا گھاس کاٹنے والوں کی دو جماعتیں بن گئیں، مشر گنگو کی جماعت کا کام یہ تھا کہ وہ گھاس کاٹتے ہوئے گھاٹی کے وسط میں پہونچ جائیں۔ اور ڈُلا اور اس کے ساتھی گھاٹی کے وسط سے جو گھاس کاٹتے ہوئے چلیں تو نیچے دھان کے کھیتوں میں جا پہنچیں۔

ڈھول بجنے لگا اور لوگ خدا کا نام لے کر گھاس کاٹنے لگے۔

ڈھولوں کی آواز ساری وادی میں گونج رہی تھی۔ ڈھول والے نہایت پر جوش انداز میں ڈھول بجاتے تھے۔ کبھی ڈھول بجاتے بجاتے اپنی آواز اور لے دانستہ مدھم کر دیتے۔ اور پھر ایک دم اس لے کو عروج پر لے جاتے۔ دڑدگڑدگڑ، دڑدگڑ، دگڑ، وڑدگڑدگڑ، دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم پر آواز بہت اونچی ہو جاتی۔ یہ گویا اُسکی اٹھان تھی۔ اور دڑدگڑدگڑ کی آواز اس لے کی بنیاد۔ کبھی یہ ڈھولئے اتنی دیر تک آہستہ آہستہ دڑدگڑدگڑدگڑ کرتے رہتے کہ جب وہ پھر ایک ساتھ "دھما دھم" کی دھما چوکڑی مچاتے، تو دل یکلخت زیادہ زور سے حرکت کرنے لگتا، رگوں میں خون کی روانی تیز ہو جاتی۔ اور لتیریئے ہوا میں درانتیاں چمکاتے ہوئے "حق اللہ ہو۔" "یا ہر ہر" کے نعرے لگاتے ہوئے اور زیادہ جوش اور انہماک سے اپنے کام میں مصروف

ہو جاتے۔

اور شیام کو لتیری کا یہ منظر بہت پسند آیا ان لتیری والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، سکھ بھی اور اچھوت بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ لیکن اس وقت سب کسان تھے، سب کے ہات میں درانتیاں تھیں۔ سب گھاس کاٹ رہے تھے۔ بازو شانوں تک ننگے، کمر کے نیچے جانگیے یا کھدر کی شلوار نما نیکریں پہنے، جو گھٹنوں سے اوپر ہی رہتی تھیں، وجہ اتحاد یہ درانتی تھی۔ یہ گھاس، یہ زمین، آدمی دراصل جتنا زمین کے قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ دوسرے انسانوں کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس وقت مشر گنگو اور کریم مالی، اور موجو بھنگی ایک ہی قطار میں بیٹھے ہوئے ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ مسرت بھرے لہجے میں، ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔ کہیں مغائرت کا شائبہ تک بھی نظر نہ آتا تھا۔ شیام کی والدہ اور چھایا اور ونتی اور غلام حسین اور سنت رام لتیریئیوں کو شربت اور لسی پلاتے جاتے تھے۔ کیونکہ اب دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اور کام کرنے والوں کی پیاس بار بار چمک اٹھتی تھی۔

روی اور نمی شور مچاتے ہوئے گھاس کاٹنے والوں کے عین بیچ جا کھڑے ہوتے تھے، اور پھر اُنہیں دم دلا سا دیکر دوسری طرف بھگانا پڑتا تھا۔ بہت سی عورتیں جو گھاس نہیں کاٹ رہی تھیں، گھاس کے دتھوں کو پولوں میں جمع کرتی جاتی تھیں۔ یہ کام بھی بڑی چابکدستی اور ہوشیاری کا ہوتا ہے۔ لتیریئے جلدی جلدی گھاس کاٹتے ہوئے اُنکے چھوٹے چھوٹے دتھے اپنے پیچھے رکھتے جاتے ہیں، گھاس اکٹھا کرنے والی ٹولی، جس میں عموماً عورتیں زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔ ان دتھوں کو بڑی بڑی پولوں میں جمع کرتی جاتی ہیں۔ دتھے قطار در قطار اُس پوری لمبائی پر پھیلے ہوتے ہیں جہاں لتیریئے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک پول دس دتھوں کو ملا کر بنائی جاتی ہے۔ پول بنانے کا بھی ایک خاص سلیقہ ہے۔ اس میں گھاس کے وہ سرے جہاں پر سے گھاس کاٹی جاتی ہے باہر رکھے جاتے ہیں۔ اور گھاس کی لتریوں والے سرے اندر کی طرف۔ اور یہ دتھے اک دائرے کی شکل میں قریب قریب رکھ کر پول تیار کر دی جاتی ہے۔ شیام نے دیکھا کہ پول بنانے میں عورتیں اتنی چابکدستی اور خوبصورتی سے کام لے رہی تھیں کہ پولوں کے دائرے اس قدر گول نظر آتے تھے، گویا ان کا محیط کسی نے پرکار لے کر کھینچا ہو۔

کچھ عورتیں دتھوں کو ایک سیدھی قطار میں رکھتی جاتی تھیں، کچھ عورتیں اُن کے پولے تیار

کر رہی تھیں۔ کچھ عورتیں پولے اکٹھا کر کے اُن کے چھوٹے چھوٹے گٹھے بنانے میں مصروف تھیں۔ یہ سب کام ایک ساتھ ہوتا ہے۔ بیس یا پچیس پولے ملا کر ایک گٹھا بنتا ہے۔ کبھی اس سے کم کبھی اس سے زیادہ۔ یہ زیادہ تر کٹی ہوئی گھاس کے اوصاف پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر گھاس زیادہ لمبی ہے یا زیادہ موٹی ہے۔ تو کم پولے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور اگر گھاس زیادہ لمبی نہیں، یا بہت پتلی اور ملائم ہے تو ایک گٹھے میں زیادہ پولے آتے ہیں۔

شیام نے مشر گنگو کے لڑکے سے پوچھا، جو گٹھے بنا رہا تھا۔ ”اب ان گٹھوں کے بنانے کے بعد کیا کرو گے۔‘

”یہ آپ جانیں۔“ لڑکے نے شوخ آواز میں کہا۔ ”اگر آپ چاہیں تو ہم ان گٹھوں کو ایک جگہ جوڑ کر گھاڑا رچ دیں گے (گھاڑا یوں سمجھئے، گھاس کے کھلیان کو کہتے ہیں) اور اگر آپ چاہیں تو ہم گھاس کے ان گٹھوں کو باغ کے منوؤں پر یا اور دو تین بڑے درختوں پر لگا دینگے۔“

شیام نے کئی دفعہ اس علاقے میں سفر کرتے وقت درختوں کی شاخوں پر دور اوپر تک گھاس کے گٹھے ایک دوسرے کے اوپر لگے ہوئے دیکھے تھے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ اس گھاس کو اتنے اور اونچے درختوں پر رکھنے کا کیا مطلب ہے۔

اُس نے لڑکے سے پوچھا۔ ”یہ منو کے درخت پر گھاس جمع کر دینے سے کیا فائدہ ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”اس طرح سے گھاس کی حفاظت بہترین طریق پر ہو سکتی ہے۔ اگر بارش آجائے تو گھاس مرطوب زمین سے بچی رہتی ہے اور اس طرح سڑنے گلنے سے بچ جاتی ہے، اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی اس میں منہ نہیں مار سکتے۔ پھر کسی چور کے لئے بھی یہ ذرا مشکل ہے کہ وہ رات کو گھاس کے گٹھے میں چرانے کے لئے درخت کی خطرناک شاخوں کو پھلانگتا پھرے۔“

غلام حسین بولا۔ ”صاحب، ہم گھاڑا بھی بنائیں گے، اور دو ایک درختوں پر گھاس بھی اکٹھی کریں گے۔“

لڑکا بولا۔ ”ہاں بہت سے کسان ایسا بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہم تو اپنی ساری گھاس اپنے اخروٹوں کے درختوں پر جمع کر دیتے ہیں۔“

غلام حسین بولا۔ ”یہ تحصیلدار صاحب کی گھاس ہے۔ اسے چرانے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔ ہم ایک گھاڑا بھی رچیں گے۔“ پھر وہ شیام کی طرف دیکھ کر بولا: ”صاحب گھاس کا بلند گھاڑا اس

بنگلے کی چھت سے بھی اُونچا ہو جائے گا۔ آپ دیکھئے گا۔ اس باغ میں بڑا بھلا معلوم ہوگا۔“

ڈھول زور زور سے بجنے لگے، دلے سردار نے اُٹھ کر مشر گنگو کو للکارا، اور کہا کہ ”شرط رہے جو ٹولی اپنا حصہ پہلے ختم کرلے اُس کا سردار ہاری ٹولی کے کندھے پر چڑھ کر اس ساری گھاٹی کا چکر لگائے۔“

مشر گنگو نے درانتی ہوا میں گھما کر کہا۔ ”منظور ہے۔ ایشور نے چاہا۔ تو ہماری ٹولی گھاس کو بجلی کی طرح کاٹتی ہوئی تمہاری ٹولی کے ساتھ آملے گی۔“

ڈھولئے زور زور سے ڈھول کوٹنے لگے، لتیریئے اور بھی پھرتی سے کام کرنے لگے۔ درانتی کی چمکتی ہوئی زبان بجلی کی لپک کی طرح گھاس کے خوشوں میں داخل ہوتی۔ اور سر سر سر کی آواز پیدا کرتی ہوئی ان کو جڑوں سے کاٹتی ہوئی زمین پر بچھا دیتی۔ ہر ایک قطار میں کئی ایک ایسے توانا آدمی تھے، جو دوسروں سے زیادہ پھرتی سے گھاس کاٹتے تھے۔ یہ لوگ گھاس کاٹتے کاٹتے باقی کسانوں سے ذرا آگے چلے آتے، اور کٹی ہوئی گھاس کی لکیر سیدھی نہ رہتی۔ پر ڈھولئے شور مچا کر پیچھے رہ جانیوالے کسانوں کو شرم دلاتے اور وہ لوگ پہلے سے دُگنی پھرتی سے کام کرتے ہوئے لکیر کو سیدھا کر کے پھر اپنے ہم جولیوں میں جا ملتے۔ اس طرح سے آپس میں شرطیں بدی جاتیں اور کام زیادہ تیزی سے ہوتا۔ اور اُن تمام شرطوں کا فیصلہ شام کو ہوتا تھا، جب لتیری ختم ہو جاتی یا اُس دن کیلئے ختم ہو جاتی۔

ڈھول زور زور سے بج رہے تھے۔

سیداں اور چندرا اور نوراں ایک ہی قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں، تیزی سے درانتیاں چلا رہی تھیں، باتیں کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی اُن کے ہنسنے کی آواز ساری قطار پر چھا جاتی اور ان کے قریب کام کرتے ہوئے کسان ان سے مذاق کرنے لگتے، لیکن اس وقت کوئی برا نہ مانتا تھا۔ اور یوں بھی تو اس مذاق میں کوئی برائی نہ ہوتی تھی۔ صاف کھلا شریفانہ مذاق۔

سیداں، چندرا اور نوراں تینوں نے آپس میں شرط بدی، دیکھیں کون آگے نکل جاتا ہے۔ گو سب کو پتہ تھا کہ چندرا اس کام میں سب سے مشاق ہے۔ لیکن پھر بھی شرط بدنے میں ہرج ہی کیا تھا۔

نوراں کے ساتھ کام کرنے والے کسان نے درانتی اوپر اُٹھا کر ایک، دو تین کہا۔ اور تینوں لڑکیاں ہنستی ہوئی تیزی سے گھاس کاٹنے لگیں۔

تھوڑے عرصہ تک تو تینوں ایک قطار میں چلتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ سیداں کا ہات ہلکا پڑ گیا۔ اُس کی رفتار دھیمی ہوتی گئی اور وہ اپنی دونوں سہیلیوں سے بہت پیچھے رہ گئی:

ایک عرصے تک نوراں اور چندرا ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ ساتھ ساتھ جیسے ان کی درانتی ایک ہی لے پر شروع ہوتی تھی۔ اور ایک ہی تال پر ختم ہو جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ۔ ساتھ ساتھ۔ ساتھ ساتھ۔

پھر باقی کسان حیران رہ گئے۔ چندرا کے ہاتھ سست پڑنے شروع ہوئے۔ نہایت ہی آہستہ، نہایت ہی خفیف سا فاصلہ نوراں اور چندرا میں پڑنے لگا۔ پھر چندرا بہت پیچھے رہ گئی۔ اور نوراں نے سب سے پہلے حد کو جالیا۔ اور وہاں پہونچ کر اپنی درانتی رکھدی اور باقی دونوں کا انتظار کرنے لگی۔

جب چندرا بدستور تیزی سے گھاس کاٹتی ہوئی اُسکے پاس پہونچی۔ تو اس کے رخساروں پر، اس کی جبیں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اُس کی نگاہیں نیچی تھیں۔

خود نوراں بڑی حیران تھی۔ اُس نے چندرا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُسکے سارے جسم پر ایک تیز نگاہ ڈالی۔ منہ پر ہات رکھ کر اک رُکی رُکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "کیا بات ہے۔ چندرا کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔" اور یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

چندرا کا چہرہ شرم اور غصے سے لال ہو گیا تھا۔ "چل ہٹ چڑیل۔" اس نے تیزی سے کہا۔

پھر سیداں بھی اُن میں آملی۔ اور وہ تینوں گھاس کاٹتے ہوئے ماہیا گانے لگیں۔

ڈھول جانی

ساڈی گھیلے آویں تھاری مہربانی

ڈھول جانی

میں اتھے تے ڈھول سانسیرے

مرجاں ساں تے کھون متھے تیرے

کھوۓ نے دیا ضامنا

جی روۓ ڈھولا

ڈھول جانی

ساڈی گھیلے آویں تھاری مہربانی

ڈھول جانی

کیوں ٹر چلیاں تیاری کی نشانی؟

ڈھول زور زور سے بج رہے تھے۔ اور "ڈھول جانی" کے خوبصورت گیت کو اپنی گت کی طوفانی لہروں پر اُٹھا کر ساری وادی کی فضا میں پھیلا رہے تھے۔ شیام کا دل بیقرار ہوا تھا۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر انہیں کسانوں کے مجمع میں شریک ہو جائے اک درانتی ہات میں لے کر گھاس کاٹنا شروع کر دے اور زمین کی چھاتی سے لگ کر اپنی زندگی کی ساری بورژوائی عفونت دھوڈالے۔ یہ سوچتا ہوا وہ گھر کے اندر چلا آیا۔ اور اُس نے جلدی سے اپنے کپڑے تبدیل کر ڈالے، ایک کھلے کالر والی قیمص پہن لی اور ایک نیکر اور پھر وہ بھاگتا ہوا مشر گنگو کے پاس چلا گیا اور اس سے کہنے لگا۔ "مجھے بھی گھاس کاٹنا سکھاؤ۔"

مشر گنگو نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ "بابو صاحب، آپ کو پرماتمانہ کرے کبھی گھاس کاٹنا پڑے۔ آپ کو بھلا ایسی کیا ضرورت ہے۔ آرام سے کرسی پر بیٹھ کر ہمارا تماشہ دیکھیے۔"

"نہیں۔" شیام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں مشر گنگو، مہربانی کر کے مجھے ضرور گھاس کاٹنا سکھادو۔"

مشر گنگو نے پھر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کہنے لگا۔ "آپ بہت جلد تھک جائیں گے۔ اور دراصل یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ جب میں نے پہلی بار اپنے باپ سے گھاس کاٹنا سیکھا تھا، تو مجھے بھی آپ ہی کی طرح گھاس کاٹنے کا بے حد شوق تھا۔ اس وقت میری عمر بمشکل پانچ چھ سال کے قریب ہو گی۔ اور......"

اور مشر گنگو چپ ہو گیا اور اس کی نگاہوں میں اپنے باپ کی تصویر پھر گئی، اس کا مضبوط مسکراتا ہوا چہرہ، رخسار سورج کی حدت سے بھورے گلابی، ہات میں درانتی بغیر باہوں اور بغیر کالروں کے کھدر کی بنڈی پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سیاہ منکوں کی ایک مالا، اس نے ننھے گنگو کو زمین سے اُٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ اور پھر اسے "دونوں ہاتوں سے تھام کر اپنے چہرے کے بالکل سامنے کھڑا کر کے، حتیٰ کہ گنگو کو اپنے باپ کا چہرہ بہت بڑا نظر آنے لگا تھا۔ اس سے پوچھا۔ "بیٹے، درانتی چلانا سیکھنا چاہتا ہے۔"

اور گنگو نے اپنی چھوٹی درانتی ہوا میں گھما کر خوشی سے کہا تھا۔ "ہاں۔ چاچا۔"

اور پھر اُس کے "چاچا" نے اُسے درانتی چلانا سکھایا تھا۔ کس طرح اُنگلیاں گھاس کے خوشوں کو اپنی مٹھی میں لانے کے لئے آگے بڑھتی ہیں۔ کس طرح ان اُنگلیوں کے پوروں سے آنکھوں کا کام لیا جاتا ہے۔ گھاس کے خوشوں کو پکڑ کر کس طرح ہات کے نیچے درانتی کے گزرنے کے لئے فاصلہ رکھا جاتا ہے۔ اور پھر کس طرح درانتی ہاتھ کے نیچے سے گزر کر مٹھی میں پکڑی ہوئی گھاس کو ایک قوس بناتی ہوئی بالکل زمین کے اوپر سے کاٹ ڈالتی ہے۔ اُس کا "چاچا" اسے نہایت شفقت سے اور نہایت آرام سے گھاس کاٹنا سکھا رہا تھا۔ اور جب اس نے اس عمل کو سیکھ لیا، تو اپنی رفتار کو تیز کرنے کے شوق میں اُس نے کس طرح جلدی جلدی اپنے باپ کی طرح درانتی چلائی تھی۔ اور پھر یکایک وہ چلا اُٹھا تھا۔ درانتی نے اس کے ہاتھ پر زخم پیدا کر دیا تھا۔ اور اب اُس سے لہو بہہ رہا تھا۔ اور اس کے باپ نے کہا تھا۔ "پروانہ کرو، بیٹا۔ اس لہو کی پروانہ کرو۔ درانتی چلائے جاؤ۔ آہستہ آہستہ۔ زیادہ تیزی کی ضرورت نہیں۔ آہستہ آہستہ درانتی چلاؤ۔ تب بھی یہ درانتی تجھے کاٹ کھائے گی۔ اور اُس وقت تک تجھے کاٹتی رہے گی جب تک تو اس کا صحیح استعمال نہ سیکھے گا۔"

اور پھر اُس کے تخیل میں اپنے باپ کی وہ تصویر آئی جب وہ ستیارام مہاجن کا قرض چکاتے چکاتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں اور اس کی کمر دہری ہو گئی تھی۔ وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اور اُس نے گنگو کے سر پر ہات رکھ کر کہا تھا۔ "پرماتما تجھے سکھی رکھیں بیٹا۔ جا تیرا کلیان ہو۔ ایک بات، صرف ایک بات یاد رکھو بیٹا۔ کبھی کسی سود کھانے والے کا اعتبار نہ کیجو۔ کبھی کسی سود کھانے والے کا اعتبار نہ کیجو۔" اور پھر اُس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

مشر گنگو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اُنہیں اپنی ننگی بانہہ سے پونچھ کر کہا۔ "اوہ میں تو بہت پیچھے رہ گیا ہوں اور دُلے سردار سے شرط بدی ہوئی ہے۔" پھر شیام کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "معاف کرنا بابو جی۔ میں زماں چوکیدار کو آپ کے ہمراہ کئے دیتا ہوں۔ آپ کو درانتی چلانا سکھائے گا۔" اور اُس نے یہ کہہ کر زماں چوکیدار کو آواز دی۔ اور شیام کو اس کے سپرد کر دیا گیا۔

زماں شیام کو گھاس کے ایک الگ قطعے پر لے گیا۔ اور اسے درانتی چلانا سکھانے لگا۔ جب تین چار بار سیکھ لینے کے بعد شیام آہستہ آہستہ گھاس کاٹنے لگا، اور صحیح طریق پر کاٹنے لگا۔ تو زماں بولا۔

"بابو صاحب، اب آپ یہاں بیٹھ کر مشق کرتے جایئے آپ کا ہات انشاءاللہ بہت اچھی طرح چلے گا۔ میں پھر اپنی قطار میں جا کر بیٹھتا ہوں۔ دُلے سردار سے شرط لگی ہوئی ہے۔ یہ نہ ہو کہ کہیں شام کو۔۔۔" وہ یہ کہتا ہوا دور چلا گیا۔

شیام آہستہ آہستہ درانتی چلانے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اک نئی زبان، اک نئے ادب، ایک نئی تہذیب، اک نئی زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ یہ اک نئی دُنیا تھی۔ اس کے اپنے اُصول تھے۔ آہستہ آہستہ درانتی چل رہی تھی۔ الف، بے، تے، بے، تے، درانتی کسان کا قلم تھا۔ اس سے وہ زمین کی تختی پر لکھتا تھا، اور ایسے گل بوٹے بناتا تھا، کہ دنیا کے سارے ادیب، اور دنیا کے سارے مصور اور دنیا کے سارے سیاست دان اس کے خوشہ چین معلوم ہوتے تھے۔ سر ر سر ر سر ر درانتی چل رہی تھی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے دھرتی گیت گا رہی ہے۔ اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہہ رہی ہے۔ شاباش میرے بیٹے۔ درانتی چلائے جا، یہ تیری تہذیب کی بنیاد ہے، ترے مذہب کی خالق ہے، ترے جسم کی روح ہے۔ اسی سے تری مسرتوں اور شادمانیوں کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی سے ترے ادب کو رفعت، اور ترے فلسفے کو برتری حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تری قوم کی آزادی اور تری عورتوں کی عصمت محفوظ ہوتی ہے۔ دنیا میں غمی اور قحط اور جنگ اُسی وقت آتے ہیں، جب انسان درانتی چلانا بھول جاتے ہیں.....

درانتی چلاتے چلاتے شیام کی پیاس چمک اُٹھی، اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پرے ونتی کھڑی پانی پلا رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ونتی نے اُسکی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس کر لیں۔ یہ شاید عورتوں کی چھٹی حس ہوتی ہے جو انہیں اس طرح اُن ان دیکھی نگاہوں کا احساس کرا دیتی ہے۔ بہر حال ونتی کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر اُن دونوں کی نظریں ملیں۔

شیام نے اُسے ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

ونتی اگست کے ہلکے بادل کی طرح آہستہ خرام آئی۔ اس کے رخسار بالکل گلابی ہو گئے تھے، اور ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ اور شیام کا جی چاہا کہ وہ اپنے لب اُن کانپتی ہوئی پنکھڑیوں کے کونوں پر رکھ دے۔

ونتی نے نگاہیں جھکائے ہوئے کہا۔ "جی، کیا کہتے ہیں آپ۔"

ونتی کو دیکھ کر اُسے ہمیشہ اپنے گلے میں کسی چیز کے پھنسنے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ رُک کر کہنے

لگا۔ ”پیاس لگی ہے بھئی۔“

یہ کہہ کر اُس نے اپنی اوک منہ سے لگا دی۔

ونتی مسکرائی، بولی۔ ”کیا پئیں گے آپ۔ شربت، لسی یا ٹھنڈا پانی۔“

اُس نے قدرے توقف کیا۔ پھر بولا۔ ”ٹھنڈا پانی بہتر ہوگا۔“

”تو ٹھہرئیے میں ابھی لائی۔“

وہ ایک گلاس میں پانی لے آئی۔

شیام نے انکار میں سر ہلایا۔ ”دیکھتی نہیں ہو، میرے ہات میں درانتی ہے۔ آج میں اوک سے پانی پیونگا۔ اور یہ گلاس تو کافی نہ ہوگا۔“

ونتی پھر واپس ہوئی۔ اور اب کے ایک بڑی بالٹی میں پانی بھر لائی۔

شیام اوک سے پانی پینے لگا۔ ”پلادے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے۔“ لیکن بیچارہ ساقی تو پلا رہا تھا۔ اور وہ خود اوک میں پینا چاہتا تھا۔ اس میں ساقی کا کیا قصور تھا۔ یونہی غالب کا شعر اس وقت اُس کے دماغ میں گھسا آرہا تھا۔ پلادے اوک سے ساقی......“

وہ پانی پیتا رہا، اور جب اُس کی پیاس بجھ گئی۔ تو اس نے پانی پینا بند کر دیا۔ ہاں وہ اوک کو اُسی طرح منہ سے لگائے ہوئے تھا۔ اوک لبالب بھری ہوئی تھی۔ اور پانی چھلک چھلک کر باہر گر رہا تھا۔

ونتی ہنس کر بولی۔ ”بس۔“

”نہیں تو۔“ اُس نے اوک کو منہ سے پرے لے جاتے ہوئے کہا۔ ”جی یہ چاہتا ہے کہ اوک میں پانی گرتا رہے۔ اوک میں پانی چھلکتا رہے، اور میں اوک میں سے پانی پیتا رہوں۔“

ونتی نے شوخی سے کہا۔ ”تو شوق سے پیتے رہئیے۔ ہمارے ہاں ٹھنڈے پانی کی کمی نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ گھاس ذرا ٹھیک طرح سے کاٹا نہیں تو شام کا کھانا نہیں ملے گا۔“ وہ دونوں ہنسنے لگے۔

پھر شیام سر جھکا کر گھاس کاٹنے لگا۔ ونتی کا اب وہاں دیر تک ٹھہرنا معیوب معلوم ہوتا، وہ آہستہ سے بولی۔ ”میں اب جاؤں۔“

شیام نے اُسی طرح سر جھکائے گھاس کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ونتی!“

”جی۔“

”ونتی۔“

”جی۔“

”ونتی۔“

”جی۔“

اور پھر وہ یکلخت وہاں سے چلی گئی۔ اور شیام کا دل کسی نامعلوم خوشی سے معمور ہو گیا۔ اور اُسکے منہ سے ”سی“ کی آواز نکلی، اور اس کا ہات رُک گیا۔

درانتی نے اُسے کاٹ کھایا تھا۔ اور اُسکے ہات سے لہو بہہ رہا تھا۔

اُس نے درانتی کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنے ہات سے بہتے ہوئے لہو کی طرف، پھر اُس نے ونتی کی طرف دیکھا جو دور اب نوراں، سیداں اور چندرا کے پاس کھڑی اُن سے باتیں کر رہی تھی۔ اور شیام کے چہرے پر شادمانی کی اک لہر دوڑ گئی۔ اور اُس نے پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ درانتی سے گھاس کے خوشوں کو کاٹنا شروع کیا۔

غروب آفتاب سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے ڈھولیئے جو پہلے لتیریوں کی دونوں قطاروں کے درمیان گھاس کے قطعے پر کھڑے ہو کر اپنے ڈھول بجاتے تھے، اب دو ٹولیوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک ٹولی مشر گنگو کی قطار کے پیچھے کھڑی ہو کر ڈھول بجانے لگی، اور دوسری ٹولی دُلے کی ٹولی کے ساتھ ہو گئی، مقابلہ بڑا سخت تھا۔ کیونکہ اس وقت تک دونوں ٹولیاں برابر نظر آتی تھیں، اور غروب آفتاب تک اس کا امر کا فیصلہ ہو جانا تھا کہ کس ٹولی نے اپنا کام پہلے ختم کیا ہے۔

ڈھول زور زور سے بجتے رہے۔ اور دونوں ٹولیاں سر جھکائے تندہی سے کام کرتی رہیں۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے، نہ صرف لتیریوں کے جسم بلکہ ڈھولیوں کے جسم بھی پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ اب بھی دونوں ٹولیاں برابر تھیں۔ سورج مغرب کو جا رہا تھا اور اک ہلکی، خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ جس میں چیل کے جنگلوں کے جیکین کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دُلے اور مشر گنگو نے مغرب کی طرف جاتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا، گھاس کے اُس قطعے کی طرف دیکھا جو ابھی ان کے سامنے باقی تھا، اور اک نعرۂ مستانہ لگا کر اپنی اپنی ٹولیوں کو زیادہ مستعدی سے کام کرنے کیلئے کہنے لگے۔

درانتیاں ابھی اس قدر تیزی سے چل رہی تھیں کہ شیام ان لوگوں کی رفتار پر حیران رہ گیا، پانچ منٹ گزر گئے۔ دس منٹ گزر گئے، اب بھی دونوں ٹولیاں برابر تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ دُلے کی ٹولی آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈھول زور زور سے بجتے ہوئے دونوں ٹولیوں کو اکسانے لگے، دونوں ٹولیوں سے بار بار نعروں کی آواز بلند ہوتی تھی۔ لیکن دلے کی ٹولی آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ سورج آدھا غروب ہو گیا، اب صرف اک سنہری قوس دکھائی دے رہی تھی۔ اک آخری سنہری سی لکیر، یکایک سورج نے پہاڑوں کے

پیچھے ڈبکی لگائی اور گم ہو گیا۔ اور جیسے ڈھول اپنی پوری قوت سے بج اُٹھے۔ شیام نے دیکھا کہ دُلا اپنی ٹولی سمیت گھاٹی کے آخری سرے تک پہونچ گیا تھا جہاں دھان کے کھیت شروع ہوتے ہیں۔ اس کی ٹولی نے درانتیاں ہاتھوں پر رکھدیں اور ایڑیاں اُٹھا کر ہاتھ پھیلا کر سب نعرے لگاتے ہوئے اک دائرے میں ناچنے لگے۔ دلا سردار گھاٹی پر دوڑتا اوپر چڑھ آیا جہاں گنگو کی ٹولی سر جھکائے آخری قطعے میں کام کر رہی تھی۔

دلا مشر گنگو کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اور اس کے سامنے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے ہات کو اس کے چہرے کے سامنے گھماتے ہوئے بولا۔ "ترارارا چک چک چک۔"

بظاہر یہ بالکل بے معنی صوتی ارکان تھے۔ لیکن شیام کو انہیں سُن کر اور دلے کی حرکات دیکھ کر جوان صوتی ارکان کی تشریح کر رہی تھیں، صاف معلوم ہوا گویا دلا کہہ رہا ہے۔ "بس مشر گنگو، دیکھ لیا مقابلہ کر کے۔ ہار گئے نا۔ اب سُناؤ۔"

مشر گنگو نے اُٹھ کر دلے کو گلے لگا لیا۔ بولا۔ "بھائی تم جیت گئے۔" مشر گنگو کی ٹولی کے باقی لوگ بھی ہنسنے لگے۔

پھر دلے کی ٹولی کے باقی افراد بھی آ گئے۔ اور سب نے مل کر گھاس کا آخری قطعہ صاف کر دیا۔ شفق کی ارغوانی روشنی گھاس کے دتھوں پر اس طرح چمک رہی تھی کہ وہ سونے کی تیلیوں کے ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ کسانوں کی آنکھوں میں اور ان کے رخساروں پر جگمگا رہی تھی۔ ان گٹھوں پر پھسلتی جا رہی تھی جنہیں گھاڑار چنے کے لئے ایک جگہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔

یکایک دلا بولا۔ "بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے بھائی۔ اب جلدی سے روٹی کا بندوبست کرو۔"

غلام حسین بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ تیار ہوا جاتا ہے۔ ایک درجن آدمی تو صرف لتیریوں کیلئے کھانا پکانے کیلئے لگائے ہیں۔"

دلا بولا۔ "خدا تجھے جیتا رکھے، اے جوان، خدا تجھے جیتا رکھے۔"

سب ہنسنے لگے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد دلے نے گنگو مشر کے کندھے پر چڑھ کر گھاٹی کا اک چکر لگایا، اور پھر واپس آتے ہوئے اُس نے گنگو مشر کو اپنے کندھے پر چڑھا لیا، اور گھاٹی پر بھاگتا ہوا اور ٹھہرتا ہوا، اور

نعرے لگاتا ہوا واپس باغ میں آگیا۔ جب وہ مشر گنگو کو اپنے کاندھے پر چڑھائے واپس پہونچا، تو سب کسان ہنسنے لگے۔

سنت رام بولا۔ "کیا اب مشر گنگو نے شرط جیت لی ہے۔"

دلا بولا۔ "نہیں چاچا، میرا خیال ہے کہ اگلی لتیری مشر گنگو جیت لے گا۔ میں نے سوچا ابھی سے یہ جواسر سے اُتار دوں۔"

پھر ایک قہقہہ پڑا۔

مشر گنگو بولا۔ "دلے سردار۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری ٹولی میں عورتیں زیادہ تھیں۔ ورنہ میں تمہیں کبھی یہ بازی نہ لے جانے دیتا۔"

چندرا نے چمک کر کہا۔ "ہم نے تمہارے مقابلے پر درانتی چلائی ہے، اگر یقین نہ ہو۔ تو اب پھر مقابلہ کر دیکھو۔"

سب لوگ ہنسنے لگے، یہاں تک کہ ڈھولیوں نے بھی اپنے ڈھولوں سے دڑد گڑ دگڑ کی آواز بلند کی۔

کھانا کھا کر کچھ لوگ تو وہیں گھاس پر لیٹ گئے۔ کیونکہ صبح لتیری پھر شروع ہونی تھی۔ باقی لوگوں نے گھاس کے گٹھوں کے قریب اک حلقہ سا بنا لیا، اور گیت گانے لگے "چناں" اور "ماہیا" اور "سیاہیا" اور سیف الملوک، دلا کان پر ہات دھر کر گا رہا تھا۔

روئے ... روئے رے
باغاں۔ دے وچ روئے بُلبُل بولے
کسیاں بولن پانی ای ای ای ---
جھاں روئے ساڈے سجن وچھوڑے
صبر اُنہاں دی جانی ای ای ای

جانی کی "ی" کو وہ اپنی لے میں اتنی دیر تک کھینچتا، جہاں تک کہ اس کے، پھیپھڑوں میں دم رہتا۔ اور دلے پر ہی یہ کیا موقوف تھا، سیف الملوک گانے والے سبھی اسی طرح کرتے تھے۔ شیام نے سوچا، یہ گانا بھی ہے، اور گہرے سانس لینے کی ورزش بھی۔ غالباً وہ جو داناؤں نے کہا ہے کہ گانا گانے والوں کو تپ دق نہیں ہوتی ان کی مراد صرف سیف الملوک گانے والوں سے ہو گی، ورنہ یہ جو

فلمی گیت وغیرہ ہوتے ہیں، ان کے گانے والوں کا تو کمال ہی یہی ہے کہ پھیپھڑے تو کیا گلے میں بھی حرکت نہ ہو۔ لب تک نہ ہلیں اور گانا آپ ہی آپ باہر نکلتا آئے جس طرح جادوگر کے منہ سے ریشمی فیتہ نکلتا ہے۔

اور جب مرد چپ ہو جاتے، تو عورتیں گانا شروع کر دیتیں۔ یا کبھی یوں ہوتا کہ ایک بند عورتیں گاتیں، دوسرا بند مرد۔ اور بیچ میں کبھی کبھی ڈھولئے دڑد گڑد گڑد گڑ کی آواز پیدا کر کے واہ واہ کرتے اور سب کو ہنسا دیتے۔

پھر ڈھولیوں نے نقلیں سنائیں۔ مراسیوں کے لطیفے ہوئے، جاٹوں کے، جولاہوں کے، گوجروں کے، براہمنوں کے، مہاجنوں کے، اس کے بعد پریوں اور جنوں اور بھوتوں کی کہانیاں شروع ہوئیں۔ مشر گنگو کا لڑکا بولا۔ "اس وقت سنتھال ڈاب پر بونے ناچتے ہیں، چڑیلیں روئی کے گولے بن کر ہوا میں اُڑتی ہیں، اور بھوت سنتھال کی اونچی چٹانوں پر بیٹھ کر اپنے پاؤں کے سموں پر آگ کے نعل لگاتے ہیں۔"

"آگ کے نعل" شیام لے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں بابو جی۔" گوکل نے کہا۔ "بھوت کے سموں پر آگ کے نعل لگے ہوتے ہیں۔ ایک بار میں رات کو بیر کے نالے میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے اپنے سامنے بھیڑ کا ایک خوبصورت سا بچہ دوڑتا ہوا دیکھا۔ میں نے سوچا شاید یہ کہیں راستہ بھول گیا ہے۔ بڑا خوبصورت لیلا تھا۔ میں اُس لیلے کو پکڑنے کیلئے اُس کے پیچھے دوڑا۔ لیکن وہ نالے میں کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد میرے دل میں شبہ سا پیدا ہوا اور میں ادھر اُدھر دیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ پھر یکایک میرے سامنے اک روئی کا گولا سپید، بالکل سپید، آگے آگے اُڑنے لگا۔ پھر فوراً غائب ہو گیا۔ پھر جیسے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ بڑی خوفناک آواز تھی۔ میں نے اپنے بازو سے اپنے گورو کا دیا ہوا منتر جو چاندی میں منڈھا ہوا ہے۔ (اپنے بازو پر چاندی کے تعویذ کی طرف اشارہ کر کے) اتار کر اپنے منہ میں رکھ لیا کیونکہ میرے گورو نے اسی طرح بتایا تھا اور میں آگے بڑھنے لگا۔ تب میں نے دور نالے میں ایک تلے پر بھوتوں کو ناچتے ہوئے دیکھا۔ انکے سموں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اس تلے پر اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ صرف آگ کے شعلے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تب میں نے اپنے گورو کے منتر کا جاپ کیا۔ اور نالے میں سے گزرتا چلا گیا۔ جب میں نالے کو پار کر گیا، تو پیچھے سے آواز آئی "اے

جوان تو خوش قسمت تھا کہ اپنے گورو کے منتر کے طفیل بچ گیا۔ ورنہ آج تری لاش یہیں رہتی۔"

گھر پر آکر مجھے چار پانچ روز بخار رہا۔ لیکن گورو جی میرا علاج کرتے رہے اور میں بچ گیا۔"

مشر گنگو کا لڑکا بولا۔ "میں اُس آدمی کو پانچ روپے دوں گا جو اس وقت سنتھال ڈاب پر جائے۔"

نوراں بولی۔ "لو۔ ایک روپیہ نکالو تم۔ میرا تو گھر ہی وہاں ہے۔ میں تو وہیں رہتی ہوں۔ اور اب مجھے بھی وہیں جانا ہے۔ لو نکالو روپیہ۔"

سب کسان ہنسنے لگے۔ اور گفتگو کا موضوع بھوتوں سے سنتھال ڈاب اور تیرنے کے فن پر اور مچھلیاں پکڑنے کے طریقوں پر بدل گیا۔ بہت دیر تک باتیں ہوتیں رہیں، کبھی کبھار کوئی بیچ میں گانے لگتا، اور باقی لوگ اس کا ساتھ دینے لگتے۔ پھر کسی کو کوئی نئی بات سوجھ جاتی۔ اور وہ اک داستان بیان کرنے لگتا، اور سارا حلقہ نہایت توجہ سے اس کی کہانی سننے لگتا، باتیں سنتے سناتے کوئی رات کے بارہ بج گئے۔ پھر لوگ جمائیاں لینے لگے اور حلقہ ٹوٹنے لگا۔ کچھ لوگ تو وہیں گھاس کا بستر بنا کر سو گئے اور کچھ لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اور شیام نے بنگلے کی طرف جاتے جاتے اک نظر پھر ادھر ڈالی، جہاں دودھ ایسی سپید، سیال چاندنی کے بستر پر گھاس کے گٹھے سوئے پڑے تھے۔ اور اُن کے قریب اُنہیں کاٹنے والے کسان بھی سوئے پڑے تھے۔ ان کے چہروں پر چاند چمک رہا تھا۔ تارے مسکرا رہے تھے۔ باغ کی نازک، لطیف ہوا اپنے دوش پر چمیلی کے پھولوں کی خوشبو لئے ان کی مدھم سانس کو مہکاتی جاتی تھی۔ ساری دھرتی سے اک سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ جیسے زمین نے انہیں اپنی نرم، گداز آغوش میں لیا تھا۔ اور تھپک تھپک کر کہہ رہی تھی۔ "سو جاؤ۔ میرے ننھے بیٹو، اپنی ماں کی آغوش میں سو جاؤ۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

اور شیام نے سوچا۔ "بیشک خطرہ وہیں ہوتا ہے، جہاں بنگلے بنے ہوتے ہیں اور اُن کے باہر چوکیدار پہرہ دیتے ہیں۔"

پیر کے میلے میں ایک دن رہ گیا تھا اور شیام کے والد تھانیدار کے ہمراہ میلے کے انتظامات کا ملاحظہ کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ اور بھی کئی اہلکار اُن سے پہلے جا چکے تھے۔ بہت سے دکانداروں نے اپنی دکانیں وہاں بھیج دیں تھیں اور خود بھی پہلے انتظام کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ اس میلے میں ساری تحصیل کے مختلف گاؤں سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ نہ صرف اسی تحصیل سے، بلکہ دیگر علاقوں سے بھی لوگ اس میلے میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے۔ روی اور نمی نے تو تین چار روز پہلے ہی میلے جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ نئے بوٹ، نئے فراک، نئی ٹوپیاں، ہر چیز نئی ہونی چاہیئے۔

سہ پہر کی چائے پی کر شیام اور علی جو ندی کے کنارے سیر کو نکل گئے۔ علی جو ڈاکٹر کے بارے میں بڑا متفکر تھا۔ کیونکہ خلاف معمول اب کے حکام بالادست نے برہمنوں کی رجسٹری کا ڈاکٹر سے جواب طلب کیا تھا۔ پنڈت سروپ کشن، اس نے بتایا، چپکے سے گاؤں چھوڑ کر خود حکام بالادست سے ملنے گیا تھا۔ تاکہ ذاتی طور پر مل کر گاؤں کے براہمنوں اور مہاجنوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرے۔ معاملہ بڑا بے ڈھب نظر آرہا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ کہیں بے چارے ڈاکٹر کے خلاف سرکاری کمیشن نہ بٹھایا جائے۔ علی جو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کی تحقیقات کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

"لیکن۔" شیام نے کہا۔ "ڈاکٹر قطعاً بے قصور ہے، ڈاکٹر کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ کیا ڈاکٹر نے رجسٹری کے جواب میں حکام بالادست کو صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کیا۔"

علی جو نے اُسے بتایا کہ ڈاکٹر نے اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ اُس نے موہن سنگھ کے کہنے پر چندرا کو وارڈ میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ وہ مریض کی مرضی کے خلاف اُس کے رشتے داروں

کو اُس کی تیمارداری کے لئے کیسے اجازت دے سکتا تھا۔ باقی رہا چندرا کا نابالغ ہونا۔ تو وہ اس کے متعلق کوئی رائے دینے سے انکار کرتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک طبی مسئلہ تھا جب تک وہ یا کوئی ایک میڈیکل بورڈ چندرا کا معائنہ کر کے اس امر کا فیصلہ نہ کرے، وہ اس کے متعلق کوئی صحیح رائے دینے سے قاصر تھا۔

شیام نے ڈاکٹر کے جواب کو سراہتے ہوئے کہا۔ "جامع، مکمل، صحیح، میرے خیال میں تو ڈاکٹر کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

علی جو بولا۔ "بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ دنیا میں ہر ایک جامع، مکمل اور صحیح چیز ہمیشہ درست نہیں مانی جاتی، اور جہاں فرقے وارانہ سوال پیدا ہو جائے وہاں بدقسمتی سے دلائل کے بجائے لوگ جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ آپ ابھی نوجوان ہیں۔ کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ آپ کو ابھی ان باتوں کا تجربہ نہیں ہے۔ علی جو سے پوچھئے پانچ سال سے میری ترقی رکی ہوئی ہے۔ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے تحصیلدار نہیں بنایا جاتا درحالیکہ کئی نالائق ہندو......"

وہ چپ ہو گیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ تعصب دونوں فریق میں پایا جاتا ہے۔ ہندو مسلمان کا گلا کاٹنے سے پرہیز نہیں کرتا اور مسلمان کا بھی اگر بس چلے تو اُسے زک پہنچائے بغیر نہیں رہتا۔"

شیام نے کہا۔ "آپ بھی اب دلائل سے زیادہ جذبات سے کام لے رہے ہیں۔ یہ معاملہ مذہبی نہیں سیاسی اور اقتصادی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمان مسلمان کا گلا نہ کاٹتا اور ہندو ہندو کے خلاف نہ ہوتا۔ نوکریوں کے معاملے ہی کو لے لیجئے۔"

لیکن علی جو آج بہت اُداس تھا۔ وہ اس معاملے پر مزید بحث نہ کرنا چاہتا تھا۔ شیام نے محسوس کیا کہ اُسے شاید کوئی تازہ چرکہ لگا ہے۔ شاید اُس کی ترقی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا ہے، اُس نے پوچھا۔ "آپ کل میلے پر چلیں گے۔"

"نہیں۔"

"وہ کیوں، ایک آپ ہی کیوں جانے سے انکار کر رہے ہیں، باقی سب اہلکار جا رہے ہیں بلکہ کئی ایک ایسے اہلکار ہیں جن کا وہاں بظاہر کوئی کام نہیں، لیکن وہ بھی سرکاری دورے کا بہانہ کر کے میلہ دیکھنے جا رہے ہیں اور آپ تو علاقے کے مجسٹریٹ ہیں، آپ تو جب چاہیں، جہاں جی چاہے جا سکتے

ہیں۔"

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔" علی جو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تحصیلدار صاحب وہاں تشریف لے گئے ہیں، میرے جانے کی اب کیا ضرورت ہے آپ تو جا رہے ہیں نا۔"

"ہاں ہمارے ہاں سے تو سب لوگ جا رہے ہیں۔ ہم لوگ کل صبح یہاں سے چلیں گے۔ والدہ ہوں گی، اور روی اور نمی چھایا اور اس کی لڑکی ونتی، اور دو ایک نوکر۔ آپ بھی چلئے نا اور اپنی بیگم کو بھی ساتھ لیتے چلئے۔"

"نہیں صاحب" علی جو نے آزردہ ہو کر کہا۔ "مجھے یہاں کچہری کا کام سنبھالنا ہے۔ تحصیلدار صاحب کے جانے کے بعد کم از کم مجھے تو یہاں رہنا چاہیئے۔ کم از کم ایک مجسٹریٹ کا صدر مقام پر ہونا ضروری ہے۔"

تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموش چلتے رہے پھر علی جو اُس کی طرف جھک کر بولا۔ "بات دراصل یہ ہے شیام صاحب، کہ زندگی میں محبت اور نفرت سے بڑھ کر بھی ایک شے ہے اور وہ ہے روپیہ، سچائی اور دیانتداری۔ اور قابلیت سے بھی بڑھ کر ایک شے ہے اور وہ ہے روپیہ۔ میرے خیال میں روپے کی طاقت لامحدود ہے، اس کا اثر بے پناہ ہے۔ اب میں آپ کو ایک بالکل خفیہ بات بتاتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر وہ اور بھی شیام کے قریب ہو گئے اور جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے۔ "ان ہندو نائب تحصیلداروں نے بڑے افسروں کو رشوت دی ہے، مال لگایا ہے، یہاں علی جو پانچ وقت نمازیں پڑھتا رہا ہے اور اس ضروری فرض سے بالکل غافل رہا ہے۔ یہ مجھے اپنی غفلت کی سزا مل رہی ہے۔"

شیام بولا۔ "اسی لئے تو میں نے پہلے عرض کیا تھا، کہ یہ معاملہ مذہبی نہیں اقتصادی ہے۔ مذہب کی رفعتوں کو بھی اس مہاجنی دور نے اپنی روپہلی گرفت میں لے لیا ہے۔ زندگی چاہے وہ ہندو کی ہو یا مسلمان کی، اقتصادیات کے پیمانے پر تلتی ہے۔ اور یہ ایک طرح سے لابدی اور ضروری ہے، مشینوں کے زمانے میں اس سے بہتر اور کونسا پیمانہ ہو سکتا ہے۔ ہندو مسلم سوال جب بھی حل ہوا اسی پیمانے پر تل کر حل ہوگا۔ محض ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہہ دینے سے حل نہ ہوگا۔ بھائیوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں، جائیداد اور زرنقد اور دیگر باتیں ہوتی ہیں جن کے متعلق تصفیہ کرانا ضروری ہوتا ہے۔ اس تصفیہ کے بغیر دو بھائی بھی چین سے نہیں رہ سکتے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" علی جو بولا۔ "لیکن اگر کوئی اس تصفیئے کے بعد بھی الگ رہنا چاہے، جیسا کہ بھائیوں میں اکثر ہوتا ہے تو؟۔۔۔"

شیام بولا۔ "تو اُسے الگ رہنے دینا چاہیئے۔ اُسے اپنا گھر الگ تعمیر کرنے دیجئے یہ نہ صرف مصلحت ہے، بلکہ دانشمندی کا بھی یہ ہی تقاضا ہے۔"

علی جو بولا۔ "تو گویا آپ ہندو مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں اور انہیں الگ رکھنا چاہتے ہیں۔"

شیام بولا۔ "نہیں، میں تو انہیں بھائی سمجھتا ہوں۔ میں تو ہندو مسلمان تو کیا دنیا بھر کے انسانوں کو بھائی سمجھتا ہوں، اور انہیں الگ دیکھنے کے بجائے انہیں اکٹھا مل جل کر امن و آشتی سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے ایک بہتر تہذیب، ایک بہتر نظامِ زندگی، ایک بہتر فلسفے کو تعمیر کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کہیں گے، کہ پھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ رہنے کا حق کیوں دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ آزادیٔ خیال اور عمل کا تقاضہ ہے، جب تک ایک انسان دوسرے انسان کو بعینہ وہی حقوق نہ دے گا جو وہ اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے دنیا میں کبھی امن و امان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میرے خیال میں الگ رہنے کے حق کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ الگ رہنا عمل سے پہلے ایک ذہنی اقدام ہے، ایک ذہنی اقدام، حل نہیں، اگر ایک ملک کے دو یا دس یا بیس ٹکڑے کر دیئے جائیں، تو اُس سے اُس ملک کے رہنے والوں کے بنیادی مسائل حل نہیں ہوتے، یورپ میں بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ وہاں ایک ملک کے سات آٹھ ٹکڑے کر دیئے گئے اور کبھی سات آٹھ چھوٹے چھوٹے مختلف ملکوں کو ملا کر ایک ملک بنا دیا گیا محض اس جغرافیائی جمع یا تقسیم سے تو عوام کے دکھ دور نہیں ہو سکتے۔ اس سے نہ بے کاری کا خاتمہ ہو گا، نہ غلامی کا، نہ بھوک کا، نہ جماعتی تضاد کا۔"

"پھر؟" علی جو بولا۔ وہ آج خود باتیں نہ کرنا چاہتا تھا باتیں سننا چاہتا تھا۔ "پھر کیا ہونا چاہیئے۔ آپ بھی عجیب باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ، پہلے کہتے ہیں کہ الگ گھر بنا کر رہو، بے شک رہو۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا اگر فائدہ نہیں ہے، تو آپ ایسی صلاح ہی کیوں دیتے ہیں۔"

شیام نے کہا۔ "میں نے عرض کیا نا۔ الگ رہنا سب سے پہلے ایک ذہنی اقدام ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک بھائی الگ رہنا چاہتا ہے، دوسرا بھائی الگ رہنے کو برا سمجھتا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ

بجائے اس کے کہ دونوں بھائی لڑیں اور آپس میں اس اصولی بحث پر کٹ مریں۔ دونوں بھائی الگ رہنے کے حق کو تسلیم کر لیں۔ اس ذہنی اقدام کے بعد عمل آتا ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ جب تک الگ رہنے کے حق کو تسلیم کر لیا جائے، دوسرا بھائی اسے عمل میں نہ لائے، یا اُس وقت تک عمل میں نہ لائے، جب تک کہ وہ پھر اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں سمجھتا۔ اب یوں سمجھئے کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ الگ رہے گا، اُسے الگ رہنے دیجئے، اس منزل پر پہنچ کر میں صرف یہ کہتا ہوں کہ تاریخ اور انسانی تجربہ یہی کہتا ہے کہ الگ رہنے سے انسان کے بنیادی مسائل کبھی حل نہ ہوں گے جو آدمی اس کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے، اُسے یہ حق دیجئے کہ وہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

"لیکن کب تک یہ تجربے ہوتے رہیں۔"

"جب تک ہر انسان دوسرے انسان کو بعینہ وہی حقوق نہیں دینا چاہتا، جو خود اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔"

بحث ختم ہو گئی، لیکن شیام کے لئے یہ بحث ابھی شروع ہوئی تھی۔ وہ کئی بار اس مسئلے پر غور کر چکا تھا۔ آج رہ رہ کر علی جو کا آزردہ چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، جیسے اس اُداس چہرے نے اس غیر معمولی سوال کو پھر اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ سوچنے لگا، کہ شاید اس سوال کا حل محض اقتصادی نہیں، جذباتی بھی ہے۔ اس سوال کی حیثیت دوگونہ ہے۔ اقتصادی اور جذباتی، نسلی اور قومی اور ملکی امتیاز اس اندھی جذباتیت کی بنیادوں پر اُستوار ہوتے ہیں۔ ایشیائی قومیں یورپی قوموں کو مادیت پرست، رذیل، اور کمینہ اور دھوکے باز سمجھتی ہیں مغربی قومیں ایشیائی قوموں کو پست، ناکارہ، اور جاہل سمجھتی ہیں۔ بے شمار ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے محض اسی جذباتیت کی بنا پر نفرت کرتے ہیں، بہت سے عیسائی چاہے وہ کسی ملک کے ہوں۔ یہودیوں سے اسی جذباتیت کی بنا پر نفرت کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان قومی، نسلی، ملکی، مذہبی امتیازات کی تہ میں اس کوری جذباتیت کے علاوہ اقتصادی کشمکش بھی ہوتی ہے، لیکن اس سوال کے حل کرنے میں جذبات کو بالکل الگ کر دینا۔ ایک بڑی بھاری غلطی ہے اسی لئے تو وہ الگ رہنے کے حق کو ایک انسانی حق تسلیم کروانا چاہتا تھا۔

لیکن اگر محض الگ رہنے سے عوام کے بنیادی مسائل حل نہ ہو سکتے تھے، تو محض چار پانچ

ملکوں کو اکٹھا ملا دینے سے بھی یہ مسائل حل نہ ہوتے تھے۔ خود یورپ نے تجربہ کر کے دیکھ لیا تھا۔ ایشیا نے اُس سے بہت پہلے تجربہ کر کے دیکھ لیا تھا۔ اور اب بھی یہ تجربے ہو رہے تھے۔ یہ جغرافیائی تجربے جو ایک کوری جذباتی تسلی پر منتج ہو جاتے تھے اور اس کے بعد پھر وہی بے کاری، بھوک، غلامی، جماعتی تضاد، اور یہ مسائل اُس وقت تک نہ حل ہو سکتے تھے جب تک انسانوں کی اجتماعی زندگی اقتصادی مساوات کے اصولوں کو اپنائے، اور اُس وقت اقتصادی مساوات کے اُصول کا قائل نہ ہو گا جب تک وہ ان قومی، نسلی، ملکی، مذہبی امتیازات کا قائل رہے گا۔ تو کیا پھر یہ سوال محض جذباتی تھا، کیا اس چھوٹی سی کائنات کے تمام دکھوں کا باعث انسان کے برے جذبات تھے۔ کیا ایشیا کے حکیم راستی پر تھے۔ کیا سچ مچ پہلے اس باطنی، ذہنی، جذباتی انقلاب کی ضرورت تھی تاکہ اقتصادی انقلاب کی ترویج ہو سکے؟ لیکن کیا یہ صحیح نہ تھا کہ اقتصادی مساوات خود ایک ایسے باطنی، ذہنی، جذباتی انقلاب کی نشوونما کرتی ہے، جس کی تخلیق کا وہ آرزومند تھا۔ تو کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ جذباتی اور اقتصادی انقلاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے، ایک دوسرے سے طاقت، روح اور نور جذب کرتے ہوئے۔"

معاملہ بڑا پیچیدہ ہے، اُس نے سوچا خالص دردسر، کیوں نہ آدمی اس قسم کی فلسفیانی باتوں سے کنارہ کشی کر لے اور اس قسم کی باتوں پر سوچنے کے بجائے خوبصورت چہروں کے متعلق سوچے، خوبصورت جیسے آسمان کے تارے، جیسے ترناری کے مہکتے ہوئے پھول، جیسے پتلے، متبسم، خمیدہ لب، جن کے کنارے ہر وقت کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر کانپتے رہتے ہیں......

دوسرے دن وہ پیر کے میلے کو روانہ ہوئے۔ ابھی سورج نکلا نہ تھا، اور ساری وادی پر ایک نیم سپید نیم زرد روشنی چھائی ہوئی تھی، گھاس کہرے سے سفید تھی، فاختاؤں کے جوڑے ہوا میں اڑے جا رہے تھے، اور فضا میں چیل کے جھومروں کی فرحت ناک خوشبو بسی ہوئی تھی۔ شیام اپنے بدن کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا اُسے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں ایک لطیف خنکی کا احساس ہو رہا تھا، اسی وجہ سے مجھے اگست کی صبحیں اس قدر پیاری لگتی ہیں، اُس نے سوچا، ان میں کسی کنواری کی سی دلکشی اور رعنائی ہے، اُس دوشیزہ کی سی پاکیزگی جس کے لب ابھی بوسے کی بوجھل لذت سے آشنا نہیں ہوئے، وہ آہستہ آہستہ اپنے لبوں سے سیٹی بجانے لگا، پھر اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی، اور باگ کھینچ کر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔

وہ اپنے قافلے سے آگے نکل آیا تھا۔ اب وہ گھوڑا روک کر اُن کا انتظار کرنے لگا، سب سے آگے غلام حسین گھوڑے پر تھا اُس کے پیچھے روی اور نمی گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے، وادی کے مختلف مناظر دیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کو ہاتھوں سے اشارے کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ دو نوکر تھے، جو اُن کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ چوکنے ہو کر چلے آ رہے تھے، شیام کی والدہ کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں روی اور نمی گھوڑوں سے گر نہ پڑیں، درحالیکہ روی اور نمی دونوں اپنے کو گھڑسوار بلکہ شہسوار سمجھتے تھے۔ شیام کی والدہ ایک خچر پر اُن کے پیچھے آ رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ چھایا کا خچر تھا اور آخر میں ونتی اور اُس کے پیچھے دو نوکر جو پیدل چل رہے تھے۔ اور جنہوں نے کھانا پھل پھلاری اور مختلف سامان اٹھا رکھا تھا۔

وہ اپنا گھوڑا روکے ایک طرف کھڑا تھا، اور قافلہ اب آگے بڑھنے لگا، غلام حسین مسکرایا، روی

اور نمی چلاتے ہوئے کہنے لگے۔ "بھاپاجی، وہ دیکھو، اس چوٹی پر برف ہے نا، سچ مچ۔"

شیام نے مسکرا کر سر ہلایا۔

اُس کی والدہ بولیں۔ "بھئی، تم ہمارے ساتھ رہو نا، آگے گھوڑا دوڑا کر کیوں نکل جاتے ہو۔"

شیام نے مسکرا کر کہا۔ "اسی لئے تو گھوڑا روکے یہاں کھڑا ہوں۔"

اور پھر وہ ونتی کے ساتھ ہو گیا اور وہ دونوں قافلے کے آخر میں آہستہ آہستہ گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی کئے چلنے لگے۔ ونتی نے سپید ریشم کا سوٹ پہن رکھا تھا اور کمر میں سپید نینوں کا چنا ہوا لہریہ پیٹی کی طرح ٹکا ہوا تھا، جوڑے میں ترناری کے سپید ستارے تھے، اور اُن کی تیز مہک نے اس کے نتھنوں کو چھو لیا۔ ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں تھیں، گول کلائی میں مدور خم پڑتا تھا۔ جیسے جھیل کی نازک سطح پر ایک چھوٹا سا بھنور، لمبی، مخروطی اُنگلیوں کے گداز پوروں میں بھی یہی مدور خم تھے، اور شیام کو احساس ہوا جیسے وہ ان بھنوروں میں تیر کر ڈوب جائے گا۔ شیام نے ونتی کی طرف دیکھا اور ونتی نے اُس کی طرف لیکن دونوں خاموش رہے، بعض اوقات کچھ کہنا بے کار ہوتا ہے۔

اب وہ قافلے سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کھانا لے جانے والے اور سامان اٹھانے والے نوکر بھی آگے جا چکے تھے گھوڑے آہستہ آہستہ سر جھکائے چل رہے تھے، سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ شیام نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن مشرقی آسمان پر روشنی بڑھ گئی تھی اور سلسلہ ہائے کوہ کی افقی لکیر کے پیچھے نور اُبلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

شیام بولا۔ "اب کوئی دم میں سورج نکلا چاہتا ہے اور پھر یہ خوبصورت صبح ختم ہو جائے گی۔"

ونتی خاموش تھی، گردن بلند کئے قافلے کی طرف دیکھ رہی تھی یا شاید کہیں اور دیکھ رہی تھی، لیکن اُس کی طرف نہ دیکھ رہی تھی، اس کی بلند گردن کی نازک سپیدی، وہ حسین خم، جیسے کسی نورانی ہالے کا کنارہ، جیسے پہلے دن چاند کی قوس، شیام کے گلے میں پھر کوئی چیز رکنے لگی۔

گھوڑے خاموشی سے چلتے رہے۔ ساتھ ساتھ پھر شیام نے آہستہ سے اپنا ہات آگے بڑھا کر ونتی کا ہات اپنے ہات میں لے لیا۔ اور سورج نکل آیا۔ جس طرح سورج نکلتے وقت شرقی آسمان کا سنہرا نور آہستہ آہستہ سارے آسمان پر پھیل جاتا ہے، شیام نے اسی طرح ونتی کے رخساروں کی لالی کو سارے چہرے پر پھیلتے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے کانپنے لگے، اور شیام کو احساس ہوا جیسے کوئی طائر دیودار کی ٹہنی کے آخری کنارے پر بیٹھا مائل پرواز ہے۔ جس طرح اُس وقت سورج نے

وادی کو اپنے نور سے معمور کر دیا تھا، اُسی طرح خود شیام کی روح میں ونتی کے ہات کا لطیف، نرم گداز لمس اک سنہری نور کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ اور شیام کچھ کہہ نہ سکا، کچھ سوچ نہ سکا، جیسے سارے احساس اسی نور میں گھل گئے تھے اور چاروں طرف نور ہی نور تھا نور اور خاموشی، خاموشی اور نور، دونوں ایک دوسرے کی بازگشت معلوم ہوتے تھے۔

گھوڑے خاموشی سے چلتے رہے، ساتھ ساتھ، دونوں ہات اس طرح ملے ہوئے تھے، کہ شاید اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہ کر سکے گی، دونوں ہاتوں میں ایک ہی رو چل رہی تھی، جو اُن کے جسموں میں سما رہی تھی۔ دونوں ہاتوں میں ایک ہی ندی کی روانی تھی ایک ہی گیت کی لے اور وہ یہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ ایک ہات کہاں شروع ہوتا ہے اور دوسرا ہات کہاں ختم ہوتا ہے۔ ایک میں دوسرا اور دوسرا پہلے کے اندر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دو ستارے دو مختلف محوروں پر گھومتے گھومتے ایک دوسرے پر منطبق ہو گئے تھے، اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ستارہ یہ ہے اور یہ وہ۔

گھوڑے خاموشی سے چل رہے تھے پھر دونوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسرت بھری نگاہوں سے دیکھا، جیسے دونوں کے دلوں میں ایک ہی خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ انہیں بھی گھوڑے تیزی سے دوڑا کر قافلے کے ساتھ مل جانا چاہئیے۔

اور انہوں نے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیئے، گھوڑے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ، گردن کے ساتھ گردن، کاٹھی کے ساتھ کاٹھی، ران کے ساتھ ران۔ اور اُن کے ساتھ دونوں گھڑ سواروں کی متواتر متناسب حرکت، یکایک ونتی کا گھوڑا ایک تنی ہوئی کمان کی طرح ہوا میں کھڑا ہو گیا، اور شیام نے اُسی وقت اُسے منہ کے قریب لگام سے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو، چھوڑ دو اسے۔" ونتی نے کہا۔ "میں اس کمبخت کو ابھی ٹھیک کئے دیتی ہوں۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کو ایک زبردست ایڑ لگائی، اور دو تین چابک رانوں اور پیٹ کے درمیان کی نازک جگہ پر لگائیں، اور گھوڑا تیر کی طرح ہوا کو چیرتا ہوا سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔

چند لمحوں کے لئے شیام اس مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھتا رہا پھر اُس نے بھی گھوڑے کو چابک لگایا۔

اور ایک دوسرے کے بعد گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے قافلے سے جا ملے۔

اُس کی والدہ ذرا متفکر لہجے میں بولیں۔ "کبھی تم گھوڑا دوڑانے کے لئے آگے چلے جاتے ہو، کبھی پیچھے ہو جاتے ہو، کہیں اس گھڑ دوڑ کے شوق میں اپنی ٹانگ یا بانہہ نہ توڑ بیٹھنا، پہاڑی سڑک ہے

اور ادھر نیچے دیکھو، کتنی گہری کھڈ ہے میرے تو دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ونتی کو کیا شوق چرایا ہے مردوں کی طرح گھوڑا دوڑاتی پھرتی ہے۔ کہیں گر کر چہرے پر کوئی زخم آ گیا، یا اگر ناک واک بیٹھ گئی، یا ٹیڑھی ہو گئی تو اچھا خصم بھی نہ ملے گا بیٹی۔"

سب لوگ ہنسنے لگے، چھایا بولی۔ "میری بیٹی کو شروع ہی سے گھوڑے کی سواری کا شوق رہا ہے۔ اس کے باپ نے ہمیشہ اس کے لئے گھوڑا یا خچر رکھا ہے اور میں نے بھی اس کا شوق ہمیشہ پورا کیا ہے۔ اب تو خیر سے جوان ہو گئی ہے اور اس نے خود ہی یہ کھیل چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جب یہ لڑکی تھی، تو ہائے میری توبہ، دن رات گھوڑے کی پیٹھ سے لگی رہتی تھی، ایک تو گھوڑا دوڑانے کا اُسے شوق تھا، دوسرے اونچے اونچے درختوں پر چڑھنے کا۔ کتنا ہی اونچا، ٹیڑھا میڑھا، خطرناک درخت کیوں نہ ہو، یہ اُس پر گلہری کی طرح چڑھ جاتی تھی۔"

چھایا ایک مادری غرور سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی، جس کا چہرہ شعلے کی طرح دہک رہا تھا، اور سینہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

شیام روی اور نمی کے ساتھ ہو گیا، اور اُن کے قریب جھک کر کہنے لگا، "کہو ونتی بہن گلہری، ونتی بہن گلہری۔"

اور دونوں بچے خوشی سے چلاتے ہوئے کہنے لگے "ونتی بہن گلہری ونتی بہن گلہری۔" اور ونتی مصنوعی غصے سے شیام کی والدہ سے کہنے لگی۔ "ماں جی، دیکھونا، یہ روی نمی کو سکھا کر مجھے گالیاں دلوا رہے ہیں۔" اور پھر وہ روی اور نمی کی طرف ہات ہلا کر بولی۔ "تمہیں پیٹوں گی، ٹھہرو تو سہی۔"

اور روی اور نمی پہلے سے بھی زیادہ خوشی سے چلانے لگے۔ "ونتی بہن گلہری ونتی بہن گلہری۔"

"نا بیٹا۔" والدہ نے ایک میٹھے، تہدیدی انداز میں کہا۔ "بڑی بہن کو گلہری نہیں کہا کرتے۔"

اور وہ کچھ عرصہ قافلے کے ساتھ رہنے کے بعد گھوڑے دوڑا کر آگے نکل آئے تھے، دھوپ کھل گئی تھی، لیکن ابھی خوشگوار معلوم ہوتی تھی، یہاں راستہ ناہموار تھا۔ کبھی ڈھلانیں آ جاتیں، کبھی اونچی گھاٹیاں، کبھی راستہ اتنا تنگ ہو جاتا کہ ایک وقت میں صرف ایک گھوڑا ہی چل سکتا، دوسرا گھوڑا آہستہ آہستہ پیچھے آتا۔ راستے کے دونوں طرف گھاٹیوں پر بھیکڑوں کی جھاڑیاں

اُگی ہوئی تھیں۔ یقیناً یہ راستہ اچھا نہ تھا۔

ونتی نے کہا۔ "مجھے پیاس لگی ہے۔"

شیام نے ادھر اُدھر دیکھا، چاروں طرف بھیکڑوں کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اور جہاں بھیکڑوں کی جھاڑیاں ہوں، وہاں پانی کا چشمہ مشکل سے ملتا ہے کہنے لگا۔ "ادھر، قریب تو مجھے کوئی چشمہ نظر نہیں آتا۔"

اور نیچے، وادی میں بہتی ہوئی ندی ایک نقرئی فیتے کی طرح چمک رہی تھی، ونتی کی نگاہ غیر ارادی طور پر پانی کی اُس لکیر کی طرف گھوم گئی۔ بولی۔ "بہت پیاس لگی ہے۔"

شیام بولا۔ "آؤ، ذرا گھوڑے تیز کر لیں آگے چل کر کہیں کوئی نالہ یا چشمہ مل جائے گا۔"

راستہ اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔ وادی کے دامن میں درختوں کے جھنڈ، دھان کے کھیت، بہتی ہوئی ندی، اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے آدمی بہت چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

ایک نالہ ملا۔ لیکن اس میں صرف نیلے پتھر چمک رہے تھے۔ نیلے پانی کی چمک غائب تھی، آگے بڑھے ایک کسان نظر آیا۔ شیام نے پوچھا "بھئی، یہاں کوئی چشمہ قریب ہے۔"

کسان بولا۔ "یہ راستہ چھوڑ کر اس گھاٹی کے اوپر کوئی دو سو گز اوپر چلے جاؤ۔ وہ جہاں چیڑھ کا درخت کھڑا ہے، جہاں جھاڑیوں کا جھنڈ سا نظر آتا ہے وہ دیکھا تم نے۔"

"ہاں" شیام نے سر ہلایا۔

"بس، اُس کے نیچے پانی کا چشمہ ہے۔"

پھر اُس نے ونتی کی طرف دیکھا پھر شیام کی طرف پھر جیسے اُس نے اُن کے چہروں کے بعد اُن کے کپڑوں پر نگاہ ڈالی، اور اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ شیام نے محسوس کیا، جیسے اُس نے کسان کے چہرے پر ایک نظر نہ آنے والا تاریک سا غبار پھیلتے دیکھا ہے کسان بولا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

شیام بولا "پیر کا میلہ دیکھنے۔"

کسان نے کہا۔ "حضور راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ راستہ تو اوپر کے ایک گاؤں کو جاتا ہے۔ دراصل راستہ نیچے رہ گیا ہے، خیر کوئی بات نہیں آپ چشمے پر جا کر پانی پی لیں پھر آپ اسی راستے پر

تھوڑی دور اور اوپر جائیے گا۔ اُس کے بعد آپ کو ایک پگڈنڈی اسی راستے سے نیچے جاتی ہوئی ملے گی، آپ اُس پگڈنڈی پر چلے جائیے گا نیچے نیچے آپ صحیح راستہ پر پہنچ جائیں گے۔ سلام حضور۔"

"سلام۔"

کسان چلا گیا، وہ دونوں گھوڑوں سے نیچے اُترے اور گھوڑوں کی باگیں اپنے ہاتوں میں لئے گھاٹی کے اوپر چڑھنے لگے۔ آہستہ آہستہ ونتی پیاس سے نڈھال معلوم ہوتی تھی۔

چیڑھ کے درخت نیچے ایک پیالہ نما ڈھلوان میں چشمہ بہہ رہا تھا یہاں سنبلوؤں کی جھاڑیوں پر نیلا دھاری کی بیلیں لہرا رہی تھیں گھنی، ٹھنڈی جھاڑی تھی۔ اور چشمے کے کنارے کنارے نیلے نیلے پھولوں کے ستارے کھلے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی آنکھوں میں طراوت آنے لگی۔

ان دونوں نے پانی پیا، پھر دونوں چشمے کے کنارے مخملیں گھاس پر ستانے لگے، ونتی نے پاؤں پھیلا دیئے اور اپنی باہیں سر کے نیچے رکھ کر سبزے پر لیٹ گئی۔ اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

شیام نے کہا۔ "اُس طرح نہ لیٹو تمہارے جوڑے میں سجی ہوئی ترناری کے پھولوں کی کہکشاں ٹوٹ جائے گی۔" وہ اپنی آواز سن کر بڑا حیران ہوا۔ اُسے احساس ہوا جیسے یہ اُس کی آواز نہ تھی، بلکہ کسی اور مرد کی۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "کوئی پروا نہیں اور بن جائے گی۔"

کہیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی بلبل نغمہ زن تھی، وہ اس نغمے کو نہ سننا چاہتا تھا لیکن یہ نغمہ جیسے آپ ہی آپ اس کے لاشعور میں تیرنے لگا، جیسے اس کے لاشعور کی جھاڑی میں لاکھوں بلبلیں نغمہ سرا ہو اٹھیں۔

ونتی بدستور سبزے پر لیٹی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں بند تھیں، اور اس کی مدھم سانس کے ساتھ اُس کی چھاتیاں ہل رہی تھیں۔۔۔

شیام نے اپنی ساری توجہ چشمے کے کنارے کھلے ہوئے نیلے پھولوں کی طرف منعطف کر دی، ان پھولوں کا کیا نام تھا۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں، خوبصورت جیسے، نہیں نہیں، اب کوئی جیسے نہیں، وہ کسی ایسی چیز کا خیال نہیں کرے گا۔ یہ پھول خوبصورت تھے بس خوبصورت تھے اور کوئی ایسے ویسے، جیسے نہیں، جیسے اُس کے دل میں لاکھوں دھڑکنیں ایک دم سے پیدا ہونے لگیں، اور وہ اپنے دل سے کہنے لگا مجھے کچھ اور سوچنا چاہئیے۔ مجھے کچھ اور سوچنا چاہئیے۔ ان پھولوں کا کیا نام

ہے؟ ان پھولوں کا کیا نام ہے۔ کمبخت وہ ان پھولوں کا نام ہمیشہ بھول جاتا تھا اس نے کہا۔ "ان نیلے پھولوں کا کیا نام ہے۔"

اور اُسے اپنی آواز پھر بہت عجیب معلوم ہوئی، اور اُس کے لاشعور میں لاکھوں نیلے نیلے پھول کھلنے لگے......

ونتی نے اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں بند کئے ایک گہری مدھم، شہد آگیں آواز میں کہا۔

"انجوں۔ انجوں کے پھول ہیں یہ۔"

یہ انجوں کے پھول تھے، یا لاکھوں ستارے تھے یا لاکھوں خلخالوں کے سریلے نغمے تھے یا لاکھوں شراروں کے دہکتے ہوئے موتی تھے۔

یکا یک اُس نے اپنے آپ کو ونتی پر جھکتا ہوا محسوس کیا۔

"ونتی۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

ونتی اُسی طرح لیٹی تھی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا، ہاں اُس کے سانس کی لَے تیز ہونے لگی، رخساروں پر گھنی پلکوں کی صف کانپنے لگی، لبوں کی پنکھڑیوں کے کونے لرزنے لگے، اور وہ ونتی پر اور بھی جھک گیا، اور اپنے لب اُس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ اُس کے ہونٹوں کے کانپتے ہوئے کونوں پر، اُس کی خمیدہ ٹھوڑی پر، اُس کی مرمر اور بلور جیسی نازک گردن کی قوس پر، جہاں ایک رگ سپید جلد کے اندر پھڑ پھڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جیسے کسی دیودار کی شاخ کے آخری کنارے پر کوئی بلبل مائل پرواز ہو۔ اور اُس نے اس رگ کو بار بار چوما، اور ہر بار اس کے اندر ایک آگ کا طوفان بلند ہوتا گیا، اور وہ چومتا گیا، اور پھر اُس نے اس جگہ کو اپنے دانتوں سے ایک بار ہلکا سا کٹکٹا کر چھوڑ دیا۔ رگ اُسی طرح پھڑک رہی تھی، بلبل اسی طرح مائل پرواز تھی۔ لیکن سپید جلد کے اوپر ایک یاقوتی نقطہ سا نظر آرہا تھا۔۔۔ یاقوتی نقطے۔۔۔ سرخ ستارے۔۔۔ نیلے پھول خلخالوں کے گیت۔۔۔

دور وادی کے پار گھاٹی کے سبزے پر پگڈنڈی کی نازک اُنگلیاں نیلم کی رگوں کی طرح درخشاں نظر آرہی تھیں، اور دھند کا لطیف غبار درختوں کی سبز چوٹیوں پر پھیلتا جا رہا تھا، کسی عورت کی نازک اُنگلیوں کے نرم، لطیف، گداز لمس کی طرح۔۔۔

شیام کی والدہ نے اپنے بیٹے کو تشویشناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنا عرصہ تم کہاں رہے؟''

چھایا بولی۔ ''اور تم تو ہم سے آگے نکل آئے تھے۔ اور اب پیچھے سے چلے آرہے ہو؟''

شیام نے کہا۔ ''موسی، وہ بات یوں ہوئی، کہ ہم راستہ بھول گئے، اور ایک غلط پگڈنڈی پکڑ کر دور اوپر گھاٹی پر چلے گئے وہاں اگر ہمیں ایک کسان نہ ملتا تو نہ معلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے، بھلا ہو اس کسان کا۔''

شیام کی والدہ کو یقین آگیا، بولی۔ ''ہاں تبھی، تو میں حیران ہو رہی تھی کہ یہ کیا ہم سے آگے نکل گئے تھے، اور اب پیچھے چلے آرہے ہیں۔'' پھر وہ تہدیدی انداز میں بولی۔ ''ان پہاڑی راستوں کا کوئی سر پیر تو ہوتا نہیں، اس لئے اکیلے آگے جانا اچھا نہیں، ساتھ ساتھ اکٹھے چلنا ٹھیک ہے۔''

شیام نے بھولپن سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ماں جی۔''

اور اب وہ سب لوگ اطمینان سے ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے، شیام کبھی کبھی نظر چرا کر ونتی کی طرف دیکھ لیتا، جو اس ساری گفتگو کے دوران میں خاموش رہی تھی۔ وہ جب کبھی ونتی کی طرف اپنی شریر شوخ نگاہوں سے تاکتا، ونتی کا منہ لال ہو جاتا، اور وہ گھبرا کر اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیتی جیسے وہ اس یاقوتی نقطے کو چھپانا چاہتی ہے، جو اتنا مہین، باریک اور چھوٹا تھا، کہ جب تک کوئی خود قریب سے اور غور سے ونتی کی گردن لو نہ دیکھتا وہ کسی کو نظر نہ آسکتا تھا لیکن ونتی کو بار بار یہ احساس ہوتا جیسے سب لوگ اُس یاقوتی نقطے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر چھایا شیام کی والدہ اس سے کوئی بات کرتیں، یا قافلے کا دوسرا فرد یونہی سرسری طور پر اُس کی طرف اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیتا، تو بے

اختیار اس کا ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھتا۔ ونتی کو وہ یاقوتی نقطہ اپنی گردن پر ایک شرارے کی طرح جلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اب راستے میں اُنہیں کسانوں کے قافلے ملنے لگے۔ قافلے جو بہت سویرے اپنے گاؤں سے چلے تھے، ان میں سے اکثر کسانوں نے اپنی جوتیاں بغل میں داب رکھی تھیں، ہاتھوں میں مضبوط چھڑیاں تھیں، آنکھوں میں کاجل، کھدر کے تہد اور کھدر کی قمیص پہنے تھے، سر پر کھدر کی گول ٹوپیاں، یا پگڑیاں، جن کا سیاہ شملہ ایک بانکے انداز میں باہر نکلا ہوا تھا۔ ان ٹولیوں میں عورتیں بھی شامل تھیں، وہ عموماً مردوں کے پیچھے پیچھے الگ چلتی آرہی تھیں، تقریباً ہر ایک قافلے کے ساتھ ڈھول ہوتے تھے۔ ڈھول یا شہنائیاں، بنسلیاں، الغوزے، ترنے، لیکن ڈھول تقریباً ہر ایک قافلے کے ساتھ تھے۔ کسان لوگ گیت گاتے چلے جارہے تھے۔ اور اگر مرد چپ ہو جاتے تو عورتیں گیت شروع کر دیتیں، اور گیتوں کی آواز اور ڈھولوں کی آواز، اور شہنائیوں، بنسلیوں، الغوزوں، ترنوں کی مختلف آوازیں وادی کی گھاٹیوں، ڈھلانوں، کھیتوں اور ندی نالوں میں گونج جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی کسان نوجوان یا طرحدار لڑکا اپنی خوبصورت گھوڑی کو دلکی چلاتا ہوا اُن کے قریب سے گزر جاتا، اور پیدل چلنے والے کسان اُس کی گھوڑی کو سراہنے لگتے۔ ''اے جوان بڑی بانکی گھوڑی ہے، کیا مول ہے اس کا۔''

اور نوجوان دلکی چلاتے جواب دیتا۔ ''اوجنے، یہ گھوڑی بکاؤ نہیں۔'' یا کہتا ''میں نے اس پر دس بیسی خرچ کئے تھے۔'' (عام طور پر کسانوں کو بیس تک گننا آتا ہے اس کے بعد وہ پھر ایک سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً اگر کسی کسان سے عمر پوچھئے، تو اول تو وہ کہے گا مجھے پتہ نہیں صاحب۔ یہ لوگ اپنی عمر بتانے سے ہچکچاتے ہیں، غالباً سوچتے ہیں، کہ افسر لوگ ہیں شاید کہیں عمر پر بھی مالیہ نہ لگادیں، کسان کو ہمیشہ افسر لوگوں سے ڈر لگا رہتا ہے۔ اور اگر زیادہ اصرار کرنے پر اس نے بتا بھی دیا تو یوں کہے گا صاحب میری عمر کوئی دو بیسی ہوگی یعنی چالیس برس یا پانچ اور تیس یعنی پچیس، سرکار کو مالیہ دیتے وقت بھی اسی گنتی سے کام لیتے ہیں اور اپنا اناج تولتے وقت بھی یہی گنتی اُن کے کام آتی ہے، مہاجنوں سے لین دین کے وقت بھی اسی گنتی کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مہاجن اس گنتی سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتا ہے۔)

عورتوں نے سوسی کے دوپٹے اوڑھ رکھے تھے، نیلی یا کالی چھینٹ کی، قمیص اور چھینٹ کی

شلواریں یا سفید کھدر کے دوپٹے جن پر کالی یا سرخ گور لگی ہوئی تھی، اور پھول دار سوسی کی قمیص اور شلوار، صرف تین رنگ نظر آتے تھے نیلا، کالا اور سرخ، کیونکہ سفید کوئی رنگ نہیں ہے۔ جو نوجوان عورتیں تھیں، انہوں نے عموماً سرخ لباس زیب تن کیا تھا۔ ادھیڑ یا بوڑھی عورتیں عموماً نیلا یا کالا رنگ پسند کرتی تھیں، عورتوں کے ہاتھوں میں چاندی یا "کھوٹ" کے کڑے تھے، یہ "کھوٹ" وہاں کے سنار خاص طور پر ان عورتوں کے زیورات کے لئے تیار کرتے تھے۔ اس میں تانبا، جست، پیتل، لوہا، ہر قسم کی دھات استعمال ہوتی تھی اور جب زیور تیار ہو جاتا تھا تو اُس کے اوپر سنار چاندی کا ملمع کر دیتے تھے۔ بس یہی "کھوٹ" کے زیور تھے اس۔ "کھوٹ" کے زیور عموماً کسان عورتیں پہنتی تھیں، کڑے اور کانوں کی بالیاں، اور گلے کی ہنسلیاں، جو عورتوں کے گلے میں بھی ڈالی جاتی ہیں، اور گھوڑیوں اور بھینسوں کے گلے میں بھی، اور شیام کو یکایک یاد آیا کہ یہاں کے بہت سے کسان لوگ اپنی باتوں میں عورتوں کو "گھوڑی" کے لقب سے پکارتے تھے۔ اور کسی طرحدار عورت کو اپنے قریب سے گزرتے وقت اُس نے کئی دفعہ کسانوں کے منہ سے سنا تھا۔ "واہ کیا عمدہ گھوڑی ہے، کیا بانکی چال ہے، سو بیسی سے کم کی تو کیا ہوگی۔" شیام کو کچھ اس سے بھی پتہ چلا تھا کہ ہندوستانی سماج میں جس کے بیشتر افراد کسان ہیں عورتوں کی سوشل حیثیت کیا ہے اور یہ سوشل حیثیت اس امر سے اور بھی واضح ہو جاتی تھی کہ کسان لوگ اپنی عورتوں کے لئے بھی وہی زیور بنواتے تھے، جو وہ اپنی گھوڑیوں اور بھینسوں کے گلے میں ڈالتے تھے، اور شادی کے لئے بھی اُنہیں اسی طرح بیچتے تھے، جس طرح گھوڑیاں اور بھینسیں بیچی جاتی ہیں، اور پھر شیام کو خیال آیا، کہ خود اُس کے طبقے میں، اور اُس سے اوپر کے طبقے میں بھی تو یہی خرید و فروخت ہوتی تھی، اور گو سبھی ہندوستانی طبقوں میں عورت کی زبوں حالت تھی، لیکن شاید کسانوں اور مزدوروں کے طبقوں میں باقی طبقوں سے بہتر تھی، کیونکہ یہ عورتیں کھیتی باڑی کے کام میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں، آزادانہ طور پر، عورتیں ہل چلاتی تھیں، تلائی کرتی تھیں، دھان کے کھیتوں میں پانی دیتی تھیں، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتی تھیں، فصل کاٹتی تھیں، ریوڑ چراتی تھیں، ان کے علاوہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بچے جنتی تھیں، بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو شاید کسان عورتیں کسان مردوں سے زیادہ کام کرتیں تھیں۔ انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا اسی لئے شیام نے ان عورتوں میں ایک خاص نوع کی آزادی اور خود اعتمادی دیکھی تھی، جس کی جھلک اسے دوسرے طبقوں کی عورتوں میں شاذ ہی ملتی تھی۔

ان عورتوں کے زیور بڑے بڑے اور بھدے تھے، اور ذوق لطیف پر گراں گزرتے تھے، لیکن ایک زیور تو شاید کسی حد تک شیام کو بھی بھایا۔ یہ ناک کی طلائی بندی تھی، یہ یا تو سونے کی ہوتی ہے یا اس پر سونے کا پانی چڑھا ہوتا ہے، اور بہت مرصع ہوتی ہے۔ کسان عورتوں کو اپنی طلائی بندی بہت پیاری ہوتی ہے، اور گاؤں کے سنار بھی اپنا سارا جمالیاتی ذوق اس بندی کو بنانے میں صرف کر دیتے ہیں، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عموماً ان کسان عورتوں کی ناک تلوار کی دھار کی طرح ستواں ہوتی ہے، اور یہ طلائی بندی، جس کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے سے دائرے سے بنے ہوتے ہیں، ناک کے خط مستقیم کو اور بھی واضح کر کے اپنے تقابل سے عورت کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں اس کا ذوق صحیح نہ تھا۔ بہر حال اُسے یہ طلائی بندی بہت پسند آئی تھی۔

غلام حسین بولا۔ "صاحب، جہاں پیر کا میلہ لگتا ہے، وہاں سے دو ڈھائی کوس پرے ایک اور قابل دید جگہ ہے، اُسے "رام کنڈ" کہتے ہیں۔ براہمن لوگ کہتے ہیں کہ جب رام چندر جی اپنے چودہ سالہ بن باس میں ہندوستان کے مختلف جنگلوں میں گھومتے رہے تھے، وہ یہاں بھی آئے تھے۔ صاحب، وہ جگہ بھی دیکھنے کے لائق ہے، اور میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر آپ لوگ پہلے وہاں تشریف لے چلیں، اس کے بعد واپس آکر میلے کی رونق دیکھیں۔"

شیام کی والدہ بولی۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے، ابھی تو لوگ میلے میں اکٹھے ہو رہے ہیں، چلو پہلے ہم وہ تیرتھ دیکھ آئیں۔"

اور شیام سوچنے لگا کیا شری رام چندر شمالی ہند کے جنگلوں میں بھی گھومتے رہے تھے۔ اُس نے تو یہی سنا تھا کہ وہ اپنے بن کے زمانہ میں کوہ بندھیاچل سے اوپر کہیں نہ گئے تھے۔ بلکہ دریائے گوداوری سے نیچے کے علاقوں میں گھومتے رہے تھے۔ پھر اُس نے سوچا ممکن ہے وہ بن باس سے پہلے یہاں آئے ہوں، یا بن باس کے بعد۔ بہر حال اس نے سوچا کہ اس معاملے کے متعلق مزید غور کرنا بے کار ہے۔ ہر ایک قوم کی دیومالا، اور اُس کے مذہبی اصنام کی تخلیق میں اعتقاد، خوش فہمی، اور تخیل کو زیادہ دخل ہوتا ہے، ایک حقیقت ہوتی ہے، ٹھوس، تلخ، دنیاوی، ایک شاعرانہ سچائی ہوتی ہے، اور اس زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں کبھی ایک کبھی دوسرے اور کبھی دونوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ "رام کنڈ" کا چھوٹا سا تیرتھ بہت خوبصورت تھا۔ ایک ننھی

سی وادی میں جو چاروں طرف اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی، ایک بلند و بالا چٹان پر ایک پرانا مندر کھڑا تھا۔ پتھروں کی بڑی سلوں سے یہ مندر تیار کیا گیا تھا۔ اور اس کے بہت پرانا ہونے کی یہ وجہ نہ تھی، کہ پتھروں کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ یا اُن کی جلد بھر بھری ہو گئی تھی۔ یا اُن پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ یہ سب باتیں وہاں تھیں لیکن ان کے علاوہ اس مندر کی تعمیر میں ایک بات تھی۔ جس نے شیام کو یقین دلا دیا، کہ یہ مندر واقعی بہت پرانا تھا، اور یہ بات تھی کہ اس مندر کی تعمیر میں کہیں بھی چونا یا گچ یا سرخی سے کام نہ لیا گیا تھا۔ پتھر کی بڑی بڑی سلیں اس صفائی سے ایک دوسرے پر جمائی گئی تھیں کہ کہیں سوئی کی نوک بھی نہ گزر سکتی تھی، اس کے علاوہ مندر کا کلس بھی پتھر کا تھا۔ اس مندر کی عمر ایک ہزار برس سے کم معلوم نہ ہوتی تھی۔

مندر کے آنگن میں چٹان کو کاٹ کر دو کنڈ بنائے گئے تھے۔ یہ کنڈ بہت گہرے تھے، اور ان میں دور تک نیچے چاروں طرف پتھر کی سیڑھیاں بنی تھیں، اور یہ سیڑھیاں، اور یہ دونوں کنڈ، ایک ہی چٹان، ایک ہی پتھر ایک ہی سل کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ اس چٹان کی چھاتی میں سے ایک مصفا پانی کا چشمہ ابل رہا تھا جس نے ان دونوں کنڈوں کو پانی سے معمور کر دیا تھا۔ دایاں کنڈ بائیں کنڈ سے بڑا تھا اور دونوں شفاف پانی سے بھرے ہوئے چھلک رہے تھے۔ بڑے کنڈ کو رام کنڈ کہتے تھے، چھوٹے کو لکشمن کنڈ۔ دونوں کنڈ ساتھ ساتھ تھے کیونکہ رام، لکشمن دونوں بھائی بھائی تھے، اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ رام کنڈ لکشمن کنڈ سے بڑا تھا۔ کیونکہ رام بڑے بھائی تھے اور لکشمن چھوٹے۔ ان دونوں کنڈوں کے ایک طرف چٹان کو کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں، یہ سیڑھیاں نیچے کو جاتی تھیں، یعنی چٹان کے بیچ میں، یہاں بہت اندھیرا تھا، اور وہ سب لوگ نہایت آہستہ آہستہ اُتر رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا گیا، سب سے آگے چھایا تھی۔ اُس نے اس سے پہلے بھی یہ تیرتھ دیکھا تھا۔ اور اب وہی اس قافلے کی رہنما بنی، انہیں یہاں کے مختلف مناظر دکھا رہی تھی۔ چھایا کے بعد شیام کی والدہ چل رہی تھیں، اور انہوں نے روی اور نمی کو اپنے دونوں طرف ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا، اور نہایت احتیاط سے پتھر کی فراخ سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہوئے نیچے اُترتی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ونتی، لاپرواہی سے، لاابالیانہ انداز میں نیچے اُترتی جاتی تھی، ونتی کے بعد شیام سب سے آخر میں تھا، یکایک گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا، اور شیام نے ونتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

روی اور نمی چلا اٹھے۔ "یہاں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔"

چھایا نے ماچس جلائی، شیام نے جلدی سے ونتی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ مسکرانے لگی۔ ماچس کی روشنی میں ان لوگوں نے دیکھا، کہ چٹان کے اندر ایک بڑا کمرہ ہے، جس کے بیچوں بیچ ایک کنڈ بنا ہے سیاہ اور خاموش پانی سے لبالب بھرا ہوا۔ چاروں طرف تاریکی تھی، اور ایک عجیب سی اُداسی، جہاں رام اور لکشمن کنڈ تھے، وہاں روشنی تھی اور نیلا آسمان، اور جاتریوں اور پجاریوں کے قہقہے، لیکن یہاں پہنچ کر ایک عجیب سی ہیبت دل پر طاری ہو جاتی تھی، اور سب جاتری خاموش ہو جاتے تھے۔

دیا سلائی بجھ گئی تھی، گہرا اندھیرا چھا گیا، شیام نے اپنا ہاتھ ونتی کی کمر میں ڈال دیا۔

چھایا کی آواز اس چٹان کے تاریک تہ خانے میں گونج اٹھی۔ "یہ سیتا کنڈ ہے۔"

دیا سلائی جلانے کی آواز آئی، اور شیام نے جلدی سے اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔ ونتی ہنسنے لگی۔

چھایا نے اُسے گھور کر دیکھا کہنے لگی۔ "ہائے میری توبہ، آج کل کی لڑکیاں کیسی ہیں، اس پوتر استھان پر آکر بھی ہنسنے سے باز نہیں رہتیں۔ اگر تجھے اس کے سیتا کنڈ ہونے میں کوئی شبہ ہے، تو اس شبہ کو اپنے پاس رکھ، لیکن تجھے یہاں ہنسنا تو نہ چاہیئے۔"

ونتی اپنی ہنسی کو ضبط کرنے لگی۔

شیام نے کہا۔ "موسی، یہ آج کل کی لڑکیاں۔۔۔ توبہ خدا ان سے بچائے۔ ہم تو بھئی کان پکڑتے ہیں۔ دھرم کا تو انہیں کچھ خیال ہی نہیں ۔"

اور ونتی پھر زور سے ہنسنے لگی دیا سلائی بجھ گئی، اور کمرے میں پھر اندھیرا چھا گیا، اور اس لئے کوئی نہ دیکھ سکا، کہ چھایا کو اس بے موقع ہنسی سے کتنا غصہ آگیا تھا۔

اب کے شیام نے کوئی شیطانی حرکت نہ کی دیا سلائی پھر جلی۔

چھایا نے کہا۔ "کہتے ہیں کہ اس کنڈ کی کوئی تھاہ نہیں۔ کئی غوطہ خوروں نے اس کنڈ کی تھاہ کا پتہ لگانا چاہا۔ لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہے ہیں، اس گہرے کنڈ کا پانی چٹان میں سے رستا ہوا اوپر کے دونوں کنڈوں میں جاتا ہے جنہیں رام اور لکشمن کنڈ کہتے ہیں۔۔۔'

شیام کی والدہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں "دھنیہ ہو سیتا دیوی تم دھنیہ ہو۔"

دیا سلائی کی مدھم روشنی میں سیتا کنڈ کا پانی اور بھی تاریک نظر آنے لگا۔ ساری فضا میں ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی، اور جب دیا سلائی بجھ گئی، تو یہ اُداسی اور بھی بڑھ گئی اور سناٹا گہرا ہو گیا۔ صرف جاتریوں کے سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی، شیام کے سارے جسم میں ایک

جھرجھری سی آئی، تو یہ سیتا کنڈ تھا۔ رام اور لکشمن کنڈ دن کے اُجیالے میں تھے، لیکن سیتا کنڈ پر رات کی ہولناک تاریکی مسلط تھی، اور اسے سیتا، دھرتی کی بیٹی کے آخری دن یاد آئے۔ وہ چودہ سال اپنے خاوند کے ہمراہ جنگلوں میں گھومتی رہی تھی وہ ایک ظالم راجہ کے چنگل میں پھنس کر لنکا کے ایک باغ میں اپنی عصمت کو بچاتی ہوئی برہ کے دن کاٹتی رہی تھی، اور جب وہ برہ کے دن پورے ہوئے، اور وہ بن باس ختم ہو گیا، تو مسرت کے چند مختصر ایام کے بعد ایک جاہل دھوبی کے کہنے پر اس کی زندگی میں پھر ایک نیا بن باس شروع ہوا، نیا، آخری، ابدی، وہ بن باس جو ایک دفعہ شروع ہو کر پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ اسی لئے تو سیتا کنڈ تاریک ہے، خاموش ہے، اُداس ہے، اتھاہ ہے۔ شیام کو احساس ہوا جیسے سیتا کنڈ میں صرف سیتا کے ہی نہیں، بلکہ سارے ہندوستانی سماج کی عورتوں کے آنسو چھلک رہے ہیں، جن کی زندگیاں صدیوں سے تاریک خاموش اور اُداس ہیں اور شیام کو اپنے احساس کی تلخی میں یہ بالکل مناسب معلوم ہوا کہ سیتا کنڈ سب سے نیچے بنایا گیا تھا، نیلے آسمان کے مسرت بھرے نور سے دور، ایک چٹان کی سنگلاخ چھاتی میں، چاروں پتھر کی دیواروں کے بیچ۔ یہاں روشنی کسی درز میں سے گزر کر بھی نہیں پہونچتی تھی۔ یہی ہندوستانی عورت کی صحیح جگہ ہے۔ سب سے نیچے، قدموں میں۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے عالم خیال میں یا حقیقت میں، اُسے پتہ نہیں، اُسے احساس ہوا جیسے وہ دھرتی کی بیٹی کی آہیں سن رہا ہے، اُس کی مدھم سسکیاں جو دھرتی کا سینہ چیر کر، اس ظالم چٹان کی چھاتی چیر کر فضا میں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ جیسے دھرتی کی بیٹی آہ و بکا کر رہی ہے۔ "میرے رام میرے رام۔"

اور یکایک شیام کو اُس کی والدہ کی آواز سنائی دی وہ مخوف لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ "سیتا دیوی تو دھنیہ ہے سیتا دیوی تو دھینہ ہے۔۔۔

بے شک سیتا دیوی دھنیہ ہے۔ اُس کی روح پر، اُس کی زندگی پر ہزار بار، لاکھوں بار سلام، کیونکہ سیتا دھرتی کی بیٹی ہی نہیں، وہ خود دھرتی ہے، عورت دھرتی ہے، وہ زندگی کا منبع ہے، وہ زندگی کی منزل ہے۔ اس کی اول، اُس کی آخر، نیچے اُوپر، اُس کی سمت کا کوئی پتہ نہیں، وہ خود تاریکی میں رہتی ہے، لیکن اس تاریکی سے وہ اُن درخشاں موتیوں کو پیدا کرتی ہے جنہیں لوگ رام اور لکشمن کہتے ہیں وہ خود اُداس ہے، لیکن وہ اور اُس کی پلکوں پر ہمیشہ آنسو کانپتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اُداس آنسوؤں کی گہرائیوں میں سے اس نورانی مسرت کے ابلتے ہوئے کنڈ کو نکال لاتی ہے، جس کا

شفاف پانی اپنی معصومیت میں نیلے آسمان کو بھی شرماتا ہے۔ وہ خود خاموش ہے لیکن اپنی گہری خاموشی کے سینے سے اس لازوال نغمے کی تخلیق کرتی ہے جس کی پنہائیوں میں انسانی زندگی کی ہر دھڑکن اپنی تمام تر صعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ سنائی دیتی ہے، اس زندگی کے خالق کو ہزاروں بار، لاکھوں بار سلام......

اور پھر یکایک شیام کو احساس ہوا جیسے وہ اس شاعرانہ سچائی کی رو میں بہتے بہتے، ٹھوس اور بدصورت حقیقت کو بھولتا جا رہا ہے، اُس نے چھایا سے کہا۔ "موسی ذرا دیا سلائی دکھایئے، واپس چلیں، یہاں کھڑے کھڑے تو لہو بھی جم جائے گا۔"

جب وہ پیر کے مقام پر پہنچے تو اس وقت میلہ اپنے پورے جوبن پر تھا۔ یہ میلہ پیر اور مدان کے گاؤں کی زیریں گھاٹی پر منعقد کیا گیا تھا۔ یہاں ایک چوڑا تلہ تھا جس کے ایک طرف خوبانیوں اور باڑیوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا۔ تلے کے مغرب میں ماندر کی ندی بہتی تھی، اور یہاں پہنچ کر اُس کا پاٹ بہت بڑا ہو گیا تھا۔ شمال مشرق میں پیر کا نالہ تھا، اور میلے کا تلہ گویا پیر کے نالے اور ماندر کی ندی کے سنگم پر واقع تھا۔ اس تلے کے ارد گرد چاروں طرف ایک پرانی شکستہ دیوار تھی، جو کسی جگہ ایک فٹ، کسی جگہ دو فٹ، کسی جگہ تین چار فٹ تک اونچی ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے جید پتھر، پتھر کی بھاری سلیں، عمارت کی ساخت وہی تھی جو اُس نے رام کنڈ میں دیکھی تھی اور اغلب تھا کہ یہ دونوں عمارتیں جو ایک دوسرے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھیں، ایک ہی زمانے میں، ایک ہی معمار کی فنی ذکاوت کا نتیجہ تھیں، دیواروں کے مٹتے ہوئے نقش و نگار، پتھر کے چوکھٹے، اور ٹوٹے ہوئے ہاتھی، پتہ دیتے تھے کہ کسی وقت اس جگہ پر کوئی عالیشان محل کھڑا ہو گا۔ اب صرف باہر کی دیوار نہایت ہی شکستہ حالت میں نظر آتی تھی۔ کہیں ایک فٹ کہیں دو فٹ اونچی، اور کہیں بالکل ہی معدوم تھی، شاید زیر زمین اُس کی بنیاد ہو لیکن کئی جگہوں پر تو صرف جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ یہ دیوار ایک بہت بڑے احاطے کو گھیرے میں لئے ہوئے تھی، جس کے اندر میلہ لگا ہوا تھا، اور ہزاروں آدمی جمع تھے، احاطے کے اندر اب ایک بہت بڑا وسیع میدان تھا، جس کے اندر کہیں کہیں محل کے بڑے بڑے ہال کمروں کی دیواروں کے نشان ملتے تھے۔

شیام نے غلام حسین اور باقی لوگوں کو ساتھ لے کر میدان کے شمال مشرقی حصے کا رخ کیا، جہاں محل کی دیواریں اب بھی چار پانچ فٹ اونچی کھڑی تھیں اس جگہ پر محل سب سے زیادہ بہتر

حالت میں موجود تھا۔ یہاں دیواریں عرض میں ڈھائی تین سو گز اور طول میں چار پانچ سو گز کے قریب تھیں اور زمین کے ایک بہت بڑے قطعے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ دیواروں کے کونوں میں دھتورے کی بڑی بڑی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور سارے احاطے میں لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس احاطے کے درمیان ایک اور عمارت کھڑی تھی، اس پر پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، اور یہ سیڑھیاں ستر، اسی فٹ تک بلند تھیں، پتہ نہیں یہ عمارت کیا تھی، لیکن اب تو صرف یہی پتھر کی سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جو ستر اسی فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں، سب سے اوپر والی سیڑھی کا زینہ ٹیڑھا ہو کر نچلے زینے سے جا لگا تھا۔ ڈر کے مارے ان سیڑھیوں پر کوئی نہ چڑھتا تھا کیونکہ ساری عمارت شکستہ حالت میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتھر کا یہ عظیم الشان زینہ جو بغیر کسی سہارے کے زمین پر کھڑا تھا کسی آدمی کے قدم رکھتے ہی گر جائے گا اور پھر اگر ان منوں بھاری جید پتھروں کی زد میں کوئی فرد آ گیا تو اُس کی ہڈی پسلی بھی باقی نہ رہے گی۔

اسی قطعے میں ایک طرف ایک اور دلچسپ چیز دیکھنے میں آئی۔ دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے سٹیم رولر کا ایک پہیہ پڑا ہے، اور اس پہیہ کے ایک سرے پر پتھر کی ایک موٹی سی ہتھی لگی تھی جب وہ قریب گیا تو اُس نے دیکھا کہ پتھر کا ایک پرانا گرز ہے لیکن اتنا بڑا گرز اُس نے اپنی زندگی میں کہیں نہ دیکھا تھا۔ پانچ دس آدمی مل کر اُسے بمشکل اُٹھا سکتے تھے۔

ایک پنڈت بولا۔ "یہ بھیم سین کا گرز ہے۔ وہ صبح کے وقت اس سے ورزش کیا کرتا تھا۔"

شیام بولا۔ "یہ کسی آدمی کا گرز تو معلوم نہیں ہوتا۔"

اور دراصل یہ گرز تھا بھی بہت بھاری، میلے پر جو بڑے بڑے پہلوان آتے تھے، وہ ہمیشہ اس گرز کو اٹھانے کی ناکام سعی کیا کرتے تھے۔ کوئی پہلوان اسے اُٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیتا تھا۔ کوئی اُسے بمشکل دھکیل سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک پہلوان نے اُسے زمین سے دو انچ اوپر اٹھا لیا تھا لیکن پتہ نہیں یہ حکایت کہاں تک سچ تھی۔

غلام حسین بولا۔ "یہ آدمیوں کا گرز نہیں ہے یہ دیوتاؤں کا گرز ہے۔ جب آپ یہ جگہ دیکھ چکیں گے تو میں آپ کو پیر صاحب کی قبر پر لے چلوں گا۔ یہ قبر اتنی لمبی ہے کہ آپ اسے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور سوچیں گے کہ کیا کبھی کوئی آدمی اتنا لمبا ہو سکتا ہے، لیکن صاحب، یہ دیوتا اور اولیاء لوگ عام آدمیوں جیسے نہیں ہوتے، یہ بڑے کراماتی بزرگ تھے۔"

شیام نے پنڈت سے پوچھا۔ "پنڈت جی، یہ تو بتایئے کہ پانڈوں کا دارالسلطنت تو دلی تھا، انہیں یہاں محل بنانے کی ضرورت کیا پڑی، کیا وہ بھی جلاوطنی کے دنوں میں یہاں آئے تھے۔"

"نہیں صاحب، پانڈو یہاں مہابھارت کی جنگ کے بعد آئے تھے، جب یدھشٹر مہاراج کا جی اس دنیا سے اکتا گیا، اور وہ اور اُن کے چار بھائی، ارجن، بھیم، نکل سہدیو اور ان کی ماتا کنتی، کیلاش پربت کو جا رہے تھے تو وہ اسی راستے سے گزرے تھے۔"

اور شیام کو یاد آیا کہ اس علاقے میں اُس نے جگہ جگہ باؤلیاں دیکھی تھیں، اور کھنڈرات، اور تمام ان کھنڈروں اور پرانی باؤلیوں کو لوگ پانڈوؤں کی تعمیر کردہ بتاتے تھے اور اُس نے سوچا، شاید پانڈو اسی راستے سے گزرے ہوں، اور پھر اُسے خیال آیا، کہ نہ صرف اس علاقے میں بلکہ کشمیر میں کانگڑے میں، اور منڈی کی ریاستوں میں جہاں جہاں بھی اس قسم کی پرانی باؤلیاں اور کھنڈر تھے، لوگ اُنہیں جھٹ پانڈوؤں سے منسوب کر دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانڈوں نے ان پہاڑوں کے مرغزاروں میں کوئی ایسا چشمہ باقی نہ چھوڑا تھا، جہاں اُنہوں نے باؤلی نہ بنائی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیلاش پربت پہنچنے کے لئے وہ اتنے بے قرار نہ تھے جتنا گاؤں گاؤں میں باؤلیاں بنانے کے لئے۔

اور کوئی اس کے دل میں کہنے لگا، اپنے قومی اصنام کی تضحیک کرتے ہو، بدنما حقیقت کو کیوں اپنی چھاتی سے چمٹا کر رکھنا چاہتے ہو، شاعرانہ سچائی کو کیوں بھول جاتے ہوں، شاید یہ سچ ہے کہ یہ باؤلیاں پانڈوؤں نے نہ بنائی تھیں، بلکہ گمنام لوگوں نے جنہوں نے یہ باؤلیاں بنا کر اُنہیں اپنے بزرگوں کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ اُن لوگوں کی طرح نہیں جو کسی یتیم خانے کو پچاس روپیہ خیرات کرتے ہیں اور اُس کی عمارت میں اپنا نام پتھر پر کھدوا لیتے ہیں۔

شیام نے پنڈت سے پوچھا۔ "پنڈت جی، یہ اونچی سیڑھیاں کس مطلب کے لئے بنائی گئی تھیں۔"

"بیٹا کہتے ہیں، کہ جب پانڈو ہستناپور سے پیدل چلتے چلتے یہاں پہنچے، تو اُن کی ماتا پر کنتی کے دل میں اپنے وطن کو دیکھنے کی خواہش اُجاگر ہوئی، اور اُس نے اُس وقت تک آگے چلنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اُس کے بیٹے اُسے اپنا میکے کا دیس نہ دکھا دیں۔ پہلے تو پانڈوؤں نے اپنی ماں کو بہت سمجھایا، لیکن جب وہ کسی طرح نہ مانی تو انہوں نے یہاں یہ محل بنوایا، جس کے کھنڈر تم اب دیکھ رہے ہو۔ اور یہ جو سیڑھی تم اوپر جاتی ہوئی دیکھ رہے ہو، یہ محل کی سب سے اوپر کی منزل پر جاتی تھی کہتے

ہیں کہ اس آخری منزل کی چھت سے پانڈوؤں نے اپنی ماں کو اس کے میکے کا دیس دکھایا تھا، اور تب وہ آگے جانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔

شیام نے سوچا ہاں ہم مرد یہ احساس نہیں کر سکتے، کہ ایک عورت کو اپنا میکہ کتنا عزیز ہوتا ہے چاہے۔ وہ بوڑھی ہو کر دنیا کو چھوڑ دے پھر بھی اپنے میکے کی یاد اس کے دل میں ہمیشہ تازہ رہتی ہے، ہمیشہ، دیہاتی گیتوں میں شاید میکے کے گیت سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔۔۔ شاید مرتے ہوئے بھی عورت کے دل میں اپنے میکے کو ایک بار دیکھ لینے کی خواہش تڑپ اُٹھتی ہے، اور وہ کنتی کی طرح چاہتی ہے کہ اُس کی نظر، ان وادیوں اور جنگلوں اور پہاڑوں کو چیر کر اپنے بابل کے دیس تک جا پہنچے۔

اور شیام اپنے تخیل کی زقند پر مسکرانے لگا اور اُس نے سوچا کہ اُس نے اپنے وطن کی دیومالا کو سمجھنے کا، اور اُسے نئی قدروں سے پرکھنے کا ایک نیا طریقہ نکال لیا تھا، ماضی کی ان حکایتوں اور داستانوں میں بھی پرانے تخیل پرستوں نے زندگی کی بنیادی سچائیوں کو خوبصورت لباس پہنا کر پیش کیا تھا۔ گاؤں میں کسانوں کے تخیل میں یہ حکایتیں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان جاہل کسانوں میں انہیں نئی قدروں سے پرکھنے والا کوئی نہیں، اور وہ ان حکایتوں کی مبالغہ آرائیوں پر ایمان لا کر گمراہ ہو جاتے ہیں، اور زندگی کی صحیح قدروں سے ناآشنا رہتے ہیں، اور شیام نے سوچا کہ وہ اپنے وطن کی دیومالا کا جسے اُس نے کوڑا کرکٹ کی طرح ناکارہ سمجھ کر پرے پھینک دیا تھا، پھر سے مطالعہ کرے گا۔ اُسے نئی قدروں سے پھر دریافت کرے گا۔ آخر کسی ملک کا ماضی بھی تو اُس کا اپنا ہوتا ہے۔ ماضی، حال، مستقبل، زندگی کے ایک ہی تسلسل کی کڑیاں ہیں، اور ماضی کو صحیح طور پر جاننے اور سمجھنے کے بغیر حال اور مستقبل کے متعلق کوئی درست لائحہ کار تیار نہیں کیا جا سکتا۔

اجاڑ کھنڈروں میں تھوڑی دیر گھومنے کے بعد وہ اُس طرف چلے گئے جہاں میلہ لگا تھا، سناروں کی دکانوں پر عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی، جو نہایت انہماک اور شوق سے "زیورات کی نمائش" ملاحظہ کر رہی تھیں، کھوٹ کی انگوٹھیاں، کڑے اور بالیاں خوب بک رہی تھیں۔ زیورات کی نمائش کرتے کرتے سنار لوگ اپنی جنسی تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتے جاتے تھے، اور کڑے، انگوٹھیوں اور بالیوں کی تعریف کرتے کرتے اپنے گاہکوں کے حسن کی بھی تعریف کر دیتے، یا کوئی ایسی دبی ہوئی چوٹ کر جاتے کہ عورتوں کے جھمگھٹوں میں قہقہے گونج جاتے۔ شیام نے دیکھا کہ ان موقعوں پر

گاؤں کی عورتیں بھی جوابی حملہ کرنے سے نہ چوکتی تھیں اور اس کھلے مذاق کو کوئی بھی برے پیرائے میں نہ لیتا تھا۔

غلام علی نے اس میلے کے لئے خاص طور پر گلٹ کے زیورات منگوائے تھے جو سونے کی طرح چمکتے تھے۔ اور جو قیمت میں بھی ازراں تھے۔ اُس کی دکان پر سب سے زیادہ جمگھٹا تھا اور انگوٹھیاں اور طلائی بندیاں، کانوں کے گجرے اور بالیاں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔
غلام علی چلا رہا تھا۔ "سونے کا مال، سونے کا مال، کوڑیوں میں جاتا ہے سونے کا مال، سونے کا مال۔"

اس کے مقابل کھوٹ کے زیورات بیچنے والا کہہ رہا تھا۔ "چاندی دے کر چاندی لو کوڑا کرکٹ نہ خریدو، چاندی دے کر چاندی لو، کوڑا کرکٹ نہ خریدو۔"

حلوائیوں کی دکان پر بڑی رونق تھی۔ شیام یہ سوچ کر بہت حیران ہوا کہ نوجوان کسان اور لڑکے جو گھر میں خالص دودھ اور مکھن استعمال کرتے تھے، یہاں بڑے شوق سے تیل یا بناسپتی گھی کی مٹھائی خرید رہے تھے، اور بڑی رغبت سے انہیں کھا رہے تھے، شکرپارے، جلیبیاں، میدے کی کھجوریں، دلپسند، پکوڑیاں، سویاں.....

بسنت رام کی دکان پر صرف تین چیزیں تھیں، کشمش، ناریل اور مکھانے، یہ تینوں چیزیں اس اطراف میں نوجوان لڑکیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔ یہاں بہت سے نوجوان کسان اپنی نوجوان بیویوں کو یہ "کھاجا" خرید کر دے رہے تھے، کبھی یہ لڑکی بیوی نہ ہوتی تھی، بلکہ محبوبہ، اور بسنت رام اب اس معاملے میں اس قدر مشاق ہو گیا تھا کہ ایک ہی نگاہ میں معاملے کو بھانپ لیتا تھا۔ بیویوں والے تو پیسے کم خرچ کرتے تھے، لیکن دوسرے جوڑوں کا تو معاملہ ہی اور تھا۔ وہ ان جوڑوں کی بڑی آؤ بھگت کرتا، انہیں مزیدار باتیں سناتا، دو چار عشقیہ شعر، جو شاید کسی زمانے میں اُردو کے شعر ہوں گے، لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے ان کی حالت اس قدر مسخ ہو گئی تھی، کہ ان کی صورت اب پہچانی نہ جاتی تھی۔
بسنت رام ایک آہ بھر کر کہتا۔ "اے نوجوان عشق بری بلا ہے، پر اگر نڈھی (لڑکی) بھی تجھ سے محبت کرے ہے، تو سمجھ کہ تو ساتویں عرش جا پہنچا ہے۔
ایک آہ بھر کر۔

"خدا اس جوڑی کو رنگ لائے، کتنے سیر مکھانے دوں،" کشمش، خالص قندہاری کشمش ہے مجے کرو جوان تجھے ایسی شکل دار نڈھی ملی ہے۔ اس کی آنکھیں کہے دیتی ہیں کہ باوفا ہو گی، دن رات تیری خدمت کرے گی کبھی تجھ سے جدا نہ ہو گی، آہ، جوان، جدائی کا ڈنک بہت برا ہوتا ہے

ہنڈلیاں بجار نے سر سام مجھے رلادیا
سویا ہوا ساں چین سیں کس نے مجھے جگادیا

اور شیام سوچنے لگا کہ دوسرے مصرع کی تو وہ تشریح کر سکتا تھا۔ "سویا ہوا تھا چین سے کس نے مجھے جگادیا۔" لیکن پہلا مصرع ابھی تک اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا ہنڈلیاں بجار نے سر سام مجھے رلادیا۔ یکا یک اُسے خیال آیا، سر سام سے شاعر کا مدعا کوئی دماغی بیماری نہ تھا۔ بلکہ غالباً "سر شام۔" لیکن بہت سوچنے اور سر ٹپکنے کے بعد بھی اُسے اس ہنڈلیاں بجار، کا مطلب سمجھ میں نہ آیا، اور وہ بازار میں ادھر اُدھر مختلف مناظر دیکھتا ہوا گھوم رہا تھا، کہ یکا یک اُس کے ذہن میں یہ مصرعہ چمک اٹھا۔ "عندلیب زار۔" ہنڈلیاں بجار سے شاعر کا مطلب "عندلیب زار" تھا سبحان اللہ کیا حسین لسانیاتی تصرف ہے۔"

بسنت رام ایک نئے جوڑے پر اپنے ادبی کمالات آزما رہا تھا۔ "جناب مجرا گالب جیسا آسک مجاز شاعر اس دیس میں اور کوئی نہیں۔ وہ دلی میں رہتا ہے، جو ہندوستان کا دارالخلافہ ہے۔" کبھی تم دلی گئے ہو، پچ پچ، جوان دلی دیکھنے لی جگہ ہے۔ گھنٹہ گھر، چاندنی چوک، اور مجرا گالب۔ میں نے مجرا گالب کو ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حجور، پہاڑی ہوں، اتنی دور سے درشن کے لئے آیا ہوں، اس زیارت پر ایک شعر مل جائے۔" تب مجرا گالب نے مجھے وہ شعر دیا۔ سننا چاہتے ہو۔"
نوجوان جوڑا منہ کھولے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُن دونوں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ "بوہ شعر ہے"

نہ تڑفن کی اجازت ہے نہ پھر یاد سے ہے۔
دم گھٹنے سے مر جاؤں یو مرجی میرے جلاد کی ہے

بسنت رام پھر آہستہ آہستہ مزے لے لے کر شعر کو دہرانے لگا، اور کسان بچہ بولا۔ "اہیہ

نڈھی بھی مجھے کبھی اسی طرح تنگ کرے ہے۔"

اور لڑکی شرمانے لگتی اور بسنت رام خوش ہو کر کہتا۔ "اسے مخانے کھلاؤ مخانے، کشمش اور ناریل، اصلی ولایتی ناریل منگوایا ہے معشوقوں کا مال ہے

یہاں بہت بھیڑ تھی، بہت سے ڈھولئے جمع تھے، گاؤں کے مراسی نقل کر رہے تھے۔

"تو میرا شاگرد بننا چاہتا ہے۔" اشرف مراسی بولا۔

"جی، بادشاہ۔"

"اچھا تو کہو۔ یا علی۔"

"یا علی۔"

"یا پیر۔"

"یا پیر۔"

"یا اشرف مراسی!"

لڑکے نے اشرف مراسی کی پیٹھ پر زور سے چپتی لگائی۔ "مجھے کفر سکھاتے ہو۔" سب ہنسنے لگے۔

اشرف مراسی بولا۔ "کہو۔ میں سب کا افسر۔"

لڑکا بولا۔ "میں سب کا افسر۔"

"اپنے باپ کا افسر۔"

"اپنے باپ کا افسر۔"

'اپنی ماں کا افسر۔"

'اپنی ماں کا افسر۔"

"تحصیلدار کا افسر"

"تحصیلدار کا افسر۔"

"تھانیدار کا افسر۔"

"تھانیدار کا افسر"

"ڈاکٹر کا افسر۔"

"ڈاکٹر کا افسر۔"

"ماسٹر کا افسر۔"

"ماسٹر کا افسر۔"

"چنگی والے کا افسر۔"

"چنگی والے کا افسر۔"

"پٹواری کا افسر۔"

لڑکے نے یکایک اُسے زور سے چپتی لگائی۔ "حرامی، میری زمین ضبط کراتا ہے۔" اور ساری محفل ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

ڈھولئے زور زور سے ڈھول بجا رہے تھے، اور کشتی ہو رہی تھی۔ داؤں ہو رہے تھے اور کسان لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے اور فقرے کس رہے تھے اور کشمش یا چھوہارے یا مکھانے یا شکرپارے چباتے جاتے تھے۔ جسموں سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ اور اب وہ اپنے بازو ہلاتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ کیونکہ بڑے پہلوان نے باہر سے آئے ہوئے پہلوان کو گرا لیا تھا۔ جہاں پہلے کشتی ہو رہی تھی۔ وہاں اب ناچ ہو رہا تھا۔ اور کسان، چھوٹے لڑکے، جوان، بوڑھے سب مل کر ناچ رہے تھے۔ بازوؤں اور لاتوں کی حرکتوں کا ایک طوفان تھا۔ جیسے اس سمندر میں رقص کی لہریں پیدا ہوتیں، اور چاروں طرف مجمع میں پھیلتی جاتیں۔ ڈھولئے زور زور سے ڈھول بجا رہے تھے، کسان چیخ رہے تھے اور گا رہے تھے اور ناچ رہے تھے اور دھرتی اور سارے میلے کی زمین کانپتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور شیام کو احساس ہونے لگا جیسے اُس کی روح سے صدیوں کی پرانی کینچلی خود بخود اُترتی جا رہی ہے۔ اور وہ اس وحشی ناچ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہونے لگا اور لاتوں کی مختلف النوع حرکتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لئے یکایک اُس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور وہ رک گیا اور اُسے ایسا معلوم ہوا، جیسے وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھا نیچے سمندر کی اُبھرتی ہوئی لہروں کو دیکھ رہا تھا اور جیسے وہ لہریں ہر لحظہ اُس کے قریب ہوتی جا رہی تھیں اور جونہی وہ غوطہ زن ہونے کو تھا یکایک سمندر کی لہریں پیچھے کو چلی گئیں۔ دور، بہت دور، اب صرف ساحل کی ریت چمک رہی تھی۔ اُداس، خاموش، بے حس و حرکت۔۔۔

میلے سے واپس آ کر شیام کی والدہ نے اپنے پتی سے مشورہ کیا۔

"میرے خیال میں منگنی کے تلک کے موقع پر اپنے چند ایک رشتے داروں کو بھی بلا بھیجنا چاہیئے۔ میں اپنی بہن اور اس کے لڑکے کو خط لکھ دیتی ہوں، آپ شیام کے چچا اور شیام کی پھوپی کو خط لکھ کر بلا بھیجئے۔"

"ایسی بھی کیا ضرورت ہے۔" تحصیلدار صاحب نے پس و پیش کرتے ہوئے کہا، وہ اپنے رشتے داروں سے ملتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔

"جی نہیں۔ ہمارے گھر میں پہلا شگن ہے اس موقع پر اپنی برادری کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں ہماری برادری کا کون ہے؟"

شیام کے والد نے پھر سر ہلا کر اپنی نارضامندی کا اظہار کیا، اور اُس کی والدہ نے پھر اصرار کیا، آخر وہ راضی ہو گئے۔

شیام کی والدہ بولیں۔ "ایک بات اور ہے۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئیں۔

"ہوں؟" تحصیلدار صاحب نے اپنے لب سکیڑ لئے یہ اُن کی پرانی عادت تھی۔

شیام کی والدہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "میں چھایا اور اُس کی لڑکی کا یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی۔"

تحصیلدار صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "کیوں، کیا بات ہے؟"

شیام کی والدہ نے رک رک کر کہا۔ "کچھ نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ میں اُن کی آمد و رفت کو پسند نہیں کرتی۔"

تحصیلدار صاحب نے حیرانی سے سر ہلایا۔ ان عورتوں کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے، ابھی دونوں سہیلیوں میں ایسی گاڑھی چھنتی تھی، اور ایک دم یہ قلب ماہیت۔ بولے "بھئی تم جانو۔" اور اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس گفتگو کے پانچ چھ روز بعد شیام کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "بیٹا، تمہارے شگن پر تمہارے پھوپا پھوپی، چچا چچی، موسی اور اُس کی لڑکا، آئیں گے ہم نے اُن سب کو خط لکھ دیا ہے۔ میں نے سوچا اپنے گھر میں پہلا شگن ہے، اگر اس موقع پر بھی اپنی برادری نہ ہو، تو جی میں کسک سی رہتی ہے۔"

جی میں کسک؟ شیام کے جی میں کئی دنوں سے ایک مدھم، میٹھی، چبھتی سی کسک موجود تھی، اتنے دنوں سے ونتی اُن کے ہاں نہ آئی تھی نہ ونتی، نہ چھایا پتہ نہیں کیا بات تھی۔

شیام نے اُداس لہجے میں کہا۔ "تم تو اپنی ضد کرتی ہو، مجھے یہ منگنی مطلق پسند نہیں۔"

"تم تو پاگل ہو!"

"میں پاگل سہی لیکن میں یہ بیاہ نہ کروں گا۔" شیام نے ذرا احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔

"کیوں، کیا چھایا کی لڑکی سے بیاہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" اُس کی ماں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اُس نے ایک تیز نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی، اور وہ اُس چبھتی ہوئی نگاہ کی تاب نہ لا سکا۔ شیام خاموش تھا سر جھکائے ہوئے۔

اُس کی ماں نے اُسی تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا، ان کا آنا جانا یہ رنگ لائے گا۔ میں تمہیں بڑا شریف سمجھتی تھی میرا خیال تھا کہ دوسری ماؤں کے بیٹے برے ہوں، میرے لال میں کوئی عیب نہیں۔"

"چپ رہو، میں سب سمجھتی ہوں تم بالکل بھولے ہو، اُن دونوں ماں بیٹیوں نے تم پر جادو کر دیا ہے۔۔۔ ذرا سوچو تو نہ ہماری ذات، نہ برادری، نہ گوت، نہ خاندان اچھا، نہ وہ روپے پیسے والے ہیں، نہ عزت والے، کوئی بات بھی تو نہیں ملتی، ہمارا اُن کا نباہ کیسے ہوگا، گاؤں کی برادری بھی اُن سے خفا ہے سارے زمانے میں وہ بدنام اور رسوا ہیں۔"

"اپنے ماں باپ کو اس بڑھاپے میں کلنک کا ٹیکا لگوانا چاہتے ہو؟ لوگ کیا کہیں گے کہ تحصیل کا حاکم، اور اپنے بیٹے کا ناطہ کہاں کیا، کیا انہیں کوئی اور پاک صاف، بے لاگ گھر نہ ملتا تھا، جوان چچوڑی ہوئی ہڈیوں پر جا گرے۔"

"ماں۔" شیام نے گرج کر کہا۔ اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

چچوڑی ہوئی ہڈی، کمینی، کم ذات، کتیا۔" اُس کی ماں نے چلا کر کہا۔ اور پھر وہ بستر پر جا گری، اور دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ "میرے بیٹے میرے لال کو بتیائے لئے جاتی ہے۔

اور وہ ان آنسوؤں کو، ان سسکیوں کو برداشت نہ کر سکا، جیسے اس کا سارا عزم ان آنسوؤں کی گرمی سے پگھل گیا تھا، جیسے وہ ایک اونچی کائی سے ڈھکی ہوئی چٹان سے پھسل رہا تھا، اور اُس کے ہاتھ پاؤں کسی سہارے کو نہ پا کر گرتے جا رہے تھے، اُس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی پیدا ہو رہی تھی، ایک عجیب سا احساس، جیسے وہ اپنے برسوں کو پیچھے پھلانگتا ہوا جا رہا تھا۔ اور اپنی جوانی اور اپنے لڑکپن کی منزلوں سے گزر کر پھر بچہ بن گیا تھا، جیسے وہ بچہ اپنی ماں کی چھاتی میں دودھ ٹٹولنا چاہتا تھا، جیسے اُس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پھر اپنی ماں کی آغوش میں مچلنے کے لئے بے قرار ہو اٹھے تھے۔ اس کا سارا جسم اس عجیب احساس سے کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا لیکن رک نہ سکا۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اور اُس نے اُس کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور اُس کے آنسوؤں کو پونچھ دیا اور اُس کی چھاتی سے لگ کر بولا۔ "ماں مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو ماں۔۔۔"

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

اور ماں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "میرے لال، میرے لال۔۔۔" اور اب اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمنڈ آئے تھے، اور اُس نے اُنہیں روکنے کی کوشش نہ کی، اور وہ اُس کے خشک، بھورے رخساروں پر بہتے گئے اور وہ کہنے لگی۔ "بیٹا، کل گنگو مشر کے لڑکے کا بیاہ ہے، تمہیں بھی بلاوا آیا ہے۔ کل گنگو مشر کے ہاں بیاہ ہے، ڈھول بجیں گے، شہنائیوں کی پیاری آواز گونجے گی، آج گنگو مشر کی بیوی ہمارے ہاں نیوتہ دینے آئی تھی۔ وہ کتنی خوش تھی۔۔۔ میرا بھی جی چاہتا ہے، میرے گھر میں خوشی ہو۔۔۔ تم میرے بیٹے لال ہو نا

اور اب وہ احساس کہیں غائب ہو گیا تھا اور اُس کی جگہ ایک تیز تلخی، ایک درست یاسیت نے

لے لی تھی، اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو نفریں کرنے لگا۔ تم نرے پاجی ہو، گدھے ہو، حلوائی کے پلے کی طرح بزدل ہو بزدل ہو تم، سن رہے ہو جی، تمہاری اس بزدلی نے تمہیں کئی بار زندگی کے صحیح راستے پر چلنے سے روک دیا ہے، اور تم اس مسرت، اُس بے پایاں لازوال مسرت کو حاصل کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے ہو جو اُس تکلیف دہ، خاردار راستے پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے تم ہمیشہ حلوائی کے پلے کی طرح اپنے اندھے جذبات کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے رہو گے، اور تمہاری زندگی اُسی کتے کی خارش زدہ کھال کی طرح ہو جائے گی۔ اس میں نہ چمک ہوگی، نہ خوبصورتی، نہ بالوں کی ملائمت، بلکہ خون اور پیپ بہتی ہوئی، چیچڑیاں اور مکھیاں کلبلاتی ہوئی، اور اُس وقت تم اذیت سے چیخ اٹھو گے اور اپنی خارش زدہ کھال کو سہلا کر اُسے اور بھی زخمی کر لو گے۔

گدھے، اُلو، پاجی، بزدل، سن رہے ہو تم جی، اب بھی وقت ہے اپنے آپ کو بچالو۔ ایک بار ہمت سے کام لو میں کہتا ہوں، صرف ایک بار۔ آخر کیا ہو جائے گا، تمہارے ماں باپ اس غم سے مر تو نہ جائیں گے۔ کیوں ڈر رہے ہو صرف ایک بار میں کہتا ہوں صرف ایک بار ہمت سے کام لو۔ تمہاری ٹیڑھی میڑھی پژمردہ اُداس زندگی اُس نغمے کو چھیڑے گی جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے حیران و پریشان ہے۔ ہمت سے کام لو، بزدل، نکمے، تخیلی، جنونی، جذباتی، نسائیت پسند۔

اور وہ اپنی لغت میں سے اپنے تئیں نئی نئی گالیاں تلاش کرنے لگا۔ لیکن اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اُسے نیند نہ آتی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح اس کی آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔ اور وہ اس اذیت ناک جلن کے احساس سے مجروح ہو کر اپنے بستر پر لوٹنے لگا......

مشر گنگو کے لڑکے کا بیاہ تھا۔ پنڈت پیڑا رام کی لڑکی سے، دونوں کے گھر پاس پاس تھے دونوں خاندان موضع دھڑہ کے تھے۔ دھڑے کا گاؤں خالصتاً براہمنوں کا گاؤں تھا۔ ماندر کے مغرب میں ایک اونچی گھاٹی پر، دونوں گاؤں میں چند فرلانگ ہی کا فاصلہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کھیت تھے۔ بلکہ عملی طور پر دونوں گاؤں والے اپنے آپ کو ایک ہی گاؤں کا سمجھتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ماندر کے گاؤں کی آبادی ملی جلی تھی براہمن، مہاجن، سکھ، مسلمان، اچھوت اور سرکاری عہدے دار لیکن موضع دھڑہ میں صرف براہمن بستے تھے۔ گھاٹی کے اوپر سے لے کر نیچے تک ہر گھر میں براہمن

بستے تھے۔ اور اس لئے ماندر کے براہمنوں کو موضع دھڑہ کے براہمنوں پر اسی طرح کا فخر تھا، جس طرح ہندوستان کے ہندوؤں کو نیپال کی ریاست پر اور مسلمانوں کو حیدر آباد کی ریاست پر غرور تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی زمانے میں ماندر کے براہمنوں پر کوئی مصیبت آئی، تو موضع دھڑہ ان کے لئے آخری جائے پناہ ثابت ہوگا۔

مشر گنگو اور پنڈت پیڑا رام کے گھر ایک اونچے تلے پر واقع تھے دونوں گھروں کے درمیان اخروٹ کے درختوں کی ایک قطار بنی ہوئی تھی اس قطار کے نیچے دونوں گھروں کے کھیت تھے۔ جن میں مکی لہلہا رہی تھی۔ تلے کے اوپر ایک پر فضا گھاٹی تھی، اور دونوں گھروں کے اوپر کچھ فاصلے کے بعد چیڑھ کے درختوں کا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ دونوں گھروں کے ارد گرد خوبصورت باغیچے تھے جن میں پھل دار درخت اور پھولوں کے پودے اور سبزی کی کیاریاں تھیں۔ مشر گنگو اور پنڈت پیڑا رام کی لڑکی کے دل میں ایک دوسرے کے متعلق کسی قسم کے ایسے شبہات نہ تھے۔ جن کا شکار ان دنوں شیام ہو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اگست کے آخری ایام کی پر فضا رات، شہنائیوں کی آواز ساری گھاٹی میں گونج رہی تھی۔ مشر گنگو نے برات میں سارے سرکاری عہدے داروں کو مدعو کیا تھا۔ پنڈت پیڑا رام نے بھی سارے سرکاری عہدے داروں کو مدعو کیا تھا۔ دراصل برات کی شان تو انہی سرکاری عہدے داروں سے دوبالا ہوتی تھی۔ اور شادی کے برسوں بعد مشر گنگو یا پنڈت پیڑا رام بڑے فخریہ لہجے میں کہا کرتے تھے۔ "اور جب یہ بیاہ ہوا تھا تو ماندر کے سارے اہلکار اس میں شریک تھے۔ تحصیلدار صاحب تو کبھی کسی شادی میں شریک نہ ہوئے تھے، وہ بھی اس میں شامل تھے۔ جب اُن کے پاس نیوتہ دینے گیا تو اُنہوں نے کہا پنڈت پیڑا رام جی، میں آپ کی لڑکی کو اپنی لڑکی سمجھتا ہوں، میں اس شادی میں ضرور شریک ہوں گا۔۔۔ اب وہ حاکم کہاں، وہ زمانے لد گئے مہاراج، آج کل کے حاکموں میں وہ مروت ہی نہیں بس رعایا کا خون چوسنا جانتے ہیں اور کچھ اُنہیں آتا جاتا نہیں، وہ اور زمانے کے لوگ تھے، وہ اپنی رعایا کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور آج کل ہو نہہ۔۔۔ بس ٹیڑھا ہیٹ سر پر رکھ کر منہ سے پائپ کا انجن چلانا جانتے ہیں۔۔۔ رام رام کیسا برا زمانہ آگیا ہے......"

براتی دونوں گھروں میں بدھائی دینے کے لئے آ جا رہے تھے۔ اس خوشی کے موقع پر ان

لوگوں نے شہر سے گیس کے لیمپ منگوائے تھے جو دونوں گھروں کے وسیع آنگنوں میں جل رہے تھے۔ اور بے شمار دیہاتی بچے بڑے انہماک سے ان لیمپوں کے گرد جمع ہو کر ان کی تیز روشنی کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور کاغذ کی اُس سفید بتی کو غور سے دیکھ رہے تھے، جو شیشے کے اندر بند تھی اور جس میں سے اتنی تیز روشنی نکل رہی تھی، لیکن جو کاغذ ہو کر بھی جلتی نہ تھی۔

"کمال ہے بھئی، ان انگریزوں نے کمال کر دیا ہے۔" ایک براہمن کہنے لگا۔

"کیا کمال ہے؟" ایک اور براہمن بولا، جو لکڑی کی کھڑاویں پہنے تھا، اور جس نے اپنا سارا سر منڈوا رکھا تھا، اور جس کے سر کے بیچ میں ایک گھنی چوٹی کسی گھاس کے تلے میں دیودار کے چھتنارے کی طرح بلند و بالا نظر آ رہی تھی۔ "کیا کمال ہے؟" اُس نے نہایت تلخ لہجے میں براہمن سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہمارے پرانے رشی یہ سب بدیا جانتے تھے۔ سنجے مہاراج نے دور بین سے اور ریڈیو سے سارے مہابھارت کو دیکھ لیا تھا۔ مہاراج رام چندر پشپک نامی ہوائی جہاز پر بیٹھ کر بارہ گھنٹوں میں لنکا سے ایودھیا پہنچے تھے اور جب وہ ایودھیا پہنچے تھے، تو ساری ایودھیا نگری میں دیپ مالا کی گئی تھی اور محلوں میں گیس کے لیمپ جلائے گئے تھے۔" یہ کہہ کر پنڈت جی نے ایک شلوک پڑھا۔

اور دو چار لوگ اکٹھے ہو گئے اور پہلے براہمن پر، جس نے انگریزوں کی تعریف کی تھی، نفریں بھیجتے ہوئے کہنے لگے۔ "اجی، ہمارے پرانے شاستروں میں کیا کچھ نہیں ہے، بجلی سے لے کر ہوائی جہاز تک، اور ریل گاڑی سے لے کر مشین گن تک، ہر ایک چیز کی بدیا موجود ہے، ہمارے رشیوں منیوں کو ان سب باتوں کا گیان تھا۔ اب ان پرانے دھرم شاستروں کو پڑھنے والا کوئی موجود نہیں۔ نہ اب وہ رشی منی رہے۔"

اور شیام نے اپنی زندگی میں ہزاروں مرتبہ ان لوگوں کو اسی بات کو دہراتے ہوئے سنا تھا۔ یہ بات سن کر جیسے اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ بڑے بڑے عالم فاضل، پڑھے لکھے لوگ اس بات کو دہرایا کرتے تھے بڑے فخریہ لہجے میں، اور وہ حیران تھا، کہ یہ لوگ اپنی موجودہ ذلیل حیثیت پر پردہ ڈالنے کے لئے اس قسم کے لایعنی احساس برتری سے کیسے کام لیتے ہیں، اور وہ کیونکر اس طرح حقائق کو جھٹلا کر اپنے نفس اور اپنی روح کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آج سے چند سال پہلے جب لوگوں نے ابھی ہوائی جہاز دیکھے بھی نہ تھے، بلکہ محض اُن کا تذکرہ سنا تھا، یہ لوگ ہوائی جہاز کی ہستی سے منکر تھے، اور یہی براہمن لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ سب بکواس ہے، ڈھکوسلا

ہے اور فرنگیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں، لیکن جب لوگوں نے اُنہیں ہوا میں اُڑتے دیکھا، تو یہی لوگ دھرم شاستروں کا حوالہ دے کر کہنے لگے۔ "واہ، یہ تو ہماری کتابوں میں پہلے ہی موجود ہے۔"

اور شیام اس بات پر بہت حیران تھا کہ لوگ اول تو سائنس کی ہر ایک ایجاد کو جھوٹا سمجھتے۔ ایک جنونی کی بڑ، ایک بکواس اور پھر اُسی بڑ، یا بکواس کو سچ ہوتے دیکھ کر جھٹ اپنی مذہبی کتابوں میں اس کا تذکرہ ڈھونڈتے تھے۔ اور یہ طریق کار صرف براہمنوں ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی اسی پر عمل پیرا تھے۔ وہ حیران تھا کہ ایجاد سے پہلے کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی، نہ کسی کو یہ سوجھتا تھا کہ ہماری کتابوں میں بھی یہ کرشمے جوں کے توں موجود ہیں۔ لیکن یہ کیا کہ اُدھر کسی مغربی موجد نے برسوں کی محنت کے بعد اپنی ایجاد دنیا پر ظاہر کی۔ اور ان لوگوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں سے فوراً اس کا حوالہ نکال کر دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اور کہا۔ "واہ، یہ تو پہلے ہی ہماری کتابوں میں مذکور ہے۔" اور شیام حیران تھا کہ اس ذلیل حرکت کے بعد بھی ان لوگوں کو اپنے طرز عمل میں کوئی تضاد محسوس نہ ہوتا تھا اور یہ سمجھ نہ سکتے تھے، کہ وہ کس طرح ایک موجد کی برسوں کی محنت سے ناانصافی کر رہے تھے۔ اور نہ وہ اس امر کے متعلق زیادہ غور کر سکتے تھے کہ اگر اُن کی مذہبی کتابوں میں واقعی ان تمام ایجادوں کا حال مذکور تھا، تو کیوں نہ انہوں نے اُنہیں مغربی موجدوں سے پہلے دریافت کر لیا۔ وہ ہر روز بلا مبالغہ اپنی مذہبی کتابیں پڑھتے تھے لیکن اُن کے پڑھنے کے بعد بھی کیوں وہ ہمیشہ کسی مغربی موجد کی ایجاد کے منتظر رہتے۔ وہ کیوں نہ خود ہی اُنہیں دریافت کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ تاکہ دنیا بھر کو فخریہ دکھا سکیں۔ "دیکھئے، یہ کمالات ہماری کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔" اس کے برعکس وہ ایک باطنی ذلت، ایک ذہنی ڈاکہ زنی کے مرتکب ہوتے تھے اور ایک پٹی ہوئی قوم کی طرح اپنی گذشتہ شان و شوکت، اپنی مردہ تہذیب اور اپنے جامد اور بے جان ادب، جس میں اب زندگی کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی، کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے، "ہمارے پاس یہ سب کچھ تھا۔" اور وہ یہ "سب کچھ" اس وسعت احساس سے متاثر ہو کر کہتے، کہ اس مبالغہ آرائی میں ریل گاڑی اور بے تار برقی، اور ریڈیو، مشین گن، اور بجلی کی روشنی، اور ہوائی جہاز اور روٹری پریس، اور دنیا بھر کی مختلف ایجادیں بھی آ جاتی تھیں۔ جنہیں مغربی سائنسدانوں نے صدیوں کی مسلسل ذہنی محنت اور کاوش فکر کے بعد دریافت کیا تھا۔ کسی قوم کے انحطاط تخیل اور فرسودگی ادراک کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور شیام کا خون کھولنے لگا اور اُس کا جی چاہا

کہ وہ اس براہمن کو جس نے لکڑی کی کھڑاویں پہن رکھی تھیں اور جس نے اپنا سر اُسترے سے منڈا رکھا تھا، اور جواب سنسکرت کا اشلوک پڑھ کر گیس لیمپ کو آج سے ہزاروں برس پہلے کی ایجاد ثابت کر رہا تھا گلے سے پکڑ کر اس کا گلا اتنے زور سے گھونٹے کہ اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئیں، اور اس کی جھوٹی زبان دانتوں سے باہر آ جائے اور اُس کا سانس رکنے لگے، اور وہ چلا چلا کر کہے۔ "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ ہم اقبال کرتے ہیں کہ ہم جھوٹے ہیں صدیوں سے جھوٹے، رذیل، اور کمینے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری ساری زندگی جھوٹی ہے، ہماری موت جھوٹی ہے، ہم مردہ ہیں، ہماری تہذیب، ہمارا مذہب، ہمارا سماج، ہماری ہر ایک چیز جھوٹی ہے، جھوٹی اور فرسودہ اور تاریخ سے ٹھکرائی ہوئی۔ لیکن خدا کے لئے ہمیں چھوڑ دو ہمیں زندہ رہنے دو۔ ہمیں اس جھوٹ اور خود فریبی کے تاریک قفس میں زندہ رہنے دو۔ ہمارے پر قینچ کر دو۔۔۔ ہمارے ہاتھوں اور پاؤں میں غلامی کی آہنی بیڑیاں ڈال دو۔ ہم سے زندگی کا نور، اُس کی آزاد اُڑان، اُس کی ساری مسرت چھین لو، لیکن اللہ ہمیں زندہ رہنے دو۔ خدا کے لئے۔۔۔"

اور شیام سوچنے لگا کہ اس زیست اور موت میں کیا فرق ہے؟ یکایک اُس نے آنگن میں ونتی کو چلتے ہوئے دیکھا اور ایک لمحے کے لئے اُس کا سانس رک گیا، ونتی کے زندہ اور درخشاں حسن نے اس کے تخیل کے تیرہ و تار کو روشن کر دیا، جیسے تاریک بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان میں بجلی کوندتی ہے، اور زمین اور آسمان، جنگل اور گھاٹی، وادی، اور دریا کو اپنی تابانی سے منور کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا سارا غصہ فرو ہو گیا، اور وہ مبہوت ہو کر ونتی کی طرف دیکھنے لگا، جو اٹھلاتے ہوئے شباب کی حسین ترین رعنائیاں اپنے جلو میں لئے آنگن میں سے گزر رہی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ میں ایک تھال لئے گزر رہی تھی، جس میں سپید مصری، الائچی، اور بادام رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ریشم کا دوپٹہ جس میں چاندی کا لہریہ جھلملا رہا تھا، اور۔ اور پھر وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ دروازے میں سے گزر کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

آنگن میں بحث ابھی تک جاری تھی اور ایک پنڈت کہہ رہا تھا۔ "درونا چاریہ نے ارجن اور کرن کو جو شستر بدیا سکھائی تھی، اُس میں کئی اگنی شستر بھی شامل تھے اور مہابھارت میں اُن کا جو بیان ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ گورو درونا چاریہ نے اپنے چیلوں کو مشین گن کا استعمال بھی سکھایا تھا، اور کمال یہ ہے کہ درونا چاریہ کی مشین گن آج کل کی مشین گن سے۔۔۔"

لیکن اب شیام کے لئے ورونا چاریہ کی مشین گن میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ آنگن میں کھڑے کھڑے، اس بحث کو سنتے ہوئے بھی وہ بہت دور۔ بہت دور چلا گیا تھا۔

گنگو مشر کے باغیچے میں آڑو کا ایک ٹیڑھا سا درخت تھا۔ جس کی پتلی پتلی شاخوں میں چاند نے اپنا گھونسلا بنالیا تھا۔ اس درخت کے تنے پر تین چار لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے، دو تین تنے کے نیچے سبز گھاس پر بیٹھے تھے۔ اتنے میں ننھی گوری اپنی سہیلی کھنتیری کو بازو سے پکڑ کر درخت کے تنے کے قریب لائی۔ کھنتیری کی قمیص کے اندر اُس نے ایک لڑکے کی پگڑی ٹھونس رکھی تھی۔

''ڈاگدار صاحب، ڈاگدار صاحب۔'' گوری بولی۔

ایک لڑکا جو تنے پر ڈاکٹر بنا بیٹھا تھا کہنے لگا۔ ''کیا کہتی ہو، گوری۔''

گوری اپنی ہنسی کو روک کر بولی۔ ''حجور اس لڑکی کا پیٹ دیکھیے اس کو کیا ہو گیا ہے۔''

ڈاکٹر بولا۔ ''ویل، اس کے پیٹ کا اپریشن ہو گا گوری۔ سب لوگ آنکھیں بند کرو۔''

اور سب بچے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے، اور کھنتیری رونے لگی اُسے اس مذاق کا پتہ نہ تھا، اور شریر گوری یونہی اُسے پھسلا کر اُس کے قمیص کے اندر پگڑی ٹھونس دی تھی۔

گوپال رانی پر عاشق تھا یعنی جس حد تک ایک ساتھ آٹھ سال کا لڑکا ایک چھ سات سال کی لڑکی پر عاشق ہو سکتا ہے۔ رانی گاؤں کی ننھی لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین مانی جاتی تھی، اور اُس کی ایک نگاہ التفات کی خاطر سب لڑکے اُس کے بے جا ناز و نخرے برداشت کرتے تھے لیکن گوپال ان سب ہی سے بڑھا چڑھا ہوا تھا اور ان دنوں رانی گوپال پر خفا تھی۔ یہاں تک کہ اس سے بات بھی نہ کرتی تھی۔

ایک سپاہی رانی کو گرفتار کر کے لایا۔

تحصیلدار صاحب، جنہوں نے ایک بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی، اور مکی کے بھٹے کے سیاہ بالوں کی مونچھیں لگائے ہوئے تھے، بولے۔ ''کیا بات ہے۔''

گوری بول اٹھی۔ ''یہ غلط ہے غلط ہے سب سے پہلے کچہری میں پیادہ بولے۔''

چنانچہ پیادے نے آواز دی کوئی ہے۔ ''رانی ولد سنت رام براہمن سکنہ موضع دھڑہ حاضر ہے۔''

رانی بولی۔ ''میں حاضر ہوں۔ سلام حجور۔''

''سلام۔۔ کیا بات ہے۔'' تحصیلدار صاحب تنے پر اکڑوں ہو کر بولے۔

سپاہی نے کہا۔ ''حجور، اس نے چوری کی ہے۔ اس نے آپ کے باغ سے فرانسیسی سیب توڑ کر کھائے ہیں۔''

''ہمارے باغ سے؟'' تحصیلدار صاحب نے بڑے غصے سے کہا اور یہ کہتے ہوئے اُن کی مونچھ نیچے جا گری، اور سب لڑکے ہنسنے لگے۔

تحصیلدار صاحب اُچک کر نیچے آرہے اور اپنی نقلی مونچھوں کو اوپر کے ہونٹ پر لگاتے ہوئے بولے۔ ''اس لڑکی نے ہمارے باغ میں سے فرانسیسی سیب چرائے ہیں؟ ہونہہ، اچھا، اس کی پیٹھ پر دس مکے لگائے جائیں۔''

''نہیں، نہیں۔'' رانی نے چلا کر کہا۔ ''ہم یہ سزا نہیں مانتے، ہم یہ سزا نہیں مانتے۔''

''اچھا۔'' تحصیلدار صاحب نے اُس کی جان بخشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری جگہ کوئی اور دس مکے کھالے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

گوپال نے سامنے آکر کہا۔ ''رانی کی سزا میں بھگتنے کو تیار ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اکڑوں ہو گیا، اور اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلیاں زمین پر ٹیک دیں۔

سپاہی نے اس کے مکے لگانے شروع کئے۔ ''ایک، دو، تین۔''

''بس، بس۔'' تحصیلدار صاحب نے کہا۔ ''اتنی سزا کافی ہے کیوں رانی؟''

اور سب بچے ہنسنے لگے۔ گوپال نے رانی کی طرف دیکھا رانی کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔

کھانا کھانے سے پہلے پنڈت پیڑا رام کے باغیچے میں ایک کونے میں چند اہلکار اور گاؤں کے شرفاء تاش کھیل رہے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے اور شراب پی رہے تھے۔ بسنت کرشن بولا۔ ''بازی ہمارے ہاتھ رہے گی۔''

بام دیو بولا ''ہم پنچ یہاں کس لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابھی تو مانچ چڑیا کا پنچ غلام ہمارے پنچ ہے، موجود ہے جس پنچ کو شک ہو وہ دیکھ لے، وہ پنچ اچھی طرح دیکھ لے۔ چڑیا کا غلام، ہت تیرے کی

(شیام کو دیکھ کر) آؤ بابو جی بیٹھو یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ تحصیلدار صاحب کے لڑکے۔۔ ہیچ صاحبزادے ہیں۔"

تھانیدار یار محمد بولا۔ "شیام شاب، آپ شے مل کر مجھ کو۔۔۔ مجھ کو۔۔۔ مجھ کو۔۔۔ بڑی ای ای۔ خ خ خوشی ہوئی۔"

یہ کہہ کر وہ شیام سے ہاتھ ملانے لگا۔ شیام اُس کی گردن کا زخم دیکھنے لگا۔ اور اس کے تخیل میں ندی کے کنارے ایک باڑھ نظر آنے لگی باڑھ اور ریوڑ، اور نوراں۔

گوسائیں نورنگ بولا۔ "تھانیدار صاحب اب چلئے نا۔ پتا پھینکئے۔ اب آپ کی باری ہے۔"

تھانیدار یار محمد اب بھی شیام سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ "شام شاب واللہ بڑی کھوشی ہوئی ہے واللہ مجھ کو۔ مجھ کو۔ (ہچکی) بے حد کھوشی ہوئی ہے شام شاب۔"

بام دیو بولا۔ "چل، پتہ چل، ہیچ تیری خوشی کی ماں کے دودھ میں پان کا ایکا، پتہ چل، اور بے۔"

تھانیدار یار محمد نے تاش کے پتے چارپائی پر پھینک دیئے اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے شیام کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔۔

"شیام شاب، واللہ بڑی ای ای ای۔۔۔ مجھ کو۔۔۔ واللہ بڑی کھوشی مجھ کو مجھ کو۔ مجھ کو شیا۔ شاب۔۔۔"

بسنت کرشن نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی اور اُس نے شیام کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

بام دیو تاش کے پتوں پر پتے مار کر اظہار افسوس کر رہا تھا "ہم ہیچ کو کوئی مانچ شراب نہیں دیتا۔ ہیچ ہم کمپونڈر جو ہوئے جو مانچ ہم ہیچ تھانیدار ہوتے، ہیچ تھانیدار ہوتے، ہیچ تھانیدار ہوتے۔۔۔"

اور وہ چارپائی سے نیچے گر گیا۔۔۔

بیدی تیار کی جا رہی تھی۔ بیدی کے قریب ڈھولک بج رہی تھی۔ چھت پر لڑکے اور نوجوان، اور بوڑھے، بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے لڑکیوں کے گیت سن رہے تھے۔

لڑکیاں گیت گا رہی تھیں، ڈھولک بج رہی تھی اور سنگریزے کی ٹک ٹک تال کا کام دیئے جاتی تھی۔

منجھیں موڑیں، منجھیں دیاں سائیاں
سوہنے۔ رانجھے نے مندراں پایاں
منجھیں موڑیں، منجھیں دیاں سائیاں
سوہنے رانجھے نے مندراں پایاں
رانجھا۔۔۔ رانجھا تے رانجھا فقیر وے
ہیر لنگھ گئی دریاواں نوں چیر وے
جنہاں لایاں نی توڑ نبھائیاں
جنہاں و لایاں نی توڑ نبھائیاں
سوہنے رانجھے نے مندراں پایاں

گیت گاتے گاتے لڑکیاں خود ہی اپنے خیال کی جسارت پر ہنسنے لگیں، اور ساری فضا نسائی قہقہوں سے معمور ہو گئی۔ "جنہاں لائیاں نی توڑ نبھائیاں۔" مصرعہ وہ بار بار دہرا رہی تھیں، جیسے کوٹھے کی چھت پر بیٹھے ہوئے یا آنگن میں بیٹھے ہوئے یا محض اپنے ہی دل میں بیٹھے ہوئے، کسی خیالی محبوب کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہی ہوں "جنہاں لائیاں نی توڑ نبھائیاں۔" گھبراؤ نہیں، ہماری محبت ابدی ہے، لازوال ہے، وہ رانجھے اور ہیر کی الفت کی طرح ہے۔ تم میرے رانجھے ہو میں تمہاری ہیر ہوں اور اگر رانجھے اور ہیر کی محبت سچی تھی، تو تمہاری ہماری محبت کیسے جھوٹی ہو سکتی ہے؟۔۔۔

اور وہ اخروٹوں کی قطار کے نیچے سے گزرتا گیا، اور گیت کا مصرعہ اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ اور اخروٹوں کی چوٹیوں پر سے چاند بھی ایک بچے کی طرح بھاگتا ہوا اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ اور وہ چلتے چلتے رک گیا، اور اُس کے سامنے سے آنے والا بھی اُسے رکتا دیکھ کر رک گیا، اور درختوں کی چوٹیوں پر بھاگتا ہوا چاند بھی اُنہیں رکتے دیکھ کر رک گیا، اور اُس نے کہا۔ "ونتی۔" اور پھر جیسے اُس نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔ "شیام" اور پھر چاند کہنے لگا "ونتی، شیام، شیام، ونتی۔" اور چاند مسکرانے لگا۔ کیونکہ یہ رات ہی ایسی تھی اس کی تاریکی بھی اتنی ہی خوبصورت تھی، جتنی اس چاند کی شاخوں پر جھینگر بول رہے تھے۔ اور تاریک پتوں پر چاند کی کرنیں رقصاں تھیں اور اُن کے نیچے اس خوبصورت تاریکی اور خوبصورت چاندنی کے کانپتے ہوئے سنگم میں شیام نے ونتی کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اپنی روح کی پوری قوت سے، ونتی کا سارا جسم کانپنے لگا جیسے سنگم کے گہرے پانیوں میں پہنچ کر

کشتی ہلکورے کھاتی ہے۔ اور وہ اُس کے لب چومنے لگا، اور اُس کے آتشیں لمس سے نہ صرف ونتی کے ہونٹ بلکہ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اور وہ زور کے ساتھ اس سے چمٹ گئی، جیسے وہ اپنی مضطرب روح کی ساری کپکپی اُس کے آتشیں لمس میں کھو دینا چاہتی ہے۔ اور وہ اُس کے ٹخنوں، گھٹنوں، رانوں، چھاتیوں، اور لبوں کے لمس سے یہ معلوم نہ کر سکا کہ وہ دو ہیں یا ایک، ایک ہیں یا دو۔ جیسے اُن کی روحوں کا ذرہ ذرہ گنگنانے لگا۔ یہ سنگم ہے یہ۔۔۔سنگم ہے یہی وہ لازوال سنگم ہے، جب دو مخالف سمتوں سے آتی ہوئی لہریں ایک جگہ پر آکر اس طرح مدغم ہو جاتی ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ یہ ہے، یا یہ وہ۔۔۔

اور وہ بہت دیر تک ایک اخروٹ کے تنے سے لگ کر باتیں کرتے رہے، آہستہ آہستہ مدھم سرگوشیوں میں، اور بیچ بیچ میں خاموشی، طویل بوسوں کی شہد آگیں خاموشی، جب وقت مٹ جاتا ہے، موت مٹ جاتی ہے، زندگی اور زمین کی گردش اپنے محور پر گھومتے گھومتے رک جاتی ہے، اور ساری کائنات ایک طویل، طویل، نہ ختم ہونے والا بوسہ معلوم ہوتی ہے۔

شیام نے پوچھا۔ ”تمہیں کبھی بلبھدر سے محبت تھی۔“

”نہیں! یہ میں اب کہہ سکتی ہوں پر اگر اُس وقت، جب تم آئے نہ تھے، کوئی مجھ سے پوچھتا، تو شاید میں یہی کہتی کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ پر اُس وقت میں محبت کو پہچانتی نہ تھی۔“

”سچ؟“

”سچ؟“

”او۔ مائی ڈارلنگ!“

”میں انگریزی نہیں جانتی، پر میں اس کا مطلب سمجھ لیتی ہوں۔ میں صرف ہندی اور اردو اور گورمکھی جانتی ہوں، لیکن اگر تم مجھے انگریزی سکھاؤ گے تو میں جلد سیکھ جاؤں گی۔“

”اچھا تو کہو۔ او۔ مائی ڈارلنگ۔“

”او۔ مائی ڈارلنگ!“

”لو اب تم چوتھی زبان بھی سیکھ گئیں۔“

”ہاں تم سکھاؤ گے تو کیوں نہ سیکھوں گی۔“

وہ پھر رک کر بولی۔ ”پر میں نے بلبھدر سے کبھی اس طرح۔۔۔“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔“

”تم کیسے جانتے ہو؟ شیام

”او۔ مائی ڈارلنگ۔“

”او مائی ڈارلنگ۔“ ونتی نے کہا۔ پہلے سے بہتر۔ وہ دونوں ہنسنے لگے۔

دو جگنو اُن کے قریب اُڑنے لگے، شیام نے اُنہیں جھٹ اپنے رومال کی لپیٹ میں لے لیا، رومال کی پتلی تہہ کے اندر دونوں جگنوؤں کی روشنیاں کانپ رہی تھیں۔

”دیکھو، یہ خوبصورت جگنو۔“ وہ اُنہیں ونتی کے لبوں کے قریب لے گیا۔

”ہاں۔ یہ دو جگنو ہیں ایک میں، ایک تم۔“

اُس نے اُس کے لب چومتے ہوئے کہا۔ ”پھر کہو۔“

ونتی نے شرما کر کہا۔ ”ایک میں ایک ت۔۔۔“ وہ ”تم“ ناتمام رہا، نہیں، بوسے نے اُسے مکمل کر دیا، اس میں روشنی پھیلا دی، اُسے جگنو بنا دیا، اُس میں روح پھونک دی، اسے زندہ جاوید کر دیا۔ اور وہ ”تم“ سب کچھ بن گیا ایک بوسہ، ایک لمحہ، ایک روح، ایک جگنو۔

ونتی نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اب میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔“

”وہ کیوں۔“

”اتنی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔ سچی بھی نہیں معلوم ہوتی“

”ڈرتی ہو؟“

”ہاں“

”کس سے؟“

”اپنے آپ سے، تم سے، قسمت سے، پنڈت سروپ کشن سے۔“

پنڈت سروپ کشن سے، کیوں؟“

”وہ اپنے لڑکے درگا داس سے میرا بیاہ کرنا چاہتا ہے اور۔۔۔“

”اور؟“

”اور روشن ماما اس بات پر رضامند ہے، کیونکہ۔۔۔“

"کیونکہ؟"

"روشن ماما نے پنڈت سے دوہزار روپیہ اسی وعدے پر لے رکھا ہے۔"

جیسے دوہزار روپے ایک تلخ، بے ہنگم، چھناکے کے ساتھ اُس کے سامنے بکھر گئے۔ اور وہ اپنی حیران نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"پھر؟" اُس نے پوچھا اور اُسے زور سے اپنی چھاتی سے لگالیا۔

وہ اُس کی آغوش میں کانپی۔ "درگاداس انسان نہیں ہے--- وہ حیوان--- پتہ نہیں، وہ کیا ہے--- مجھے اُس سے بڑا ڈر لگتا ہے--- پنڈت، روشن ماما کو ہر روز تنگ کرتا ہے۔ کہتا ہے برادری کے چار آدمیوں کو بلا کر شادی کردو، زیادہ جھنجٹ کی ضرورت نہیں، روشن ماما ابھی تک ٹال رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ کہیں وہ۔"

"اور تم؟ کیا تم مان جاؤ گی؟"

"میں مر جاؤں گی۔"--- اور وہ اُس کی آغوش میں کانپی، پھر وہ اُس کی ٹھوڑی سے کھیلنے لگی۔

"شیام۔" اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "وعدہ کرو کہ مجھ سے کبھی نہ جدا ہو گے۔"

"جب تک زندہ ہوں، تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔"

"شیام میں بہت پڑھی لکھی نہیں ہوں، پر میں اپنی جان تم پر نچھاور کر سکتی ہوں، شیام، میں بالکل سچ کہتی ہوں--- میرا جسم، میرا جسم تو کچھ نہیں ہے، تم اسے اگر اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر پہن لو گے، تو بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ لیکن میرے اندر جو دل ہے شیام، اسے ٹھیس نہ پہنچانا میں مر جاؤں گی۔"

"میں تم سے پیار کرتا ہوں، ونتی۔" اُس نے ونتی کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میری ننھی ونتی، میری ننھی ننھی منی پیاری پیاری ونتی---"

ونتی نے اطمینان کا ایک سانس لے کر کہا۔ "اومائی ڈارلنگ۔"

"اومائی ڈارلنگ۔" اور پھر دونوں ہنسنے لگے---

ونتی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے آج سے کچھ عرصے پہلے میں تم کو جانتی نہ تھی، اور اب......

"اور اب؟" شیام نے پوچھا۔

"ہاں اور اب!" ونتی نے جواب دیا، صرف اتنا کہا۔ "ہاں اور اب" لیکن ان تین لفظوں میں اُس نے اپنی روح کی ساری بے تابی، بے قراری اور آگ پھونک دی تھی---

اُس نے پھر کہا۔ "شیام، تمہیں معلوم ہے بلبھدر مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اب مجھے اُس پر ترس آتا ہے--- ہاں اگر تم نہ آئے ہوتے--- تو سچ بات تو یہ ہے--- کہ درگاداس بھی مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے--- لیکن مجھے اُس سے ڈر لگتا ہے--- وہ انسان نہیں ہے--- وہ تو---" وہ پھر کانپنے لگی۔

"ڈرو نہیں، درگاداس اس وقت یہاں نہیں ہے۔" شیام نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیکھ کر ٹھٹکی، پھر ایک ہلکی سی چیخ مار کر وہ اُس کی چھاتی سے چمٹ گئی۔

دور، اخروٹ کے درختوں کی قطار سے پرے، شیام نے درگاداس کو گھسٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے ساتھ اُس کا باپ تھا پنڈت سروپ کشن، اور ونتی کا ماما روشن، اور تینوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باتوں میں منہمک تھے---

اور شیام کا دل کسی نامعلوم خوف سے بھر گیا۔ یکایک درخت کی شاخوں سے ایک بڑا بگڑ چیخ مار کر اٹھا اور اپنے سیاہ پر پھیلائے نیچے گھاٹی کی فضا میں پیرتا ہوا غائب ہو گیا---

باب سوم

زہراب

دوسرے دن شیام کو پتہ چلا کہ چندرا اور موہن سنگھ کے معاملہ میں ڈاکٹر کے طرز عمل کی تحقیقات کے سلسلہ میں حکام بالادست نے ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا ہے، جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے، اور یہ کمیشن نہ صرف مقرر ہو چکا تھا، بلکہ ماندر کی وادی کو بھیجا بھی جا چکا تھا، نہ صرف بھیجا جا چکا تھا، بلکہ وہاں پہنچ چکا تھا، کئی افسران تو ڈاک بنگلے میں ٹھہرے تھے، اور جن افسروں کے قیام کا بندوبست ڈاک بنگلے میں نہ ہو سکا تھا، اُن کے لئے تحصیلدار صاحب کچہری کے باغ کے ایک کونے میں خیمے لگوا رہے تھے چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ تحصیل کے مقامی اہلکار بہت ہراساں تھے۔ مسلمان ڈاکٹر کو معطل کر دیا گیا تھا اور براہمنوں میں ایک جوش سا پایا جاتا تھا۔ وہ اس طرح چلتے نظر آتے تھے، گویا اپنی فتح یابی پر بے حد نازاں ہوں۔

نائب تحصیلدار نے شیام سے اس معاملے پر بحث کرتے ہوئے کہا۔ "حضور غریب پرور، میں نے آپ کو بتایا نہ تھا، کہ غریب مسلمان ڈاکٹر کو اس کے شریفانہ اور بشریت پسند طرز عمل کی وجہ سے معطل کر دیا جائے گا، اور براہمن اپنی مرضی کا کمیشن بنوالیں گے، جو پنڈت سروپ کشن وہاں شہر میں گیا ہوا تھا، تو اس کو آخر کوئی گل تو کھلانا ہی تھا، اب دیکھئے، عشق کریں، چندرا اور موہن سنگھ، لڑائی اُن کی براہمنوں کی برادری سے ہو، لیکن بیچ میں پس جائے ایک غریب مسلمان ڈاکٹر۔ اب آپ بتائیے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ڈاکٹر بے چارے کا قصور صرف اتنا ہے کہ اُس نے چندرا کو موہن سنگھ کی تیمارداری کی اجازت دے کر موہن سنگھ کی جان بچالی، اور اگر وہ مریض کی دیکھ بھال موہن سنگھ کے ان لواحقین کے سپرد کرتا، جو اس کی موت کے بعد اُس کی زمین اور جائیداد کے مالک ہوتے، تو مریض کی جو گت بنتی، اُس کا ہر ذی ہوش فرد بخوبی اندازہ کر سکتا ہے، اور پھر آپ کہتے ہیں

کہ یہ سارا فساد اقتصادی ہے۔ اجی شیام صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ یہ معاملہ بالکل جذباتی ہے، ہندو بڑا انصاف پسند ہے، میں اس بات کو مانتا ہوں، لیکن جہاں بیچ میں کسی مسلمان کا معاملہ آن پڑے، وہاں اُس سے انصاف ہو ہی نہیں سکتا۔ وہاں اُس کا دل بے قابو ہو جاتا ہے، اس میں اُس کا قصور نہیں، اُس کے دل کا قصور ہے۔"

امجد حسین کچہری کا بوڑھا گرداور، جو نہایت دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ یکایک کہنے لگا۔ "حضور گستاخی معاف، آپ ذرا تلخی اور زیادتی سے کام لے رہے ہیں، یہ مذہبی اور جذباتی عصبیت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں نمایاں نظر آتی ہے۔ حضور میں آپ کو اپنے لڑکپن کی بات سناتا ہوں۔ میرے تایا تھے، سیشن جج، بڑے پرہیزگار، متقی مسلمان، پانچوں وقت نماز ادا کرتے تھے، اُنہیں مجھ سے خاص اُنس تھا، کیونکہ میں جماعت میں بڑے اچھے نمبروں پر پاس ہوا کرتا تھا ایک دن وہ مجھے اپنے قریب بلا کر پوچھنے لگے۔

"امجد، امجد، ادھر آ۔"

"کیا بات ہے، تایا جی۔"

"شاباش بیٹا، تو بڑا اچھا لڑکا ہے، برخوردار تو بڑا ہو کر تحصیلدار، منصف، جج بنے گا۔"

میں چپ رہا۔

وہ میرے شانے پر تھپکی دے کر بولے۔ "اچھا یہ بتا کہ اگر تو جج بن جائے تو ٹھیک انصاف کیا کرے گا نا۔"

"جی ہاں تایا جی۔"

"اگر تیرے پاس ایک ہندو قاتل آئے، جس نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہو تو تُو اُسے کیا سزا دے گا؟"

"پھانسی۔"

"اور اگر ایک مسلمان قاتل جس نے ایک ہندو کو قتل کیا ہو۔ تو پھر؟"

"پھانسی!" میں نے اُسی تیزی سے جواب دیا۔

سیشن جج صاحب آزردہ ہو گئے۔ چند لمحے چپ رہے، پھر میرے باپ سے جو میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے۔ "یہ تیرا بیٹا بڑا لائق ہے، تو نے اسے صحیح تعلیم نہیں دی۔" پھر وہ میرا

کان کھینچ کر کہنے لگے۔ "کہہ، کہہ میں مسلمان سے رحم کا سلوک کروں گا۔" اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے لیکن جب تک انہوں نے مجھ سے دس بار یہ نہ کہلوا لیا میرا کان مروڑنا بند نہ کیا۔۔۔ اور ایمان سے گو میں نے اُس وقت اُن کے اصرار کرنے پر کہہ دیا لیکن میرا دل اس بات کو نہ مانتا تھا، اور میں آج تک اس اصول کا قائل نہیں ہوا۔"

شیام نے تلخی سے کہا۔ "اسی لئے تو حضور گرداور کے گرداور رہے ہیں۔۔۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ ہندو گھرانوں میں ہر روز اسی طرح کے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ "بیٹا سانپ کا اعتبار کرنا، سنپولئے کا اعتبار کرنا، بچھو کا اعتبار کرنا، لیکن مسلمان کا اعتبار نہ کرنا۔" یہ تعلیم ہے جو بچپن میں ہمیں دی جاتی ہے، اسی لئے تو جب یہ ہندو اور مسلمان لڑکے بڑے ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بظاہر اچھے خاصے دوست ہوتے ہوئے بھی اپنے دل کے نہاں خانوں میں مغائرت کی اس خلیج کو چھپائے رکھتے ہیں۔ اور یہ رابطہ اتحاد کبھی پوری طرح سے مستحکم نہیں ہونے پاتا۔ دراصل یہ معاملہ اقتصادی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ پہلے جو ہمارے درمیان اقتصادی یا سیاسی امور بنائے نزاع ہیں اُن کا تدارک کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد بچوں کے جذبات کی صحیح تربیت ہونی چاہیئے۔ اور فرقے وارانہ سلوک اس کام کو کبھی بطریق احسن سرانجام نہیں دے سکتے۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے بعد بھی تفرقات کی یہ گہری خلیج بہت مدت تک ہمارے درمیان رہے گی، یہ زہر جو بچپن میں ہمارے رگ و پے میں داخل کیا گیا ہے، اس کا اثر نسلوں تک باقی رہے گا۔۔۔"

امجد حسین نے مسکرا کر کہا۔ "حضور، آپ آج خلاف معمول بڑے ناامید نظر آتے ہیں، اگر آپ لوگوں ہی نے ہمت ہار دی۔۔۔"

علی جو بولا۔ "شیام صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ آپ بڑی قدر کی بات کرتے ہیں، میں مستقبل کا ذکر نہیں کر رہا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کیا جائے، یہ اس ڈاکٹر کے معاملے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

شیام بولا۔ "صاحب، میں آپ کو اس معاملے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ ہاں میرا اتنا خیال ضرور ہے کہ یہ کمیشن سرکاری حکام نے محض براہمنوں کی اشک شوئی کے لئے مقرر کیا ہے، ورنہ ڈاکٹر کے خلاف جو الزام گھڑا گیا ہے۔ اس میں تو کوئی جان نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ ڈاکٹر صاف بری ہو جائے گا۔"

علی جو مسکرا کر بولا۔ ”کاش آپ اس کمیشن میں ہوتے۔“

شیام بولا۔ ”اور پھر آپ کو مزید شکایت کا موقع ملتا کہ دیکھئے صاحب ایک اور ہندو کو۔۔۔“

اور اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ تینوں ہنس پڑے۔۔۔

شیام ڈاکٹر سے ملنے کے لئے ہسپتال گیا۔ وہ بے چارہ بڑی مغموم صورت بنائے یوکلپٹس کے ایک درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ آج سے اُس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اور بے حد تلخ باتیں کہہ رہا تھا۔ دراصل شیام بھی اس معاملے میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ آخر اُسی نے تو ڈاکٹر سے سفارش کی تھی کہ وہ چندرا کو موہن سنگھ کی تیمارداری کی اجازت دے دے، وہ بہت دیر تک ڈاکٹر کے پاس بیٹھا ہوا اُس سے باتیں کرتا رہا اور اُسے تسلی دیتا رہا۔ ہسپتال میں بام دیو بڑی مستعدی سے کام کر رہا تھا اور سرکاری کمیشن کو، مندر کے اندر براہمنوں کو، حکومت کو، مذہب کو، خدا کو، اور کل کائنات کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ بہت سے براہمن لوگ بیمار نہ ہوتے ہوئے بھی آج ہسپتال میں دوا لینے آئے تھے۔ وہ دراصل ڈاکٹر کو مغموم دیکھ کر اپنی دلی عصبیت کو اور فروغ دینا چاہتے تھے، کیونکہ یہ عصبیت اسی قسم کی کمینہ باتوں سے پھولتی پھلتی ہے، اور اگر آدمی اس قسم کے کام نہ کرے دانستہ یا نادانستہ تو یہ عصبیت پژمردہ اور مرجھائی سی رہتی ہے، اور اکثر اوقات مر بھی جاتی ہے لیکن اس کی موت کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے جب تک آدمی خود نہ مر جائے۔

وہ وارڈ میں موہن سنگھ اور چندرا سے ملنے گیا۔ چندرا اور موہن سنگھ دونوں گم سم ہراساں بیٹھے تھے۔ چندرا کا چہرہ آج خلاف معمول بہت اترا ہوا تھا، اور وہ تیز اور شوخ لہجے میں گفتگو بھی نہ کرتی تھی لیکن آنکھوں سے اب بھی ایک عزم صمیم کا اظہار ہوتا تھا۔ جیسے یہ آنکھیں اپنی سی کر گزرنا جانتی ہیں۔ اور یہ نہیں جانتیں کہ ناامیدی کسے کہتے ہیں۔ موہن سنگھ کے زخم اب اچھے ہو گئے تھے۔ وہ چارپائی پر اپنے بازو اپنے گھٹنوں کے گرد لپیٹے اکڑوں بیٹھا تھا۔ آنکھیں فضا میں جمی تھیں، لب بھنچے ہوئے تھے، آنکھوں میں ایک بے قرار چمک تھی، رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور چہرے سے اور سارے جسم سے ایک غیر معمولی نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔

چندرا بولی۔ ”ڈاکٹر نے اُنہیں اُٹھنے بیٹھنے سے منع کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ گو زخم بھر چکے ہیں لیکن تمہیں ابھی اور پندرہ بیس روز چارپائی پر آرام سے پڑا رہنا چاہیئے کہیں زخم حرکت سے دوبارہ نہ

کھل جائیں۔ میں اسے سو بار منع کرتی ہوں۔ لیکن یہ پھر چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔“

موہن سنگھ بولا۔ ”کیا کروں۔ کسی کل چین نہیں پڑتا۔“

چندرا بولی۔ ”ہر وقت بے چین اور اُداس رہنے سے طبیعت اور بھی بری ہو جاتی ہے۔ یونہی بے فائدہ رنجیدہ رہنے سے کیا حاصل، آدمی یا تو کوئی کام کی بات سوچے، یا کرے۔ ابھی تم کمزور ہو، آرام سے چارپائی پر پڑے رہو، گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے دنیا ہمارے ساتھ ہو نہ ہو، ہم دو جو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔“

چندرا نے یہ الفاظ اس ارفع خود اعتمادی کے لہجے میں کہے، اس کی باتوں سے، نگاہوں سے اُس کی شخصیت کی ہر نہج سے ایک ایسی عظیم خود اعتمادی کا اظہار ہوتا تھا، کہ شیام کو اُس پر رشک آنے لگا۔ ایسے افراد اُس نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے تھے جو اپنی روح کی پوری قوت سے مخالف طوفان کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے، اور ایک ٹھوس، سنگین، سنگلاخ چٹان کی طرح مضبوط کھڑے رہتے تھے۔

اور اُس نے مسکراتے ہوئے موہن سنگھ سے کہا۔ ”تمہیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔ جس مرد کو چندرا جیسی نڈر، بہادر اور بے خوف بیوی مل جائے اُسے زندگی کی اُلجھنوں سے کیا ڈر۔“

موہن سنگھ کے بھنچے ہوئے لبوں پر ایک پتلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

پنڈت سروپ کشن کے مکان پر براہمنوں، مہاجنوں اور سکھوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ سارے گاؤں میں جوش پھیلا ہوا تھا۔ ہر ایک بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔

”میں کہتا ہوں۔۔“ پھنجی مل سنار بولا۔ ”اس کمیشن کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اس ڈاکٹر کو سزا دے، ایک ایسی کڑی سزا کہ آئندہ سب کے کان ہو جائیں۔“

اور بچر سنگھ نے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔ ”تم نے سنا بھائی گڑگنجا جی، یہی لالہ پچھلے موقع پر ڈاکٹر کی حامی بھرتے تھے۔“

بھائی گڑگنجا نے اپنی ساری بتیسی دکھلاتے ہوئے کہا۔ ”سردار جی، یہ دنیا؟ بس کچھ نہ پوچھو صرف چلتر بازوں کی دنیا ہے۔“

اوتر بھان بولا۔ ”میری صلاح تو یہ ہے کہ معاملہ صرف ڈاکٹر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ

نائب تحصیلدار علی جو اور تحصیلدار کے متعلق بھی تحقیقات ہونی چاہیے۔"

پنڈت بسنت کرشن نے کہا۔ "یہ سالا تحصیلدار بھی مسلمانوں سے ملا ہوا ہے، اس حرامزادی چندرا کا یار ہے وہ، میں گنگا مائی کی سوگند کھا کر کہتا ہوں، مجھے گئو ماتا کی سوگند ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے۔۔۔"

لالہ بانشی رام اپنی طلائی گھڑی سے کھیلتے ہوئے بولے۔ "بسنت کشن جی، یہ معاملہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا نہیں رہا۔ یہ اب رعایا اور حکومت کا سوال بن گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کمیشن ان سارے افسروں کے متعلق تحقیقات کرے، تھانیدار کے متعلق بھی اور چنگی والوں کے متعلق بھی اور جنگل والوں کے متعلق بھی۔ یہ افسر جو بیجا باتیں یا زیادتیاں کرتے ہیں، ایک ایک کر کے کمیشن کے سامنے لائی جائیں تاکہ دودھ کا دودھ ہو جائے اور پانی کا پانی۔"

سارا مجمع ایک دم بول اٹھا۔ "ٹھیک ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے، لالہ بانشی رام جی واہ واہ آپ نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔"

"کیوں نہ ہو، بازار کے چودھری ہیں آخر۔" پنڈت گندل رام نے لالہ بھڑ بھونجا داس کی بغل میں ایک ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

لالہ بانشی رام کی خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

پنڈت سروپ کشن جی بولے۔ "بھائیو میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔ میں تہہ دل سے آپ کے ساتھ ہوں، اور آپ کی رائے کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ لیکن مجھے معاف کیا جائے۔ اگر میں آپ کی رائے سے تھوڑا سا اختلاف ظاہر کروں، اختلاف اصولی نہیں عمل کا ہے، جہاں تک ان افسروں کے مظالم کا تعلق ہے، میں بھی اُن کی اکڑ، ان کے غرور اور ان کے دبدبے کو کچلنے کے حق میں ہوں، لیکن ابھی نہیں، آہستہ آہستہ، پہلے ایک کو لو، پھر دوسرے کو، آہستہ آہستہ، بھگوان نے گیتا میں کہا ہے۔۔۔"

اور پنڈت جی ایک شلوک پڑھنے لگے اور ساری محفل ہمہ تن گوش ہو گئی۔

جب سبھا برخاست ہو گئی، تو پنڈت جی نے ہات کے اشارے سے روشن کو روک لیا، اور جب سب لوگ چلے گئے، تو بیٹھک میں صرف پنڈت سروپ کشن اور اُن کا لڑکا درگا داس اور روشن رہ

گئے۔ پنڈت جی روشن سے مخاطب ہوئے۔ "عزیز بھائی، یہ لوگ ابھی ٹھیک طرح سے ان افسروں کی خطرناک چالوں کو سمجھتے نہیں، میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں آپ ہی بتایئے، اگر میں اس وقت ان بیوقوف لوگوں کی بات مان لیتا، اور سارے افسروں کے خلاف سازش کھڑی کرنے کی کوشش کرتا، تو ہم پر چاروں طرف سے پھٹکار پڑتی۔ آپ لوگ ابھی معاملے کی نزاکت سے آگاہ نہیں ہیں، آس پاس کے سارے گاؤں مسلمانوں کے ہیں، اور وہ لوگ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے، اور دوسرے یہ سارے افسر لوگ متحد ہو جاتے اور اپنا سارا رسوخ کمیشن کے اراکین کو اپنی طرف کرنے میں خرچ کر دیتے۔ وہ سارے علاقے میں آگ لگا دیتے اور گاؤں کی براہمن برادری کے خلاف ایک مضبوط سازش کھڑی کر دیتے، کہ میرا، تمہارا یا کسی کا بھی اس میں سے بچ کر نکلنا مشکل ہو جاتا۔"

"ستیہ ہے مہاراج۔" روشن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ تو ساکشات چانکیہ مہاراج کا اوتار ہیں۔"

"بیٹا، میں جو بات سوچتا ہوں تمہارے، اپنی ساری برادری کے بھلے کے لئے ہی سوچتا ہوں۔ اچھا، اب یہ بتاؤ کہ اُس دن مشر گنگو کے لڑکے کے بیاہ پر میں نے جو بات تم سے کہی تھی۔ اُس کے متعلق تم نے کیا سوچا۔"

روشن چپ رہا۔

"دیکھو، بیٹا، دن نکلتے جا رہے ہیں، اگلے مہینے کے پہلے ہفتے میں بڑا اچھا لگن نکلتا ہے لڑکا اور لڑکی دونوں کے لئے یہ گھر بہت اچھا رہے گا۔ نکشتر بہت سندر ہیں۔ چندرماں چوتھے گھر میں ہے، اور سورج دوسرے میں، سب کارج سدھ ہو گا۔ میرے خیال میں اسی لگن میں بیاہ ہو جائے۔"

"ہو، ہو، ہو" درگا داس اپنی خوفناک ہنسی ہنسنے لگا۔ ہنستے وقت اُس کے چہرے پر بے شمار شکنیں پڑ جاتی تھیں، روشن نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر چپکا ہو رہا۔

پنڈت سروپ کشن نے درگا داس کو جھڑک دیا۔ اور اُسے کمرے سے باہر نکل جانے کو کہا۔ درگا داس لکڑی کا سہارا لے کر گھسٹتا ہوا اٹھا اور اپنی کانی آنکھ سے رستے ہوئے پانی کو پونچھتے ہوئے باہر چلا گیا۔

پنڈت سروپ کشن نے کہا۔ "بیٹا تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔ یہ میں جانتا ہوں میرا بیٹا

بدصورت ہے۔ لیکن وہ دل کا برا نہیں اور پھر ونتی تو اس گھر کی رانی ہوگی، میں اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اور پھر یہاں اُسے کس قسم کی تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ ایک اونچے خاندان کے براہمن جاگیردار کی بہو ہوگی، سارے علاقے میں اُس کی عزت ہوگی، تمہاری عزت، اُس کی ماں کی عزت، اس کے علاوہ اگر تمہیں اور بھی روپے پیسے کی ضرورت ہوئی تو میں دینے سے قاصر نہ ہوں گا۔ تم ایک بار لگن مقرر کرلو۔"

روشن کے چہرے پر ایک حریص سی چمک پیدا ہوئی بولا۔ "بہت اچھا پنڈت جی، میں ونتی کا اور اُس کی ماں کا غصہ جھیل لوں' آپ تاریخ مقرر کر لیجئے مجھے بھی لگن منظور ہے۔ اور ذرا ہاں مجھے اس شادی کے لئے دو ہزار روپے کی ضرورت ہوگی۔"

پنڈت سروپ کشن گویا نہال ہو گئے، اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر بولے۔ "تم بہت بھلے ہو بیٹا۔ تم نے آج اپنے بزرگ کا کہا مان کر اُس کی لاج رکھ لی ہے، اسی طرح پرماتما تمہاری آبرو بھی بنائے رکھے۔ میرے پاس اس وقت بارہ سو روپیہ ہوگا۔ یہ تم لے جاؤ باقی پرسوں تک لے لینا۔ بالکل فکر نہ کرو کسی بات کی فکر نہ کرو، بالکل چنتا نہ کرو۔"

روشن نے نگاہ نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کی چنتا ہے؟"

پنڈت جی روپیہ لانے کے لئے اُٹھنے لگے تھے، کچھ سوچ کر پھر بیٹھ گئے۔ بولے۔ "ایک بات تم سے کہوں۔"

"جی۔"

"مجھے اب بھی چھایا سے ڈر لگتا ہے۔"

روشن بولا۔ "آپ مطلق فکر نہ کریں اُن دونوں ماں بیٹیوں کا میں گارڈین ہوں، میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، اور وہ پھر آخر میری بہن ہے اُسے سمجھا بجھا لوں گا۔ آخر اُسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھانی پڑے گی۔ ہے تو وہ خودسر، لیکن شاید روپے سے رام ہو جائے، ممکن ہے شاید میری دھمکی سے کام بن جائے۔"

"لیکن اگر وہ پھر بھی نہ مانے۔"

"تو اُسے بہلا پھسلا کر کسی کام کے بہانے شہر بھیج دوں گا۔"

"لیکن وہ ایسی بچی تو نہیں۔"

"تو پھر شاید تشدد سے کام لینا پڑے۔ دو طمانچے کھا کر خود سیدھی ہو جائے گی۔ بیاہ کے وقت اُسے ایک الگ کوٹھری میں بند کر دوں گا، عورت ذات کا کیا ہے، اُسے راہ راست پر لانا کیا مشکل ہے۔"

"اور ونتی؟"

"ونتی بچی ہے، بے چاری لڑکی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ میرے سامنے چوں بھی کر سکے۔ وہ تو میرے سائے سے بھی ڈرتی ہے۔" روشن نے فخریہ لہجے میں کہا۔

پھر وہ اپنا لہجہ بدل بدل کر کہنے لگا۔ اور اب اُس کی آواز میں اُداسی کا ایک ہلکا سا پرتو جھلکتا تھا۔ "لیکن میں کہتا ہوں پنڈت جی، میں ونتی کو بہت چاہتا ہوں میں اُسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہوں۔ میری عزت اب آپ کے ہاتھ ہے۔ دیکھئے اُسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کیجئے گا۔ وہ پھول کی طرح معصوم ہے۔ دیکھئے کہیں اس کا دل میلا نہ ہو۔"

پنڈت جی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کوئی چنتا نہ کرو، بیٹا، مجھے بھی اپنی بہو تم سے کم عزیز نہ ہوگی، اُسے یہاں ہر طرح کا عیش آرام نصیب ہوگا۔ اس علاقے کی وہ رانی ہوگی۔"

اور پنڈت جی کے چہرے پر اس وقت ایک ایسی حریص نگاہ چمک رہی تھی، جسے اگر روشن بھی دیکھتا تو خوف سے کانپ اٹھتا۔ لیکن روشن کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ "تو اب اس مہورت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔"

"جی ہاں۔۔۔ اے۔۔۔ نہیں، ابھی نہیں۔ ذرا دو چار دن اور ٹھہر جائیے۔"

"بہت اچھا۔۔۔ اب تم وہ روپے لیتے جاؤ۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

اُن کے اُٹھتے ہی دروازے کے باہر آہٹ ہوئی، اور کوئی گھسٹتے ہوئے قدموں سے جلدی جلدی بھاگ گیا۔ درگا داس کان لگائے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

درگاداس حکم چند پنساری کے پاس گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ "تمہارے پاس کوئی طاقت کی دوا ہے۔"

حکم چند نے درگاداس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "پنڈت جی، تمہیں طاقت کی کیسی دوا چاہیئے؟"

درگاداس کھانسنے لگا۔ رال اُس کی ٹھوڑی پر بہنے لگی، اس رال میں اُس کی کانی آنکھ کی رستی ہوئی نمی بھی شامل ہو گئی۔ اُس نے انگوچھے سے اپنے منہ کو پونچھا کیونکہ اُس کا ماتھا بھی پسینے سے تربتر ہو گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "بس یہی طاقت کی کوئی اچھی سی دوا دو۔ جو تم اور لوگوں کو دیتے ہو۔ وہ دوا جو تم نے پنڈت ہنسراج کے بیٹے کو دی تھی۔ جب اُس کی شادی ہوئی تھی۔"

"اچھا اچھا۔" اور حکم چند زور زور سے ہنسنے لگا۔ اُسے ہنستے دیکھ کر درگاداس کا نچلا جبڑا ڈھلک گیا اور وہ اپنی کانی آنکھ کو زور زور سے جھپکنے لگا۔

حکم چند نے اپنی ہنسی ضبط کر لی، اور ایک شیشی میں اُسے دوا بند کر کے دے دی۔ یہ سات دن کی دوا ہے، سات دن کے بعد پھر لے جانا۔ کھٹی، لال مرچ اور تیل کی چیز سے پرہیز کرنا، دودھ خوب پیئو، سنا؟ تین روپے۔"

درگاداس نے تین روپے دے دیئے۔ کچھ عرصہ وہ چپ رہا پھر کہنے لگا۔ "کیا میری اس کانی آنکھ کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا؟"

حکم چند نے کہا۔ "اُس رب کے سوا اور کوئی اس کا علاج نہیں، لیکن ایک بات ضرور ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ تم اپنی اس کانی آنکھ میں شیشے کی ایک نقلی آنکھ لگوا لو۔ بس بالکل اصلی آنکھ کی طرح

معلوم ہو گی۔"

درگاداس بولا۔ "کتنے روپے کی آئے گی۔"

"اس کا تو مجھے اندازہ نہیں، اس کے لئے تمہیں شہر جانا پڑے گا اور وہاں بڑے ڈاکٹر سے نقلی آنکھ لگوانی پڑے گی۔"

"بہت اچھا تو میں شہر جاؤں گا۔"

"ہاں ضرور شہر جاؤ۔"

"بہت اچھا تو میں شہر جاؤں گا۔" درگاداس نے آہستہ سے پھر اپنی بات کو دہرایا، جیسے کوئی غیر معمولی سبق یاد کر رہا ہو۔ پھر وہ دکان سے نیچے اترنے لگا یکایک وہ رک گیا اور حکم چند پنساری سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بہت اچھا تو میں اگلے ماہ شہر جاؤں گا۔ لیکن اگر میں اُس وقت تک اپنی آنکھوں پر سبز شیشوں والی عینک پہن لوں تو کوئی ہرج ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" حکم چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بالکل وکیل یا بیرسٹر معلوم ہو گے۔ درگاداس بیرسٹر۔ درگاداس بیرسٹر۔"

پھر دو چار اور دکاندار اکٹھے ہو گئے اور سب اُسے مل کر تنگ کرنے لگے اُسے چڑانے لگے۔"

درگاداس بیرسٹر، درگاداس بیرسٹر۔"

درگاداس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے دوا کی شیشی کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور پھر لکڑی کے سہارے وہاں سے تیزی سے بھاگنے لگا۔ لیکن دکاندار لوگوں نے شور مچا دیا تھا اور کئی تو اُس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

درگاداس نے یکایک وہیں کھڑے ہو کر گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں بدصورت ہوں۔ میں بہت بدصورت ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ اگر میں بدصورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

بلند قہقہے ایک دم بند ہو گئے۔ متبسم چہرے متین ہو گئے۔ اور ایک نامعلوم خوف کا تاریک غبار تماشائیوں کے چہروں پر چھا گیا، جیسے درگاداس کی ہولناک بدصورتی ایک مجسم سوال بن کر اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس کے لئے درگاداس کو کس طرح موردِالزام گردانتے تھے۔ اُن میں سے کوئی شخص، ہر شخص، درگاداس ہو سکتا تھا۔

درگاداس کا نچلا موٹا ہونٹ اور نیچے کو لٹک گیا، اور اس کے دونوں سامنے کے دانت اور زیادہ

نمایاں ہوگئے، اور اُن دونوں دانتوں کے درمیان سے اُس کی سانس ایک سانپ کی پھنکار بن کر نکلی، اور وہ اُن لوگوں کو وہیں خاموش چھوڑ کر اپنی راہ پر چلا گیا۔

ماندر کی ندی کے کنارے بابا اہر من ناتھ کے استھان پر جاکر درگاداس نے اپنا ماتھا ٹیکا۔

بابا اہر من ناتھ نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھولیں۔ بولے۔ "بیٹا، کیا چاہتا ہے؟"

"بابا جی، پرشاد لایا ہوں۔" یہ کہہ کر درگاداس نے مصری اور پانچ روپے اُن کے سامنے رکھ دیئے۔

"بیٹا۔ بول کیا چاہتا ہے۔" بابا اہر من ناتھ نے پوچھا۔

"بابا جی آپ کی دیا چاہتا ہوں۔ وشی کرن منتر مل جائے۔"

"وشی کرن منتر کیوں چاہتا ہے کیا جس پر تو عاشق ہے وہ بیاہی ہوئی ہے۔"

"نہیں مہاراج، اُس کا مجھ سے بیاہ ہونے والا ہے، اور مجھے اس ساری دھرتی پر اُس سے بڑھ کر اور کوئی چیز اتنی پیاری نہیں۔"

"پھر؟"

"مہاراج میں۔۔۔ میں بہت بدصورت ہوں۔ انسان بھی نہیں معلوم ہوتا، مہاراج آپ کی کرپا چاہتا ہوں۔ مہاراج، ایسی شکتی دیجئے، کہ وہ میری صورت نہ دیکھے، میرا دل دیکھے۔"

بابا جی چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ "آج ماندر کے کنارے تجھے جو چتا جلتی نظر آئے یا اگر تجھے کوئی چتا نظر نہ آئے، تو پرانے قبرستان چلا جائیو۔ اور وہاں آدھی رات کے وقت ایک گھنٹہ تک اُس چتا یا قبر کے گرد چکر لگاتا رہیو، اور بلند آواز میں یہ منتر پڑھتا رہیو، ادھر اپنا کان میرے قریب لا۔"

اور درگاداس نے اپنا کان اُن کے قریب کر دیا اور بابا جی نے دو تین بار ایک منتر اُس کے کان میں پھونکا۔

۔"یاد ہو گیا تجھے۔"

"جی مہاراج۔"

"بس اب چلا جا یہاں سے۔"

"بہت اچھا مہاراج۔"

"بس اب چلا جا یہاں سے حرامی، لنگڑے، کتے، بدذات۔"

"بہت اچھا، مہاراج ابھی اسی دم چلا جاتا ہوں، مہاراج پرنام۔"

لیکن بابا جی نے اس کے پرنام کا جواب گالیوں میں دیا۔ اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا وہ اُسے گالیاں دیتے رہے اور جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو اُنہوں نے دوسرے سادھو کو آواز دی جو اُن کے قریب سمادھ لگائے بیٹھا تھا۔ اور ساری گفتگو کے دوران میں یوگ آسن جمائے، زندگی اور موت سے پرے عالم محویت میں رب عظیم سے لو لگائے بیٹھا تھا۔ "ابے بھولا ناتھ، بھولا ناتھ بے۔ سور کے بچے۔"

بھولا ناتھ نے آہستہ سے آنکھ کھولی، ادھر اُدھر دیکھا میدان خالی پایا۔ جھٹ اٹھ کر شاشٹانگ ڈنڈوت کی بولا۔ "گورو میرے کا کیا حکم ہے۔"

"یہ پانچ روپے، سرکاری ٹھیکے پر چلا جا ایک روپے کی چرس لائیو، دو روپے کی افیم، اور باقی دو روپوں کی شراب۔"

"ست بچن، شو شمبھو، شو شمبھو، لگے سوٹا گانجا چرس اور بھنگو۔۔۔"

اور اگر اُس رات کوئی ماندر کے پرانے قبرستان کے قریب سے گزرتا، تو وہ ایک ایسا منظر دیکھتا، جو اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا۔ اور پھر اگر وہ زندگی بھر کبھی اُس رات کا تصور کرتا، تو قبرستان کا بھیانک اور دل ہلا دینے والا منظر اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔

اور وہ آدھے چاند کی اُداس چاندنی کو پرانے قبرستان کے جھنڈوں اور جھاڑیوں کی بھیانک تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیکھتا، جھاڑیوں پر اور بڑے بڑے جھنڈوں پر کپڑوں کی بے شمار دھجیاں بندھی ہوئی دیکھتا۔ جیسے ہر جھاڑی اور ہر جھنڈ کی شاخوں کے پیچھے ننگے مردے اپنی سپید ہڈیوں کی نمائش کر رہے تھے، اور ہوا ایک مدھم بھیانک سیٹی بجاتے ہوئے اُن جھاڑیوں اور جھنڈوں میں گزر رہی تھی، اور وہ دیکھتا کہ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر کے گرد ایک مسان چکر لگا رہا ہے۔ یہ ایک لنگڑا بھوت تھا جس کا نچلا جبڑا نیچے کو لٹکا ہوا تھا، جس کی ایک آنکھ خوفناک طریق پر چمکتی تھی، اور جس کے دو بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اور یہ بھوت لنگڑاتا

ہوااور ہوامیں ہاتھ ہلاتا ہوابار بار ایک قبر کے گرد ناچ رہا تھااور کہہ رہا تھا:۔

جھڑ بیری، بل بھیری، مسان کی ڈھیری
نہ آگے جائے، نہ اُوپر آئے، نہ پیچھے جائے
اوم ہرگنگے، سرجنگے، کالے بھجنگے
مہادیو آئے، مہابیر گائے، کالی ماتا کھائے
اوم سنگنگ ماترنگ ہرگنگے، کالی مائی کے رنگے
نہ آگے جائے، نہ اوپر جائے، نہ پیچھے جائے
جھڑ بیری، بل بیری، مسان کی ڈھیری
درگا داس کا کارج سدھ!

وہ بلند آواز میں بھاری خوفناک آواز میں یہ الفاظ دہراتا ہوا قبر کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور اُس کی شکل اس قدر بھیانک تھی، اور اُس کا رقص اس قدر خوفناک تھا، اور اس رقص کا گیت اس قدر وحشتناک تھا کہ شاید قبرستان کے مردے بھی اپنی اپنی قبروں میں دبک گئے تھے۔ صرف چاند حیرانی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ کوئی انسان اس روح فرسا منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکتا تھا۔

بھوت بہت دیر تک قبر کے گرد ناچتا رہا، حتیٰ کہ اس کے قدموں سے اڑتی ہوئی خاک نے اُس کے ارد گرد فضا میں ایک دھندسی پھیلادی، اور اب وہ اس دھند کے اندر ایک بہت بڑا دیو، ایک پھیلا ہوا تاریک سایہ نظر آتا تھا، جو چاند کی کرنوں اور اڑتی ہوئی خاک کے نیم مٹیالے، نیم نورانی دھند کے حلقے کے اندر ہلتا ہوا قبر کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اُس کے چکر تیز ہوتے گئے، منتر کا جاپ بلند ہوتا گیا، اور اُس کے منہ سے خوشی کے خوفناک قہقہے فوارے کی طرح چھوٹنے لگے، اور پھر وہ چکرا کر قبرستان کی شکستہ دیوار پر جاگرا اور بہت دیر تک بازو اور ٹانگیں پھیلائے اسی حالت میں پڑا رہا، حتیٰ کہ چاند پہاڑوں کی اوٹ میں چلا گیا، تارے ماند ہونے لگے، رات کا تاریک غبار چھٹنے لگا۔ اور پورب سے آنے والی ہوا قبرستان کے جھنڈ اور جھاڑیوں میں بیٹھ کر کراہنے لگی۔

درگاداس کی نئی رام کہانی سارے گاؤں میں مشہور ہوگئی، اس کے عشق کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ درگاداس کی ہیئت کذائی، اور اس کی مضحکہ خیز حرکات نے اس پر جلادی، اور لوگ اُس کی تازہ کوشش کو مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔ شیام خوبصورتی اور بدصورتی کی فکری بحث میں نہ پڑنا چاہتا تھا، خوبصورتی اور بدصورتی میں بُعدالقطبین ہے، لیکن یہ دونوں قطبین بھی محبت کی رو سے ملائے جاسکتے تھے، لیکن جہاں یہ محبت مفقود ہو، وہاں ان قطبین کے درمیان کس طرح اتصال ہوسکتا تھا۔ وہ جبر کے خلاف تھا، درگاداس کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ونتی سے محبت کرے، لیکن کیا اُسے ونتی سے زبردستی شادی کرنے کا حق بھی پہنچتا تھا، ونتی جو اُسے ناپسند کرتی تھی، اُس سے نفرت کرتی تھی۔ نہیں، شاید اُس نے غلط تجزیہ کیا تھا۔ یہاں نفرت اور پسند کا سوال نہ تھا۔ ونتی کی شخصیت الگ تھی، اس کی خودی، اس کی انا، اُس کی روح، درگاداس سے اس قدر مختلف اور متنازع تھی کہ ان دونوں کا اتصال قطعی ناممکن تھا۔

لیکن پھر بھی شیام اس فکری بحث میں الجھنا نہ چاہتا تھا کیونکہ یہاں اُس کی اپنی ہستی اُس کی اپنی بقا کا سوال تھا۔ وہ کیا لائحہ کار اختیار کرے، کیونکہ گوپنڈت سروپ کشن اور روشن نے گاؤں کے کسی فرد کو اس امر سے آگاہ نہ کیا تھا۔ درگاداس کی بے چین، بے تاب، اور اضطراری حرکات نے سارے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیلادی تھی، کہ ونتی درگاداس سے بیاہی جانے والی ہے اور یہ کہ اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں مہورت مقرر ہوچکی ہے، اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی، اور اب شیام بھی مجبور ہوگیا کہ وہ ایک بار، شاید آخری بار اپنے دل، اپنی روح، اپنے ذہنی واردات کا پورے طور پر جائزہ لے۔ ایک بات اُس کے ذہن میں پورے طور پر واضح تھی۔ یہ معاملہ فردی نہ تھا۔ اُس کی

نوجوان اور بے فکر زندگی میں محبت نے کبھی اتنی نازک اور اہم صورت اختیار نہ کی تھی، اُس نے کئیوں سے عشق کیا تھا، کامیاب یا ناکامیاب، لیکن ہمیشہ یہ جذبہ وقتی، فروعی، سطحی، اور مانند حباب ٹوٹ پھوٹ جانے والا ہوتا تھا، وہ اس بے کار سی شے کو عشق کا نام دینا بھی پسند نہ کرتا تھا اور اکثر اپنے دوستوں کے پیہم اصرار پر عشق کا فلسفہ بیان کرتے کرتے اس کا لہجہ بے حد طنزیہ ہو جاتا اور وہ کہتا "سچ یقین مانیئے، میں نے آج تک کبھی کسی سے عشق نہیں کیا، میں عشق کرنا چاہتا ہوں، لیکن پتہ نہیں کیوں میرے جذبات اُس نچلی، سفلی، ارزل سطح سے اوپر نہیں اٹھتے۔ جسے لوگ جنسیات، یا شبابیات، کے نام سے ملقب کرتے ہیں اور میں ہمیشہ اس جذبے کی نچلی تہوں تک رہتا ہوں، اور میں نے کبھی اپنے آپ کو اس جذبے کی اُس اٹھان یا معراج تک نہیں پایا، جسے آپ لوگ عشق کہتے ہیں، دراصل عشق سے میری مراد کوئی بڑی ہی عجیب شے ہے، کوئی بڑی ہی نرم و نازک ملائم سی چیز، جیسے انگور اُون، اور کبھی کبھی میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں کہ کسی عورت سے عشق کرنے کی بجائے کسی خرگوش سے عشق کرنا کیوں نہ شروع کر دوں، آپ نے اس کی کھال دیکھی، کتنی نرم و نازک اور ملائم، اور ہاتھ لگاؤ تو احساس ہوتا ہے جیسے اُس کی ساری نرمی، ملائمت اور نزاکت روح میں اترتی جاتی ہے، اور میرے خیال میں یہی سچے عشق کی خاصیت ہے۔۔۔"

لیکن اب اُس کے ذہن میں طنز کی مطلق گنجائش نہ تھی، اور کم از کم اس امر کے متعلق تو اُس کے ذہن میں کوئی الجھن نہ تھی۔ یہ محبت اُس حباب کی مانند نہ تھی جو ندی کی سطح پر ایک فروعی مسرت سے ناچتا جاتا ہے، اس محبت میں ندی کی ساری روانی اور اُس کی گہرائی موجود تھی، اس کی گہرائی سے اُسے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہاں طنز کا کوئی کام نہ تھا۔ اب اگر وہ چاہتا تو بھی اس جذبے کو اپنی روح سے اکھاڑ کر نہ پھینک سکتا تھا۔ اس کے ہیولے نے اُس کے سارے ذہنی اُفق کو مستور کر لیا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں، سانس کی ہر دھڑکن میں، زیست کی ہر حرکت میں اس ہیولے کی موجودگی کا احساس کرتا رہتا۔ ہر وقت اس کی روح پر ایک گہری اُداسی کا پرتو جھلکتا رہتا۔ کیونکہ شاید اُس کی روح اپنی شاہینی انفرادیت کو کھو کر اپنی انا کو کسی دوسری ہستی میں مدغم کر رہی تھی، اور یہ احساس چاہے کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو، تکلیف دہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ اس اُداسی میں شرینی بھی تھی اور اذیت بھی، لیکن اس کی اذیت اُسے اس کی شیرینی سے بھی زیادہ شیریں معلوم ہوتی، اس اُداسی میں بھی ایک انوکھا مزہ تھا، اس نئے احساس نے اُس کی زندگی میں نئے معانی پیدا کر دیئے تھے۔ اُس کے

ذہن پر نئے اُفق ہویدا کر دیئے تھے اور اُس کی روح کو ایک نئی خوبصورتی، ایک نئی تابانی، ایک نئی جمالیت سے معمور کر دیا تھا، اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

تو پھر وہ کیا کرے۔ چپ چاپ بیٹھا رہے، اور سماج کے آہنی ہات کو، اس خوبصورتی، اس تابانی، اس جمالیت کا گلا گھوٹنے دے، چپ چاپ بیٹھا رہے، اور بدصورتی کی اندھی آنکھ کو اپنی حیات نو کی درخشاں وسعتوں پر ایک تاریک اور ہولناک ہیولیٰ مستور کرتے دیکھے، چپ چاپ بیٹھا رہے، اور پرانی روایت اور اوہام کے لنگڑے بھوت کو اپنی خوشیوں اور مسرتوں کی قبر پر ناچتا دیکھے؟

ہاں وہ ایسا کر سکتا تھا، اور اُس کے پاس اس کا جواز بھی موجود تھا۔ اُس کے ماں باپ اس محبت کے خلاف تھے، اُس کا سماج اور ونتی کا سماج اس رشتے کے خلاف تھا۔ ونتی کی شادی کسی دوسری جگہ ہو رہی تھی، خود اس کی سگائی، کہیں اور ہو رہی تھی، اور دونوں کی دنیا الگ تھی، بیچ میں ذات پات، امیری غریبی، شرافت نجابت کی دیواریں حائل تھیں اور وہ ایک فرد، تنہا، یکتا، اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ کیوں نہ وہ زندگی کو اس کے اندھے بہاؤ پر چھوڑ دے۔ جدھر جاتی ہے لے جائے، وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ نوجوان ہے، ابھی کالج میں پڑھتا ہے، بے کار ہے، اپنے ماں باپ کا اقتصادی غلام ہے، وہ ونتی کو لے کر بھاگ سکتا ہے۔ لیکن کہاں جائے گا وہ، اس اقتصادی دنیا کی غلامی میں اُس کی ناتجربہ کاری اُسے دربدر ٹھوکریں کھلائے گی، اور ونتی کا پھول سا حسن بھوک، فاقے اور بے کاری کے زہر آب میں کیسے پنپ سکے گا۔ ہاں، ہاں، یہ بالکل صحیح ہے عقل اور دانشمندی اور طبع سلیم کا یہی تقاضا ہے۔۔۔

اور پھر یکایک اس کے دل میں، اُس کی روح میں، ایک بے پناہ غصے کا طوفان لہریں لینے لگا، اور اُس کا جسم اس طوفان کے تھپیڑوں میں ایک کمزور کشتی کی طرح کانپنے لگا۔ بزدل۔۔۔ بزدل۔۔۔ بزدل۔۔۔ نکمے۔۔۔ کمینے، تم اسی طرح محبت کے پاکیزہ اور ارفع جذبے کی توہین کرتے ہو، اس کی حسین رعنائی کو اپنی بزدلی کی غلاظت سے ملوث کر کے اُسے دانشمندی، سلیم الطبعی خیال کرتے ہو، اس کی خوبصورتی، تابانی اور جمالیت کو اپنی اندھی اور غیر فطری طنز کے نشتر سے ہلاک کر کے اُسے اپنی اقتصادی مجبوری کا نام دیتے ہو۔ بزدل، ڈرپوک، کمینے، اگر تم اس نازک جذبے کی وسعتوں، گہرائیوں اور پنہائیوں میں پیرنے سے ڈرتے ہو، اگر تم اس کی رفعتوں اور سربلندیوں تک پرواز کرنے سے کتراتے ہو، اگر تم اس کی صعوبتوں، خطروں، اور تکلیفوں کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہو، تو جاؤ اپنی عفونت اور غلاظت کی کیچڑ میں کراہت انگیز کیڑے کی طرح کلبلاتے رہو، لیکن خدا کے لئے اپنی

بزدلی چھپانے کے لئے محبت کے لفظ کو یوں ارزاں نہ کرو، اُس کی رفعت کی تذلیل نہ کرو۔ اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سماج پر دشنام طرازی نہ کرو۔ اپنے ڈر کا جواز باہر کیوں تلاش کرتے ہو وہ سماج کا آہنی ہاتھ جو اس خوبصورتی، تابانی اور جمالیت کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ خود تمہاری گندی، رذیل روح کا ہاتھ ہے، وہ بدصورتی کی اندھی آنکھ تمہاری اپنی ہے، جو حیات نو کی درخشاں وسعتوں پر ایک تاریک اور ہولناک ہیولیٰ مستور کر رہی ہے، وہ پرانی روایت اور اوہام کا لنگڑا بھوت جو تمہاری خوشیوں اور مسرتوں پر ناچنا چاہتا ہے۔ خود تمہارے اندر چھپا ہوا ہے۔

اور شیام کے رگ و پے میں یہ آتشین سیال لہریں لینے لگا۔ اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے، وہ ونتی اور درگا داس کی شادی کبھی نہ ہونے دے گا۔ اور اس آنے والے سانحہ کا اپنی روح کی پوری قوت سے مقابلہ کرے گا۔

شیام نے سیداں کے ذریعے چھایا کو کہلوا بھیجا کہ وہ اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ چھایا اب شیام کے ہاں کم آتی جاتی تھی اور ونتی کا آنا جانا تو بالکل بند ہو گیا تھا۔ یوں بھی جب سے ونتی کے بیاہ کے متعلق گاؤں میں چرچے ہونے لگے تھے، روشن اُسے گھر سے بہت کم نکلنے دیتا تھا۔ ماں بیٹی پر اُس نے کڑی پابندیاں لگا دی تھیں، لیکن چھایا زخمی شیرنی کی طرح غصے سے بپھری بیٹھی تھی، گھر میں ہر روز لڑائی ہوتی تھی، ونتی نے کئی دنوں سے کچھ نہ کھایا تھا اور ہر وقت روتی رہتی تھی۔ یہ سب باتیں چھایا نے اُسے بتائیں۔

"لیکن موسی اب تم کیا کرو گی۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بیٹا۔ اب تو میں نے یہ سوچا ہے کہ اگر وہ میری مرضی کے خلاف بیاہ کریں گے تو بھری سبھا میں کھڑی ہو جاؤں گی، اور دھرم کے نام پر۔۔۔"

"موسی تم دھرم کی دہائی دیتی رہو گی۔ اور اُس دھرم کی آڑ لے کر پنڈت تمہاری لڑکی کا بیاہ بھی کر دیں گے۔"

"نہیں، نہیں، میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں چیخوں گی، دوہتڑ ماروں گی، بھری سبھا میں، اپنی ننگی چھاتی پیٹوں گی، کیا برادری اتنی بے شرم ہے۔۔۔"

شیام نے افسردہ انداز میں سر ہلایا۔ "اس سے کچھ نہ ہو گا موسی، میری بات سنو، تم ونتی کو لے کر شہر چلی جاؤ یا کسی اور گاؤں میں جہاں تمہارے واقف کار یا رشتے دار تمہیں پناہ دے سکیں، جب یہ مہورت ٹل جائے گا پھر واپس آ جانا۔"

"ہائے میری توبہ، لیکن وہ میرا ظالم بھائی، میں اُسے کیا کہوں، نہ جانے اُس کا خون کیوں سفید

ہو گیا ہے، وہ میرا ظالم بھائی، ونتی کی تو ایسی نگہداشت کرتا ہے کہ تم سے کیا کہوں، جی چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں۔۔۔ وہ تو مجھے بھی اِدھر اُدھر آنے جانے سے روکتا ہے۔ لیکن مجھ پر اُس کا بس اس قدر نہیں چلتا، اب کروں تو کیا کروں۔ تمہیں پتہ نہیں ہے، جب سے میں نے سنا ہے کہ اُس نے پنڈت سروپ کشن سے روپیہ لیا ہے۔ میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ ہر گھڑی ہر پہر میں اس آگ میں جلتی بھنتی رہتی ہوں۔ پرمیشر کرے وہ میرا بھائی مر جائے، اُس کی ارتھی میرے سامنے نکلے۔۔۔"

"گالیوں سے کچھ نہ بنے گا موسی، کوئی تدبیر سوچنی چاہیئے۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ چھایا چپ بیٹھی رہتی ہے۔ ہر روز لڑائی دنگا ہوتا ہے۔ ایک دن تو اُس نے مجھے اتنا مارا، اتنا مارا (آنسو پونچھ کر) میری پیٹھ پر ابھی تک اُس کے گھونسوں اور مکوں کے نشان ہیں اور صرف مجھے پیٹ لیتا، تو شاید اتنا دکھ نہ تھا۔ اُس نے میری معصوم کنواری لڑکی پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ کیا دنیا میں ایسے ظالم بھی ہوتے ہیں، جو معصوم کنجکا پر بھی ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ ہائے اس کا وہ ہاتھ جل جائے، جس ہاتھ سے اُس نے میری ونتی کے طمانچے لگائے۔ اُسے کوڑھ ہو جائے، اُس پاپی کو۔۔۔"

شیام قدرے توقف کے بعد بولا۔ "موسی تم جانتی ہو۔" وہ رک گیا۔

چھایا کے اُداس چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، کہنے لگی۔ "مجھے شک سا تھا پر اب میں جانتی ہوں۔"

شیام نے کہا۔ "یہ میری اپنی زندگی کا مطالبہ ہے کہ۔۔۔"

چھایا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہارے پتاجی، تمہاری ماتاجی۔۔۔"

شیام بولا۔ "سب کچھ طے ہو سکتا ہے لیکن یہ اشد ضروری ہے کہ یہ شادی نہ ہو، میرے ماں باپ آج نہ مانیں گے، کل نہ مانیں گے ایک سال بعد مانیں گے، کبھی تو مانیں گے، اور اگر نہ مانیں گے تو بھی کیا ہے۔"

چھایا بہت دیر تک چپ رہی پھر سر جھکا کر زمین کریدنے لگی، بولی۔ "اس موئی محبت نے مجھے زندگی میں کیا کیا دکھ نہیں دیئے۔"

اُس کی آواز میں بے حد تلخی تھی۔

"لیکن میں نے سوچا کہ بس اب ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ چاہے میرا سب کچھ ستیاناس ہو جائے، چاہے اس کے تن پر ایک لنگوٹ بھی نہ رہے، لیکن جب دل دیا ہے تو مرتے دم تک۔۔۔"

وہ چپ ہو گئی، اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔

"میری ونتی۔ میری ونتی۔" اُس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اور آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہے، پھر شیام نے کہا۔ "ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، میرے خیال میں تم اپنے بھائی روشن کے خلاف ایک دعویٰ دائر کر دو، کہ اُس نے پنڈت سروپ کشن سے اس مطلب کے لئے روپیہ لیا ہے، کہ وہ ونتی کا بیاہ۔۔۔"

"لیکن، اس طرح تو میرا بھائی جیل میں چلا جائے گا۔" چھایا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو اس طرح روپیہ وصول کرنا جرم ہے، تین سال کی سزا ہوتی ہے۔"

کچھ سوچ کر شیام نے کہا۔ "نہ سہی، یہ کہنے کی بھی کیا ضرورت ہے میرے خیال میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرا بھائی روشن ونتی کا بیاہ میری مرضی کے خلاف کرنے پر تلا ہوا ہے، نہ اس میں میری مرضی ہے، نہ میری لڑکی کی۔ بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے میں عدالت سے درخواست کرتی ہوں کہ بیاہ رکوایا جائے۔ بس، جب تک عدالت اس معاملے کی چھان بین کرتی ہے، بیاہ رک جائے گا۔"

"لیکن وہ تو میرا اور میری لڑکی کا گارڈین ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

شیام نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم کسی عرضی نویس سے اس مطلب کی ایک درخواست لکھوا لو۔ اسے انجنکشن کہتے ہیں۔"

"نجکشن۔"

"نہیں، انجکشن، وہ۔۔۔ عرضی نویس تمہیں سب کچھ بتا دے گا، بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم اس مطلب کی درخواست دو کہ روشن کو گارڈین شپ کے کام سے برطرف کیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

چھایا کے چہرے پر مسرت کی لالی دوڑ گئی۔ کہنے لگی۔ "بس یہ سب سے اچھی ترکیب ہے۔ میں کل ہی درخواست دیتی ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔" اور چھایا کا چہرہ پھر آزردہ ہو گیا۔۔۔ "لیکن یہ درخواست تحصیلدار صاحب کی کچہری میں دینی پڑے گی۔"

شیام نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو تم عرضی داغ دو باقی سب کام میں سنبھال لوں گا۔ میں خود پتاجی

سے بات کروں گا۔ وہ میری یہ بات نہ ٹالیں گے، مجھے اس کی پوری اُمید ہے۔"

۔ چھایا نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے تو بولی۔ "بیٹا تم نے میرے مردہ تن میں پھر جان ڈال دی ہے جگ جگ جیو بیٹا۔ ایک دکھیا کی دعا ہے۔"

شیام نے کہا۔ "تم سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر ہے۔"

جب چھایا چلی گئی، تو سیداں نے جو اس وقت تک خاموشی سے کنج میں گھاس صاف کر رہی تھی، شیام کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے صاحب۔"

شیام نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بالکل جلا بھنا بیٹھا تھا۔ زندگی سے بیزار۔ سیداں نے کھانس کر کہا۔ "میری قمیص بالکل پھٹ گئی ہے، اور پلّے ایک پیسہ بھی نہیں۔ مجھے ایک قمیص تو سلوا دیجئے۔"

شیام نے جیب سے دو روپے اور چند آنے نکالے اور اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ سیداں نے اُسے جھک کر سلام کیا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

کنج سے نکل کر وہ کھیتوں کی باڑھ پر ہولی۔ اور اپنے گھر کی طرف جانے لگی پھر ٹھٹک گئی پھر چند قدم آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رکی، پھر وہ آہستہ سے مڑی، چند قدم چل کر وہ پھر رکی، اور واپس اپنے گھر کی طرف ہولی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر رکی اور واپس مڑ آئی۔ اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ تحصیلدار صاحب کے بنگلے کے اندر چلی گئی۔

شیام کی والدہ ایک مونڈھے پر بیٹھی کوئی سبزی ترکاری کتر رہی تھیں، سیداں کو آتے دیکھ کر اُنہوں نے ترکاری ایک طرف رکھ دی، اور کہنے لگیں۔ "آؤ سیداں بیٹی۔"

سیداں اُن کے قریب فرش پر بیٹھ گئی اُس کا چہرہ زرد تھا۔ اور آنکھیں بے چین، پھر اُس نے اپنی آنکھیں نیچے جھکا لیں، اور آہستہ مدھم آواز میں کہنے لگی۔ "ماں جی آپ کو ایک بات بتاؤں۔ اگر آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں تو۔۔۔"

دوسرے دن علی الصبح غلام حسین نے آکر اطلاع دی کہ کل رات موہن نے بسنت کشن کو قتل کر دیا۔

چند لمحوں کے لئے شیام ہکا بکا رہ گیا، اس کی والدہ جو برآمدے میں کھڑی تھیں، اُسی وقت مونڈھے پر بیٹھ گئیں، اُن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، اور وہ جلدی جلدی سے کہنے لگیں "رام، رام، رام۔۔۔ گھور کلجگ ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہوا؟" شیام نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں، رات کے تیسرے پہر یہ خون ہوا ہے، سارے گاؤں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ بسنت کشن کی لاش کو لوگ اُٹھا کر ہسپتال لے گئے ہیں، وہاں بڑی بھیڑ ہے۔ سنا ہے کہ سرکاری کمیشن آج اپنا کام شروع کرنے والا تھا۔ بہت سے حاکم لوگ اور سرکاری کمیشن کے عہدیدار بھی وہاں پہنچے ہیں۔"

"رام۔۔۔ رام۔۔۔ رام۔۔۔ نرک زمانہ آیا ہے، براہمن کا خون؟ اور راجپوت کرے؟ کہاں راجپوت براہمنوں کی جان کی حفاظت کرتے تھے اور کہاں اب یہ زمانہ کہ وہ اب اُن کی ہتیا کرنے لگے ہیں؟ براہمن ہتیا؟ رام رام، مجھ سے تو کھڑا ہوا نہیں جاتا، میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکلی جا رہی ہے۔"

اور شیام کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

وہ پھر بولیں۔ "وہ راجپوت نہیں راکشس ہے، موہن سنگھ تو اب نیچ ہو گیا ہے، یہ اس نے جو ایک نیچ ذات کی عورت سے ناطہ جوڑا تھا۔ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو نکلنا تھا۔ سو دیکھ لو نتیجہ۔۔۔"

شیام کی والدہ نے اُس کے پتا کو یہ بات جا کر سنائی، اور جو اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ اُنہوں نے اُٹھ کر جلدی جلدی کپڑے بدلے، اور ہسپتال کو چلے گئے۔

شیام نے کہا۔ ”ماں میں بھی ذرا ہسپتال تک جاتا ہوں۔“

”نہ بیٹا، ناں۔“ اُس کی ماں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ میرے سارے جسم میں ابھی تک کپکپی ہے۔“

شیام نے کہا۔ ”کوئی فکر کی بات نہیں ماں۔“

غلام حسین بولا۔ ”موہن سنگھ بھی ہسپتال ہی میں ہے، اُس کی پیٹھ کے ایک دو زخم پھر کھل گئے ہیں، اور اُن میں سے بہت سا لہو بہا ہے، اب اُسے ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر چارپائی پر لٹا رکھا ہے اور پولیس کی ایک پوری گارد کا پہرہ لگا ہے۔“

”ہائے، مر جائے وہ جس نے براہمن ہتیا کی ہے۔“

ہسپتال میں لوگوں کی بہت بھیڑ تھی، برآمدے میں اور باغیچے میں، اور وارڈوں کے چاروں طرف اور لکڑی کے جنگلے پر لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ یا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، ایک جھمگھٹے میں ایک سانولے رنگ کا نوجوان جس کے دائیں گال پر ایک بڑا سا مسا اُبھرا ہوا تھا، بہت زور زور سے بازو ہلا ہلا کر باتیں کر رہا تھا۔

”تو میں نے جھٹ اُس کی باہوں کو اپنی باہوں کی لپیٹ میں لے لیا، اور اُس نے مجھ پر چھری سے وار کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اُس کی باہیں میرے قابو میں تھیں۔ میں نے اُس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کر جواڑی کھوڑا دیا تو وہ دھم سے زمین پر آ گرا۔“

”موہن سنگھ کی بات کرتے ہو؟“ شیام نے پوچھا۔ ”لیکن یہ ماجرا کیا ہے۔“

اُس سانولے نوجوان نے اُسے سلام کیا، اور کہنے لگا۔ ”بات یہ ہوئی جناب، کہ رات کے تیسرے پہر میں نے اپنے ہمسائے کے گھر میں شور سنا، ہمارا گھر پنڈت بسنت کشن اور سروپ کشن کے گھروں کے بالکل قریب ہے۔“

”اچھا؟“ شیام نے استفسار کیا۔

ایک آدمی بول اٹھا۔ ”یہ لالہ کونڈو مل کے لڑکے ہیں نا، جگجیت۔“

”جی ہاں، جی ہاں۔“ شیام نے سر ہلایا۔

جگجیت بولا۔ ”تو تیسرے پہر کے قریب ہم نے اپنے ہمسائے کے گھر سے بڑا شور بلند ہوتا ہوا سنا۔ بچوں اور عورتوں کے رونے کی آوازیں، اور چیخیں۔ درگا داس بھی چیخ رہا تھا۔ اور پنڈت سروپ کشن بھی گاؤں والوں کو اور اپنے ہالیوں کو جو نیچے بانڈیوں میں سوئے پڑے تھے، آوازیں دے رہے تھے، اور عورتیں رو رہی تھیں اور چیخیں مار رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ بپا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

میں اُسی وقت اُٹھ کر بھاگا، بس یہی قمیص اور لنگوٹ پہنے ہوئے تھا، جلدی میں جوتی بھی نہ پہنی، اور نہ ہی لاٹھی یا کلہاڑی یا کوئی اور چیز ساتھ لی، بھاگا بھاگا گیا، معلوم ہوا کہ ابھی ابھی موہن سنگھ نے چھرے سے پنڈت بسنت کشن کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ دیوار پھلانگ کر پنڈت سروپ کشن کے مکان میں داخل ہوا، لیکن اتنے میں بسنت کشن کی عورت اور اُس کے بچوں نے شور مچانا شروع کیا۔ اور سب لوگ جاگ پڑے۔ پنڈت سروپ کشن اور اُن کے لڑکے نے جو اوپر سوئے ہوئے تھے گاؤں والوں کو آوازیں دینا شروع کیں۔ اور ان کی عورت میرا مطلب ہے پنڈت سروپ کشن کی گھر والی جو نیچے کمرے میں سوئی ہوئی تھیں، چیخیں مارنے لگیں، اور ہالیوں کو اور پولیس والوں کو آوازیں دینے لگیں۔ موہن سنگھ ہاتھ میں چھری لئے کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر وہ اُن کے آنگن سے باہر نکل گیا اور مکی کے کھیتوں کی مینڈ پر چلنے لگا، اور یہ سب کچھ اتنی جلدی، اتنی سرعت اتنے تھوڑے سے عرصہ میں ہوا کہ جب میں وہاں پہنچا، تو وہ ابھی تک مکی کے کھیت کی باڑھ کے آخری کونے پر چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے لپک کر اُس کا تعاقب کیا، لیکن وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اور اب وہ کھلے راستے پر ہو گیا جو دھرمشالہ کے قریب سے گزرتا ہے، اور پولیس کی چوکی سے ہوتا ہوا ہسپتال کو جاتا ہے۔ میں نے اُسے آوازیں دیں، اور اُسے ٹھہر جانے کو کہا۔ لیکن اب وہ ذرا تیز قدموں سے چلنے لگا پھر آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ میں نے جلدی سے بھاگ کر اُسے جا لیا، اُس نے مڑ کر مجھ پر چھرے سے وار کرنے کی کوشش کی، لیکن میں نے جھٹ اُس کی باہوں کو اپنی باہوں کی لپیٹ میں لے لیا، اُس نے کہا ”مجھے چھوڑ دو، میں نے خون نہیں کیا۔ میں نے انصاف کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ عدالت بتائے گی۔“ اُس نے مجھ پر چھری سے وار کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی باہیں میرے قابو میں تھیں، اور میں نے اُس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کر اُسے جو ایک پٹخنی۔۔۔“ پنڈت

پیڑارام بولے۔ ”تو کیا آپ کی مدد پر اور کوئی نہ آیا۔ جب پنڈت سروپ کشن جی نے اپنے ہالیوں کو آوازیں دیں، جو وہیں ان کے گھر کے نیچے اُن کی باڑھی میں سوئے پڑے تھے، تو کیا وہ نہ اُٹھے۔“

”اجی کہاں۔“ جگجیت نے بازو گھما کر کہا۔ ”وہ سب ہالی ہیں وہ تو چاہتے ہیں کہ زمیندار مر جائے، اس کا سارا گھر ستیاناس ہو جائے، اُن کو اس سے کیا واسطہ اور پھر اُس وقت اُن کو ایسی کیا ضرورت پڑی تھی کہ تیسرے پہر اٹھ کر موہن سنگھ جیسے خوفناک قاتل کے پیچھے بھاگتے۔“

ایک ہالی اسی جمگھٹے میں کھڑا تھا، بولا۔ ”نہیں بھائی، یہ بات نہ تھی۔ ہم اس وقت باڑی کے اندر بڑی گہری نیند سوئے ہوئے پڑے تھے۔ اُسی باڑی میں مال مویشی، اُسی میں ہم ایک ہی دروازہ ہے وہ بھی بند تھا۔ اور کوئی کھڑکی بھی نہ تھی۔ سچ مانیو ہم نے کسی کی آواز نہیں سنی، نہ کسی کا بلاوا۔ بڑے مزے سے سوئے رہے دن بھر کا کام کاج کرتے کرتے آدمی تھک جاتا ہے، ہم تو کدالی اور ہل چلاتے ہیں۔ دکان پر تو بیٹھتے نہیں۔ ہمیں تو پنڈت جی نے خود ہی آ کر جگایا تب ہمیں پتہ چلا۔ یہ بات نہیں ہے جگجیت بھائی جی، ہم تو اپنے مالک کے نمک حلال ہیں۔ پر ہماری آنکھ ہی نہیں کھلی۔“

گڑگنجا جی بولے۔ ”ہاں، ہاں، ہم تم لوگوں کی نمک حلالی بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔“

ہالی نے دیکھا کہ لوگ اُس کے خلاف ہوئے جا رہے ہیں، تو لالہ بھنجی مل سنار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”لالہ جی، آپ ہی انصاف کیجئے اگر آدمی باڑی میں سویا پڑا ہو، اور باڑی بھی ایسی جس میں صرف چھت سے ہوا نکلتی ہو، اور کھڑکی نہ ہو، تو کیا آدمی اندر سویا ہوا باہر کے لوگوں کی آواز سن سکتا ہے۔“

”رہنے دو، رہنے دو اپنی صفائی۔“ ایک چوکیدار نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں یہ سب باتیں اچھی طرح معلوم ہیں۔“ پھر وہ جمگھٹے کے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اجی کوئی پتہ نہیں، کہ یہ سب ہالی موہن سنگھ سے در پردہ ملے ہوئے ہوں۔“

لوگ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

ایک بولا۔ ”ان ہالیوں کو بھی پولیس کے حوالے کرنا چاہئیے۔“

دوسرا بولا۔ ”پولیس خود ان سے سچ کہلوائے گی۔“

ہالی بولا۔ ”دہائی ہے سرکار کی دہائی ہے۔ گاؤں کے مالکو تم کیسی باتیں کرتے ہو۔“

تیسرا بولا۔ ”ابھی پولیس تمہیں سب کچھ بتائے گی۔ جب تھانیدار یار محمد نے آنکھیں لال

کیں، اور سرکاری ڈنڈا تمہاری ٹانگوں کے بیچ میں دیا گیا، پھر تمہارا سچ جھوٹ خود ہی کھل جائے گا۔“

ہالی بڑبڑانے لگا۔

جگجیت کہنے لگا۔ ”تو میں کہہ رہا تھا، کہ میں نے اُس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کر اُسے جو اڑی کھوڑا دیا، تو وہ دھم سے نیچے آ گرا، وہ پیٹ کے بل گرا تھا اور اُسی طرح گرا رہا۔ پہلے میں نے سوچا کہ مکر کرتا ہے اور کوئی داؤں لگا کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ بس اُس کے سر کے اوپر کھڑا رہا کہ وہ اٹھے تو اسے ایک اور پٹخنی دوں لیکن وہ نہ اٹھا تب میں نے اُس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ یقین مانیئے، موہن سنگھ کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا، اور اس کی آنکھیں بند تھیں اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کی کمر اور پیٹھ لہو سے تربتر تھی۔ تب میں چلانے لگا اور میں نے پولیس والوں اور چوکیداروں اور پنڈت سروپ کشن کو اور سارے گاؤں والوں کو آوازیں دیں۔ اور بہت سے لوگ دوڑے دوڑے آئے، دراصل موہن سنگھ بے ہوش ہو گیا تھا۔ پھر لوگ اسے تھانے میں لے گئے اور وہاں سے اب اُس ہسپتال میں لائے ہیں اور میں نے تو یہ۔۔۔“

ایک آدمی جو ابھی اس جمگھٹے میں داخل ہوا تھا، بولا۔ ”موہن سنگھ کی بات کرتے ہو کیا اُسے پھر ہسپتال میں لائے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ جگجیت نے بتایا۔

”لیکن یہ۔۔۔ یہ قتل کیسے ہوا۔“

”بات یہ ہوئی۔“ جگجیت نے کہا۔ ”کہ کوئی تیسرے پہر رات کو میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے ہمسائے کے گھر سے شور بلند ہوتا ہوا سنا ہمارا گھر پنڈت بسنت کشن اور پنڈت سروپ کشن کے گھر کے پاس ہے نا۔۔۔“

شیام ٹہلتا ٹہلتا دوسرے گروہ میں جا ملا، یہاں ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ”میں ایمان کی بات کرتا ہوں، میں نے سنا ہے، کہ بسنت کشن نے ایک دفعہ چندرا کو گھاٹی پر چھیڑا تھا اور اُس کی عصمت دری کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ ایک براہمن نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ”ہو سکتا ہے بھئی! ہو سکتا ہے بھئی! ہم سب بسنت کشن کو اچھی طرح جانتے

ہیں، گاؤں کا کونسا ایسا شخص ہے جو اُس کے چال چلن سے واقف نہ تھا۔ پرماتما اُسے سورگ نصیب کریں مرے ہوئے کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیئے۔"

"لیکن ایمان کی بات ہے۔" پہلا آدمی پھر کہنے لگا۔ "ایمان کی کہو خدا کے آگے سب کو جان دینی ہے۔"

"تو اس میں کیا ہے۔" ایک اور آدمی بولا۔ "اس حرامزادی چندرا کا کیا ہے، نیچ ذات کی آوارہ عورت تھی۔ اگر بسنت کشن نے اُس سے ایک دو مذاق کر بھی لئے تھے، تو ایسی کونسی آفت آگئی تھی۔ وہ کونسے ایسے عالی نسب خاندان کی تھی۔ ملکہ تھی؟ شہزادی تھی؟ کیا تھی وہ۔ کل تک وہ اور اُس کی ماں ٹکے ٹکے کے لئے گاؤں میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ اور آج بڑی عزت والی بن گئیں اونہہ۔"

ایک اور آدمی بولا۔ "لیکن بھئی، تھی تو وہ ایک راجپوت کی آشنا، راجپوت سے لگ کر خود راجپوتنی ہو گئی تھی۔"

سب ہنسنے لگے۔

شیام کو اُن کا ہنسنا بے حد ناگوار گزرا۔ پہلا آدمی کہنے لگا۔ "میں ایمان کی کہتا ہوں۔ نہ میں اس کی طرف داری کروں گا، نہ اُدھر کی ایمان کی سنو تو بات یہ ہے، کہ موہن سنگھ راجپوت ہے۔ بڑے کینڈے کا جوان ہے، وہ اپنی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتا تھا؟"

"تو کیا آدمی ان ذرا ذرا سی باتوں کے لئے لوگوں کو قتل کرتا پھرے واہ، یہ بھی آپ نے خوب کہی۔"

ایک اور آدمی مجمع میں سے بولا۔ "سنا ہے اُس نے بسنت کشن کی پسلیوں میں چھرا گھونپ دیا تھا، بس اسی وقت مر گیا۔"

"نہیں مرا تو وہ دیر کے بعد۔ بہت دیر تک خون بہتا رہا، پھر اُس کی لاش کو یہاں ہسپتال لے آئے۔"

"قاتل بھی یہیں، مقتول بھی یہیں، کیا قسمت ہے۔"

"اُس کے کھیل نیارے ہیں۔"

"واہ سائیاں!"

"تیری لیلا اپرم پار ہے۔"

"واہ گورو، واہ گورو۔"

ایک آدمی برآمدے میں سے دوڑتا ہوا آیا، سب لوگوں کی نظریں اُس کی طرف لگ گئیں، وہ بھاگتا ہوا آیا اور برآمدے سے چھلانگ مار کر نیچے باغیچے میں آرہا، جہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے اُس نے چلا کر کہا۔ "بسنت کشن مرا نہیں۔"

باغیچے میں خاموشی چھاگئی، سب لوگ حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگے۔

"بسنت کشن مرا نہیں۔" اُس نے چلا کر کہا۔ "وہ زندہ ہے۔"

خاموشی، گہرا سناٹا۔۔۔ دور، شیام نے چیل کی چیخ سنی۔ دور اوپر فضاؤں میں۔

"وہ زندہ ہے، اُس آدمی نے پھر بلند آواز میں کہا۔ "یقین نہ ہو، تو ڈاکٹر سے پوچھ لو، وہ مرا نہیں تھا بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُس کی نبضیں چھوٹ گئی تھیں گھر والوں نے سمجھا وہ مر گیا۔ چل کر ڈاکٹر سے پوچھ لو، اُس کی نبض واپس آگئی ہے۔"

لوگوں کے چہرے پر نااُمیدی کے آثار نمودار ہونے لگے، جیسے اُنہیں اس کی بات پر کچھ یقین آنے لگا تھا۔

دوسرے لمحے میں سب لوگ آپریشن روم کی طرف دوڑے۔

لیکن پولیس والوں نے اُنہیں ادھر جانے سے روک دیا اور وہ آدھے راستے میں کھڑے ہو گئے، پنڈت سروپ کشن اُن کی طرف آرہے تھے سب لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اُنہیں نمسکار کہی۔

"پنڈت جی؟" بہت سے لوگوں نے ایک دم پوچھا۔

پنڈت جی نے اُن کا عندیہ سمجھ لیا ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "ہاں میرا بھائی زندہ ہے۔ ابھی زندہ ہے۔"

چاروں طرف سے لوگ اُنہیں بدھائی دینے لگے، پنڈت جی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور سب کی بدھائی لینے لگے۔

اپریشن روم میں ڈاکٹر، بسنت کشن کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ سرکاری کمیشن نے اُس کی معطلی کے احکام منسوخ کر دیئے تھے، کیونکہ ساری تحصیل میں کوئی اور ڈاکٹر نہ تھا، اور یوں بھی اب اس

معاملے کی نوعیت ہی بدل گئی تھی اور پھر یوں بھی تو اس معاملے کی تحقیقات کے لئے اس کی معطلی اس قدر ضروری نہ تھی اس لئے یہی بہتر سمجھا گیا تھا۔

بسنت کشن ابھی تک بے ہوش تھا۔ اُس کی ناک اب ٹیڑھی اور نیچے کو مڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لب ڈھیلے اور بے جان سے، باہر کو نکلے ہوئے ماتھے پر لمبے بال الجھتے ہوئے اور وہ سبز رنگ کا اوم ماتھے کے ایک کونے میں کھدا ہوا بڑا ہی عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

پوچھنے پر ڈاکٹر نے اُسے بتایا۔ "خون بہت نکلا ہے۔ جریان خون ابھی تک پورے طور پر بند نہیں ہوا۔ مجھے اس کے بچنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی پھر بھی کوشش کرنا ہمارا کام ہے۔"

"ہاں بجا فرمایا آپ نے۔۔۔" اور شیام نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "اور سنا ہے کہ موہن سنگھ کے زخم۔۔۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "موہن سنگھ کے زخم پھر کھل گئے ہیں۔ ساری محنت اکارت گئی ہے، بڑا بے وقوف نکلا ہے وہ، جاہل!"

باغ کے ایک کونے میں یوکلپٹس کے تنے کا سہارا لئے چندرا بیٹھی تھی۔

"چندرا۔" شیام نے آہستہ سے کہا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"چندرا۔" اُس نے دوبارہ کہا۔

چندرا نے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر نگاہیں پھیر کر فضا میں جما دیں، اُس کے زرد لب بھنچے ہوئے تھے، اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں وہ اُس کے چہرے پر اُس بے مثال عزم کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ جس کی پرواز نااُمیدی اور موت، اور ظلم کی حدود سے بھی بلند ہے۔

"چندرا۔" شیام نے اُس کے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "بسنت کشن مرا نہیں، وہ زندہ ہے، اُس کی نبض واپس آ گئی ہے۔"

— چند لمحے چندرا چپ چاپ فضا میں تکتی رہی، پھر آہستہ آہستہ اُس کے زرد چہرے پر خون واپس آنے لگا، بھنچے ہوئے لبوں کا تناؤ کم ہوتا گیا، اور اُس کی بڑی بڑی مٹر مٹر تکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو اُبھرنے لگے۔

دوسرے دن بھی بسنت کشن مرا نہ تھا، وہ زندہ بھی نہ ہوا تھا بلکہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا، ایک غیر یقینی، غیر فیصلہ کن حالت تھی۔ موہن سنگھ کے زخم پھر خراب ہو گئے تھے اور اُن میں پیپ چڑھ آئی تھی۔ لیکن اب چندرا کو اُس کی تیمارداری کرنے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ موہن سنگھ کے دوسرے رشتے داروں کو بھی اُس کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ہسپتال کے ملازم ہی اُس کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ باہر پولیس کا پہرہ تھا اور اندر بھی گارد کے آدمی بیٹھے رہتے تھے۔ اُسے بیڑیاں پہنا رکھی تھیں، اور ہتکڑیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ گو ہسپتال میں بیڑیاں اور ہتکڑیاں اتار دی جاتی ہیں، لیکن اب ڈاکٹر بھی ایسا مشورہ دیتے ہوئے گھبراتا تھا۔ موہن سنگھ نے اپنا اعتبار کھو دیا تھا۔ اب وہ ایک مریض ہی نہ تھا۔ ایک خطرناک ملزم بھی تھا، ایک خونی۔

جب وہ ہوش میں آیا، تو پولیس والوں نے اُس سے بہتیرے سوالات کئے۔ شیام کے والد نے مجسٹریٹ علاقہ ہونے کی صورت میں اُس کے بیانات قلمبند کرنے کی کئی بار کوشش کی لیکن اُس نے کسی قسم کا بیان دینے سے یکسر انکار کر دیا، نہ وہ پولیس کے کسی سوال کا جواب دیتا تھا۔ بس ایک چپ سادھے لیٹا تھا۔ کبھی کبھی کراہنے لگتا کیونکہ زخموں کے کھل جانے سے تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اب چندرا بھی اُس کے پاس نہ تھی۔

جب اُسے بتایا گیا کہ بسنت کشن مرا نہیں زندہ ہے، تب اُس نے کچھ نہ کہا صرف اُس کا چہرہ نعش کی طرح سفید ہو گیا اور اُس نے اپنے لبوں کو اتنے زور سے چبایا کہ اُن میں سے خون جاری ہو گیا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے، وہ کہاں ہے؟ پولیس اُس پر سختی بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ مجرموں سے اقبال کرانے والا خوفناک ڈنڈا جو انسانی ٹانگوں کے بیچ

میں رکھا جاتا تھا، یہاں استعمال نہ کیا جاسکتا تھا کیونکہ موہن سنگھ کی پیٹھ پہلے ہی زخموں سے چھلنی تھی، اور اگر تشدد کیا جاتا تو شاید وہ مر جاتا۔ وہ اُسے ایک ہی سزا دے سکتے تھے کہ وہ چندرا کو اُس کے پاس نہ آنے دیں۔ اور وہ سزا اُسے مل رہی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنے دل کے اندھیارے میں کسی کو راستہ ٹٹول کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا، اور اُس کی سانس رکنے لگتی، اور اُس کی انگلیاں کسی جانے پہچانے نازک ہاتھ کو چھو لیتیں، اور پھر وہ اس نرم و نازک گٹھڑی کو اپنی چھاتی سے لپٹا لیتا، حتیٰ کہ اُسکے کھلے ہوئے زخموں میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ وہ اس کے بالوں سے کھیلنے لگتا، حتیٰ کہ اُسے نیند آنے لگتی، اُس کی سانس آرام سے چلنے لگتی، اور وہ اسی گٹھڑی کو اپنی چھاتی سے لپٹائے سو جاتا۔۔۔ اور پھر تھوڑے عرصے کے بعد، دس منٹ کے بعد یا ایک گھنٹے کے بعد یا دو گھنٹوں کے بعد، وہ ایک دم کانپ کر جاگ اُٹھتا، اور دیکھتا کہ اُس کی چھاتی سے وہ نرم و نازک گٹھڑی نہیں لگی ہوئی ہے، بلکہ لوہے کی آہنی زنجیریں ٹھنڈی، یخ بستہ، بے رحم، بوجھل، اور اُس کی پاؤں کی ایڑیوں سے لے کر کنپٹیوں تک ایک اذیت ناک درد کا دورہ شروع ہو جاتا، جیسے کوئی اُس کے زخموں میں آتشیں سلاخیں چبھو رہا ہے، بے رحمی سے، زور زور سے، زخم کے اندر، دور تک، اس کے دل تک، اُس کی روح کے آخری گوشے تک چبھوئے جا رہا ہے، اور وہ اس کرب انگیز درد کی تاب نہ لا کر کراہنے لگتا، اور اس کا جی چاہتا کہ چندرا آ جائے، کہیں سے آ جائے، بند دروازوں کو توڑ کر پتھر کی دیواروں کو چیر کر، کہیں سے آ جائے، ایک لمحے کے لئے آ جائے، ایک ثانیئے کے لئے آ جائے کہ وہ اُس کے پیارے چہرے کو دیکھ لے۔ اُس کی اُنگلیوں کے نازک لمس سے بہرہ ور ہو سکے۔ اُس کے جانے پہچانے بالوں سے کھیل لے، اور وہ ایک نرم و نازک گٹھڑی بنی ہوئی اُس کے کلیجے سے لگ جائے اور اُس کے رستے ہوئے زخموں میں ٹھنڈک پڑ جائے۔۔۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔۔۔ آہ، صرف ایک لمحے کے لئے۔۔۔

اور وہ اپنے لب زور سے بھینچ لیتا، اور آہستہ آہستہ کراہنے لگتا، بے جوڑ، بے ترتیب انداز میں سوچنے لگتا، ایسے خیالات جن میں خلا کے لمبے لمبے وقفے ہوتے تھے۔ نہیں، نہیں، میں چندرا سے نہیں ملوں گا۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں،۔۔۔ میں تاب نہ لا سکوں گا۔۔۔ اُس کی دلدوز نگاہیں میرے دل کو چیر دیں گی۔۔۔ میں۔۔۔ میں بے صبر ہو کر سب کچھ بک دوں گا نہیں، نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ او میرے پرمیشر۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ میرے رام۔۔۔ ابھی نہیں اس درد نے۔۔۔

اور اُسے آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے دیکھ کر کوئی پولیس کا سپاہی کہہ اٹھتا، "موہن سنگھ، درد ہوتا ہے، چندرا کو بلاؤں۔"

اور پھر وہ سب قہقہہ لگا کر ہنستے۔

گو چندرا کو موہن سنگھ سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اُس کی تیمارداری کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ اُس ہسپتال کی چار دیواری سے کہیں باہر نہ جاتی تھی۔ وہ اس وارڈ کے ارد گرد کسی بے قرار فاختہ کی طرح منڈلاتی رہتی۔ یا پھر خاموش اور اُداس ہو کر باغیچے کے کسی کونے میں ٹھہر رہتی۔ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی دھمکیاں اس پر کوئی اثر نہ رکھتی تھیں، لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر بھی وہ کہیں اور جانے کے لئے راضی نہ ہوئی، رات کو وہ ہسپتال کے برآمدے ہی میں ایک کمبل اوڑھ کر سو جاتی تھی۔ اُسے سوتے ہوئے بھی لوگوں نے کم دیکھا تھا۔ عموماً وہ برآمدے کی دیوار سے لگی لگی گھنٹوں بیٹھی رہتی، یا پھر اُس کے وارڈ کے گرد چکر لگاتی، جہاں اُس کا زخمی محبوب پولیس کی حراست میں تھا، اُس کی حالت اُس پرندے کی طرح تھی، جس کے گھونسلے پر کسی غاصب چیل نے قبضہ کیا ہو، اور وہ چیختا ہوا اپنے آشیانے کی شاخ کے گرد منڈلاتا پھرے۔ اور چندرا کا چہرہ بھی ایک خاموش چیخ تھا ایک ایسی دلدوز چیخ جس کی خاموشی ہسپتال کی فضا میں ایک تیر کی طرح سنسناتی معلوم ہوتی تھی۔

اور کبھی کبھی وہ پوچھ لیتی۔ "اس کا حال کیسا ہے؟ اچھا تو ہے نا!"

اور سپاہی کہتے۔ "بہت اچھا ہے بہت اچھا ہے، تمہیں ہر وقت یاد کرتا ہے۔" اور وہ قہقہے لگاتے، اور چندرا کا چہرہ غصے سے آگ ہو جاتا، اور اُس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں، اور اُس کی آنکھیں لال انگارہ ہو جاتیں، اور وہ شدید غصے کی حالت میں کانپنے لگتی، چند لمحوں تک ساکت کھڑی رہتی اور پھر آہستہ سے وہاں سے چلی جاتی، اپنے دل کو سمجھاتی ہوئی، گھبراؤ نہیں منا۔ گھبراؤ نہیں منا، سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

شیام قریب قریب ہر روز اُس سے ملنے جاتا تھا اور اُسے "تسلی و تشفی دیتا رہتا، اور اُس کی اور اُس کی والدہ کی ضروریات پوری کرتا رہتا، کیونکہ اب اس واقعے کے بعد اس سارے گاؤں میں بلکہ سارے علاقے میں اُن کا کوئی ہمدرد نہ رہا تھا۔ سبھی اُن سے نفرت کرتے تھے۔ اور اُن کے سائے سے

بھی ڈرتے تھے، ہاں وہ ہر وقت گالیاں بکنے والا بام دیو بھی اُن کا ہمدرد بن گیا تھا۔ اور ہر ممکن طریق سے اُن کی مدد کرنے پر آمادہ رہتا۔ اور کبھی کبھی چندرا کی سہیلی نوراں آجاتی۔

پانچ چھ روز کے بعد بسنت کشن کی حالت میں ذرا سا تغیر پیدا ہوا، ایک تو یہی امر امید افزا تھا کہ وہ اتنے دن مرا نہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اب کچھ امید بندھ چلی ہے کہ شاید بچ جائے۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ شاید بسنت کشن بچ جائے گا۔"

"ہاں۔" شیام نے کہا۔ "ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب اُس کے بچ جانے کی اُمید ہے۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ موہن کو اب پھانسی نہ ہو گی۔"

"ہاں۔ اگر بسنت کشن بچ گیا۔ تو اُسے پھانسی نہ ہو گی، شاید عمر قید کی سزا ہو۔ شاید اس سے بھی کم، وہ جوان ہے اور یہ اس کا پہلا جرم ہے۔"

"عمر قید کی سزا کتنی ہوتی ہے؟"

"چودہ سال۔"

"میں۔۔۔ میں چودہ سال بھی اس کا انتظار کر سکتی ہوں۔ میں زندگی بھر اُس کا انتظار کرتی رہوں گی۔" چندرا نے تیز لہجے میں کہا۔

پھر بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہے۔

یکایک چندرا نے کہا۔ "لیکن اگر وہ یہاں سے بھاگ نکلے۔"

شیام اس کا منہ تکنے لگا۔ چندرا کی جرات، اُس کا دلیر تخیل اُسے ہمیشہ حیران کر دیا کرتا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔" چندرا اُسے سمجھانے لگی "جب وہ اچھا ہو جائے، لیکن ابھی ڈاکٹر نے اس کی صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہ دیا ہو، تو اُن دو تین دنوں میں کیا وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے کیوں؟" وہ شیام کی طرف پر امید انداز میں دیکھنے لگی۔

"ہاں، ایسا ممکن ہو سکتا ہے، لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"وہ بھاگ کر جائے گا کہاں۔"

"کہیں دور۔ غیر علاقے میں، جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ وہاں ہم پھر سے نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔"

نئی زندگی؟ چندرا کا چہرہ روشن ہو اٹھا تھا۔

"لیکن یہاں سے بھاگنا بھی تو مشکل ہے، ہر وقت پولیس کا پہرہ ہوتا ہے اور پھر وہ تو اب بہت کمزور ہے، اُس کے زخم......"

"وہ اچھا ہو جائے گا۔" چندرا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بھاگنا بھی کوئی مشکل نہیں۔ میں کوئی نہ کوئی سبیل ڈھونڈ لوں گی، پھر ہم کہیں دور غیر علاقہ میں، کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ کچھ عرصہ بھیس بدلے چھپے رہیں گے اور جب یہ شور شرابہ ختم ہو جائے گا، ہم پھر سے اپنی نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔"

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "ایک کام۔۔۔ ایک کام کر دو۔" اور اُس نے شیام کا بازو پکڑ لیا۔

"کیا؟"

"تھانیدار سب کچھ کر سکتا ہے، اُس کے ایک ذرا سے اشارے پر ہمیں بھاگ جانے کا موقع مل سکتا ہے۔"

شیام کے چہرے پر ایک اُداس ناامید مسکراہٹ عود کر آئی۔ بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے قتل کا مقدمہ ہے وہ یہ کام کیوں کرے گا برخاست ہو جائے گا۔"

چندرا بولی۔ "لیکن اب کے موہن ہسپتال سے بھاگے گا نہ کہ پولیس کی حوالات سے۔ گارد کی ذرا سی غفلت سے سب کام بن سکتا ہے اور تھانیدار پر بھی کوئی آنچ نہ آنے پائے گی، کیوں؟"

شیام نے کہا۔ "اچھا میں کوشش کروں گا۔"

چندرا نے آہستہ سے کہا۔ اب وہ شاید اپنے آپ سے گفتگو کر رہی تھی۔ "اگر تھانیدار نہ مانے تو بھی، کام ہو سکتا ہے موہن سنگھ کی دلیری، گارد کی ذرا سی چوک،۔۔۔ گارد کے سپاہیوں کو بھی پھسلایا جا سکتا ہے، رشوت۔۔۔"

اور شیام دیکھ رہا تھا، کہ اس دلیر عورت کے دل میں کس طرح ایک نیا اور بے حد خطرناک ارادہ جڑ پکڑ رہا ہے، وہ دل ہی دل میں اُسے سراہنے لگا۔ کاش وہ بھی اتنا ہی دلیر ہوتا اتنے ہی فولادی عزم کا انسان ہوتا۔ کاش وہ بھی ونتی کو اٹھا کر کسی غیر علاقہ میں بھاگ سکتا، وہ کیوں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ سوچنے لگا۔۔۔

دوسرے دن شام کے وقت جب وہ اور علی جو سیر کے لئے نکلے، تو اُنہیں راستے میں ڈاکٹر مل گیا، بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے مبارک باد دیجئے، حکام بالادست نے سرکاری کمیشن کو واپس بلا لیا ہے۔''

علی جو اور شیام یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور اُسے مبارک باد دینے لگے۔

''آپ کو کب پتہ چلا۔'' علی جو نے پوچھا۔ عموماً ایسے معاملوں کا اُسے سب سے پہلے پتہ چل جاتا تھا۔

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر ہوئی تار آیا تھا۔ مجھ سے کمیشن کے ایک ممبر نے کہا۔''

''مبارک! مبارک۔'' علی جو نے دوبارہ کہا۔

''آپ لوگوں کی دعا ہے۔'' ڈاکٹر کہنے لگا۔

''کہئے۔'' علی جو نے پوچھا۔ ''آپ کے مریضوں کا کیا حال ہے؟''

''میرے خیال میں۔۔۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے جائیں گے بسنت کشن کے بچنے کی امید بڑھتی جائے گی، اب یوں سمجھئے کہ چالیس فیصدی اُس کے بچنے کی اُمید ہے۔''

''اور موہن سنگھ کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہو رہا ہے۔ پہلے سے حالت اچھی ہے لیکن کمزور ہو گیا ہے کسی سے بات چیت نہیں کرتا میرے خیال میں اگر چندرا اُس کے پاس ہوتی۔۔۔''

علی جو نے ہنس کر کہا۔ ''کیا آپ کا ارادہ سرکاری کمیشن کو دوبارہ بلوانے کا ہے۔'' اور وہ تینوں ہنسنے لگے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن اُس بے چاری کو موہن سنگھ سے ملاقات کا موقع تو دینا چاہئے۔''

علی جو بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ بھی بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اجی صاحب، یہ کام پولیس کا ہے وہ کسی سے ملنے دے یا نہ ملنے دے، میں اور آپ اس معاملہ میں کیا کر سکتے ہیں، اچھا آپ ہی بتایئے وہ کس طرح اُس سے مل سکتی ہے۔ وہ نہ اس کی رشتے دار ہے، نہ اس کی بیوی، از راہ قانون وہ اُس سے ملاقات کی درخواست بھی نہیں کر سکتی۔''

شیام بولا۔ ''ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک طرح سے میاں بیوی ہیں۔ چندرا موہن سنگھ سے عشق کرتی ہے۔''

علی جو بولا۔ ''قانون میں عشق کو کیا دخل۔''

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے ان دونوں سے مصافحہ کیا۔ ''معاف کیجئے گا، مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے، ورنہ میں بھی آپ کے ساتھ باہر گھومنے کو چلتا۔ آداب عرض۔''

''آداب عرض۔''

کچھ عرصہ تک وہ دونوں خاموش چلتے رہے۔ پھر علی جو بولا۔ ''وہ آپ کو پتہ ہے، چھایا نے اپنے بھائی کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا ہے۔''

''کیا؟''

''یہی کہ روشن کی سرپرستی اُنہیں منظور نہیں، اُسے سرپرست نہ رہنے دیا جائے۔ نیز یہ کہ وہ ونتی کی شادی درگاداس سے کر رہا ہے، اور یہ شادی ۵ ستمبر کو قرار پائی ہے، اور یہ شادی چھایا کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے، اور وہ چاہتی ہے کہ اس شادی کو روک دیا جائے۔''

''ہوں!''

''اُس نے یہ درخواست تحصیلدار صاحب کی کچہری میں پیش کی ہے۔ تحصیلدار صاحب نے عرضی لینے سے پہلے اُسے بہت سمجھایا بجھایا لیکن وہ نہ مانی۔''

''تحصیلدار صاحب نے؟'' شیام کے منہ سے نکلا۔

''ہوں!''

''پھر؟''

''۳ ستمبر کو پیشی ہے، روشن کو حاضر ہونے کا حکم ہوا ہے۔ میرے خیال میں تحصیلدار صاحب کوشش کریں گے کہ دونوں فریقین میں صلح ہو جائے اور یہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں رہے، تو بہتر ہے۔ مجھ سے اُنہوں نے پوچھا تھا میں نے کہا بڑی نیک صلاح ہے۔''

''ہوں''

''آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' علی جو نے معنی خیز نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پتہ نہیں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شیام نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

علی جو خاموش ہو گیا، قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "وہ آپ کو غالب کا وہ شعر یاد ہے، جس کا دوسرا مصرعہ ہے:۔

'گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو'

وہ، اس کا پہلا مصرعہ کیا ہے، اس وقت یاد نہیں آرہا۔"

شیام اس چوٹ کو سمجھ گیا۔ کہنے لگا۔ "اس کا پہلا مصرعہ ہے۔۔

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"

علی جو مسکرانے لگا۔ یہ آسامی اتنی جلدی قابو میں آنے والی نہیں اُس نے سوچا۔

شیام تھانیدار کے پاس گیا۔

تھانیدار نہایت غور سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔

جب شیام نے باتوں باتوں میں اپنا عندیہ ظاہر کیا تو وہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔

"آپ ہنستے کیوں ہیں۔" شیام نے ذرا غصہ سے کہا۔

"یہ بات آپ کہہ رہے ہیں؟ مجھے اس پر ہنسی آرہی ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ؟ آپ پڑھے لکھے آدمی، شریف، عالی نسب آدمی، قانون کو سمجھنے والے آدمی یہ بات کہہ رہے ہیں؟"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے، ہاں میں نے ہی آپ سے یہ بات کہی ہے۔ کیا آپ کو یقین نہیں آرہا کہ میں ہی، جو اس وقت آپ کے سامنے اس کرسی پر بیٹھا ہوں، آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

تھانیدار نے آہستہ سے لیکن ذرا تہدیدی انداز میں کہا۔ "اگر آپ تحصیلدار کے لڑکے نہ ہوتے تو......"

"تو؟"

"تو میں آپ کو حوالات میں ٹھونس دیتا۔"

شیام نے کہا۔ "تھانیدار صاحب، ذرا کان کھول کر سنیئے، میں اس وقت آپ سے تحصیلدار کے لڑکے کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے، کیا آپ ایک انسان کی

عزت اور مرتبے سے واقف ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر خیال ہوتا ہے کہ آپ شاید اس امر سے واقف نہیں، اور یہ آپ پر ہی کیا موقوف ہے، بہت سے لوگ اس سے واقف نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں، کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ کیا ہوتی ہے محبت؟ میرا خیال تھا کہ شاید آپ اس سے واقف ہوں۔ شاید میرے ذہن میں اس وقت ایک تصویر آتی ہے۔ پہلے روز جب میں اس وادی میں آیا تھا اور صبح اٹھتے ہی میں نے ندی کا رخ کیا تھا، تو کچہری کی گھاٹی اتر کر میں راستہ بھول گیا تھا اور کھیتوں کی ایک باڑھ کے قریب جانکلا تھا۔ بڑی فرحت ناک ہوا تھی، اور چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اُس وقت میں نے ایک لڑکی کو باڑھ سے ریوڑ نکالتے دیکھا۔ نہایت حسین خوش اندام عورت، اور اُس کے اوپر ایک آدمی جھکا ہوا تھا۔ نہایت خوبرو اور خوش شکل، بس بالکل آپ کا سا ہی، قد بت، اور گردن پر ایک زخم کا نشان......"

شیام خاموش ہو گیا۔ تھانیدار کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

"زندگی بڑی عجیب شے ہے، تھانیدار صاحب، یہ قانون اور عشق اور ظلم سے بھی بہت عجیب اور دلچسپ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

اور یہ کہہ کر شیام نے تیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

لیکن تھانیدار نے اُس سے نظریں نہیں ملائیں۔ رکتے رکتے بولا۔ "میں۔ میں۔ اس وقت کچھ عرض نہیں کر سکتا سوچوں گا اس بارے میں۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" شیام نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"آداب عرض۔"

"آداب عرض۔"

شیام نے چندرا سے یہ سارا قصہ کہتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ میرے خیال میں یہ بڑی بھاری غلطی تھی۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔"

چندرا نے کہا۔ "میں کہتی ہوں اس وقت غلطیوں پر سوچنے کا موقع نہیں۔ کوشش کرنے کا موقع ہے۔ میں ابھی تک پر اُمید ہوں۔ وہ مانے گا، وہ ضرور مانے گا، اُسے ماننا ہوگا۔ میں نوراں کو بھیجوں گی، میں خود جاؤں گی، میں اُس کے پاؤں پکڑوں گی، گڑگڑاؤں گی۔" یکایک وہ رک گئی، شاید

اُس نے شیام کے چہرے پر کسی یاس انگیز تخیل کا تاریک سایہ دیکھ لیا تھا۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ "تم یہاں میری ہمت بندھانے آتے ہو یا مجھے نااُمیدی دکھانے کے لئے؟"

"چندرا۔" شیام نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے تمہاری ایسی عورتیں بہت کم دیکھی ہیں!"

تھانیدار نے سوچ سمجھ کر جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا، کہ اُس نے موہن سنگھ پر پہرہ اور سخت کر دیا۔ گارد کے سپاہیوں کی تعداد دگنی کر دی اور اُنہیں ہدایات دیں، کہ وہ کسی حالت میں، کسی صورت میں، چندرا کو موہن سنگھ سے نہ ملنے دیں، اگر وہ چاہتا تو چندرا کو زیر حراست رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس سے معاملے کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ کچھ اُسے نوراں کی طرف سے بھی ڈر تھا۔ کچھ شیام کی طرف سے بھی ایک موہوم سا خطرہ، اُس نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ وہ چندرا کو آزاد رہنے دے۔ لیکن در پردہ اُس نے کئی سپاہیوں کو اُس کی کڑی نگرانی کرنے کے لئے مقرر کر دیا تھا۔

سپاہیوں نے تھانیدار کا حکم پاکر موہن سنگھ کے ساتھ زیادہ سختی برتی، پہلے وہ رفع حاجت وغیرہ کے وقت اُس کی ہتکڑیاں وغیرہ کھول دیا کرتے تھے۔ اب موہن سنگھ کو ہر وقت ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہننے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن موہن سنگھ سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔ اُن کے طعنے، جو طعنے نہ تھے بلکہ کھلی گالیاں، اُن کا تہدید آمیز سلوک، پہلے پہل موہن سنگھ کو بہت غصہ آتا تھا۔ اور اُس کا سارا جسم غصے سے کانپنے لگتا تھا لیکن پھر اُس نے معلوم کیا کہ وہ ان طعن و تشنیع کے تیروں کو، ان گالیوں کو نہایت آسانی سے برداشت کر سکتا ہے، اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے جیسے اُس کا ان چیزوں سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

آج پٹی کراتے وقت اُسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ بہت سی پیپ بہی تھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں ایک دو زخموں کی حالت بہت خطرناک تھی، اور اُسے شک تھا کہ کہیں ان میں گنگرین نہ ہو جائے۔ گنگرین؟ گنگرین نہ جانے کیا بلا ہوتی ہے۔ وہ آج بہت کمزور تھا۔ درد کی اذیت انگیز لہریں سارے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ وہ آتشیں سلاخیں چبھونے والا ہاتھ جو اُسے نظر نہ آتا تھا، آج خلاف معمول

زیادہ تیز، زیادہ سخت، زیادہ بے رحم معلوم ہوتا تھا۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سنتے ہو، بیٹا بھاگ جانا چاہتا ہے، کہیں، غیر علاقے میں۔“

سپاہی ہنسنے لگے۔ ”وہ باہر، اُس کی یار چندرا بھاگنے کا انتظام کر رہی ہے، پٹھا ولایت جائے گا، صاحب لوگ بن کر۔“

سب سپاہی قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

کون بھاگ رہا تھا۔ موہن سنگھ سوچنے لگا۔ چندرا اُس کے بھاگنے کا انتظام کر رہی تھی، اُس کے جسم میں ایک نئی رو دوڑنے لگی، ہاں وہ بھاگ رہا تھا وہ اچھا ہو گیا تھا۔ اور چندرا کو لے کر کسی غیر علاقہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ یہ تو بہت اچھی بات تھی۔ اب وہ اس ظالم دیس کو چھوڑ جائے گا۔ اور کسی ایسے دیس میں چلا جائے گا جہاں لوگ اُن سے محض اس لئے نفرت نہ کریں کہ چندرا ایک نیچ گھر کی لڑکی ہے، کون کہتا ہے چندرا نیچ ہے۔ بسنت کشن نے چندرا کو نیچ سمجھا تھا۔۔۔ ہاں، لیکن وہ۔۔۔ اُف، یہ درد۔۔۔ میرے پرمیشر، یہ درد کب دور ہو گا، یہ پیپ کب بند ہو گی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے جسم میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کیڑے کلبلا رہے ہوں، لاکھوں چھوٹے چھوٹے کیڑے جو سوئی کی طرح ڈنک مارتے تھے ہر جگہ جسم کے ہر حصے میں، ان کا گھاؤ دل تک جاتا تھا۔ دماغ تک۔۔۔ کھوپڑی کے اندر بھی سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔

اس کا سانس زور زور سے چلنے لگا، کسی نامعلوم خوف کے احساس سے اُس کے ہاتھ پاؤں میں تشنج ہونے لگا، کیوں نہیں چندرا اس وقت آجاتی، وہ کیوں ابھی تک نہیں آئی، وہ تو کچھ نہیں چاہتا، صرف اُس کی اُنگلیوں کو اپنے بالوں میں پھیرتے دیکھنا چاہتا ہے، وہ اُس کی گرم سانس کو اپنے ماتھے پر محسوس کرنا چاہتا ہے، اُف یہ آگ کی سلاخیں، یہ شعلوں کی زبانیں کیوں اُس کے جسم میں کبھی جا رہی ہیں، چندرا کہاں ہو، وہ کیوں نہیں آتی، وہ کیوں اُس کے ہاتھ پاؤں نہیں دباتی، جو تشنج سے سن ہو رہے ہیں۔ کیا یہ گنگرین ہے؟ گنگرین کیا ہوتا ہے؟ یہ ڈاکٹر بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔

اُس کے کانوں میں قہقہوں کی آوازیں اُترنے لگیں یہ کون ہنس رہا تھا، سپاہی تھے سپاہی، یہ کیوں ہنس رہے تھے، اُس کی بندوق کہاں تھی اُس نے اپنی دونالی بندوق کہاں چھوڑ دی تھی۔۔۔ راستے میں جھاڑیاں تھیں۔۔۔ سورنی تیزی سے اس کی طرف بھاگی جا رہی تھی، وہ اب بھی اُس کے بچوں کو خوف سے جھاڑی میں چھپتے دیکھ سکتا تھا، اور اوندھے منہ کون پڑا ہے جس کی پیٹھ زخموں سے

سرخ ہے، اُٹھ جوان، ہمت سے کام لے۔ اُٹھ جوان ہمت سے کام لے، دروازہ کھلا ہے، دروازہ کھلا ہے، اور وہ ابھی تک نہیں آئی، کیا اُسے پتہ۔ نہیں کہ پھر وہ کبھی بھاگ نہ سکیں گے۔ آج دروازہ کھلا ہے، اور سپاہی قہقہے لگا رہے ہیں ہنسی کی ایک سپید سی دیوار بن گئی ہے، سپاہیوں کے قہقہے کارتوس کے چھروں کی طرح ہوا میں بکھر رہے ہیں۔ وہ ان کارتوس کے چھروں کی دھند میں اور اس ہنسی کی دیوار کے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتے، کاش وہ اب بھی آجاتی۔ وہ کروٹ بدلنا چاہتا ہے۔

چندرا کے مضبوط، لیکن نرم گداز ہات کو اپنی چھاتی کے گرد لپیٹتے ہوئے محسوس کرنا چاہتا ہے، آہ، اُس کے کھلے زخموں میں ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ یہ اُسی کا ہات تھا۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں جو اسے جھک کر دیکھ رہی ہیں، یہ بڑی بڑی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں، میری ننھی منی بھولی چندرا تو کیوں رو رہی ہے، میں اچھا ہو جاؤں گا۔ اور پھر ہم اُسی کھلے دروازے سے بھاگ نکلیں گے اور کسی دوسرے دیس میں جا بسیں گے جہاں ہمیں کوئی تنگ کرنے والا نہ ہوگا، اور چندرا تو میری دلہن بنے گی۔

چندرا دلہن بن گئی تھی، وہ موتیوں کے گجرے پہنے ہوئے، چنبیلی اور سنگھدراج کے پھولوں کو اپنے بالوں میں گوندھے ہوئے لال عروسی دوپٹہ اوڑھے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر آگئی تھی، وہ اس لال دوپٹے کے اندر سے اُس کی شریر، مسرت سے لبریز آنکھیں دیکھ سکتا تھا، چندرا کے لبوں پر وہی مسکراہٹ تھی، چندرا تو اس وقت تک کہاں تھی میری چندرا، زندگی بھر میں تیرا انتظار کیا ہے، چندرا، میں راجپوت ہوں اپنے قول کا سچا۔۔۔ وہ لال عروسی دوپٹہ اس کے چہرے پر جا پڑا تھا۔ اُس کی دلہن اُس کے کلیجے سے چمٹ گئی تھی، زخموں میں ٹھنڈک پڑ گئی تھی، ہتکڑیاں پھولوں کے گجرے بیڑیاں، پائیل اور خلخال، وہ اُن پائیل کی جھنکار سن سکتا تھا، اُن خلخالوں کے گیت سن سکتا تھا، اُن پھولوں کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔

لیکن یہ لال دوپٹہ سا میرے چہرے پر کیسے پڑا ہے اسے پرے ہٹا دے چندرا، چندرا اسے میرے منہ پر سے ہٹا دے، اس کے ہوتے ہوئے میں تیرے چہرے کو صاف نہیں دیکھ سکتا، میری جان، یہ لالی کیسی ہے، چاروں طرف لالی، لالی ہی لالی، چندرا چندرا۔

سپاہی اب کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے۔ یکایک انہوں نے موہن سنگھ کو زور زور سے چندرا کا نام پکارتے سنا۔ وہ بھاگے اُس کی چارپائی کی طرف دوڑے۔

لیکن موہن سنگھ مر چکا تھا، اُس کا ماتھا ٹھنڈا تھا۔ سارے اعضا یخ بستہ اور موت کے تشنج سے اکڑے ہوئے۔

وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں اپنے قیدی کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھنے لگے، جو ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے اُنہیں جل دے کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ اپنے بستر پر پڑا تھا۔ ہتکڑیوں کو اُس نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا، دونوں ہاتھوں سے دبا کر۔۔۔ موتیا کے گجروں کی طرح۔۔۔

اُنہوں نے لالٹین پرے کر دی، اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سارے کمرے میں ایک عجب اداسی، ایک گراں بار افسردگی کا غبار چھانے لگا، اور اُن کے چہروں پر کسی نامعلوم خوف کا پرتو جھلکنے لگا۔

دروازہ کھلا تھا لیکن دلہن نہ آئی تھی، وہ اسی وارڈ کی دیوار کے دوسری طرف کمبل لپیٹے دیوار سے لگی بیٹھی تھی، دونوں میں صرف ایک دیوار ہی تو حائل تھی۔ دروازہ بھی کھلا تھا، لیکن پھر بھی وہ نہ آئی تھی۔ موت کی راہ پر چلنے والے محبوب نے اُس کا دیر تک انتظار کیا تھا، لیکن وہ پھر بھی یہ آئی تھی وہ اُس کے اتنے قریب بیٹھی تھی، دیوار کے دوسری طرف، لیکن اُسنے اُس کی آواز نہ سنی تھی، اُس نے لال دوپٹے کی جگہ ایک پرانا بوسیدہ کمبل اوڑھ رکھا تھا، اور اسے کچھ پتہ نہ تھا، کہ اسی دیوار کے دوسری طرف اُس کا محبوب اُسے پکار رہا ہے، اور اپنے دل، روح اور جسم کی پوری قوت سے اُسے بلا رہا ہے، اور دروازہ کھلا ہے!

دروازہ کھلا ہے اور موہن سنگھ مر گیا ہے، لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا، کائنات اُسی طرح چل رہی ہے، موہن سنگھ مر گیا ہے، اور ساری دنیا اسی طرح زندہ ہے، اور کسی کو پتہ نہیں کہ اس دنیا میں کیا حادثہ ہوا ہے۔ موہن سنگھ مر گیا ہے اور کوئی روتا نہیں، سپاہی بھی خاموش ہیں، اور لالٹین بھی جل رہی ہے، اور چندرا دیوار کی دوسری طرف ایک پرانا کمبل لپیٹے دیوار سے لگی فضا میں تک رہی ہے۔

دروازہ کھلا ہے اور تا ابد یہ دروازہ کھلا رہے گا اور تا ابد وہ نہ آئے گی کیونکہ وہ دیوار کے دوسری طرف ہے، اور محبت کا راجپوت موت کے جنگل میں اکیلا جا رہا ہے۔

باہر کائنات خاموش ہے۔ اور شب تیرہ و تار!

کالج کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں، اور اب وہ واپس لاہور جارہا تھا، وہی غلام حسین اُس کے ساتھ تھا، وہی راہ گزر تھی، وہی خچر، ہاں وقت وہ نہ تھا، اُمیدیں وہ نہ تھیں، وہ خود وہ نہ تھا، جو آج سے تین ماہ پہلے اس وادی میں آیا تھا، پراُمید، جذباتی، ایم۔اے کا طالب علم، جو زندگی کو شباب کی رجائیت پسند عینک سے دیکھنے کا خوگر تھا۔ اُس کی حیات کے بند بند میں اور اُس کے جسم کی نس نس میں ایک تلخ یاسیت کا سیال رچ گیا تھا جس نے اُس کے لبوں کی مسکراہٹ کڑوی کردی تھی، اور اُس کی آنکھوں کی چمک محزوں، اور خچر کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے وادی کے بدلتے ہوئے مناظر دیکھتا گیا، اور غلام حسین کی باتیں سنتا گیا، ان باتوں کا مطلب کوئی نہ تھا، اور وہ ایک بے معنی گونج بن کر اس کے دماغ کے کسی پردے سے ٹکرار ہی تھیں، باتیں، خوشبوئیں، فلمیں، ہر چیز ایک کڑوے، تلخ، غبار میں لپٹی ہوئی تھی اور وہ یہ سمجھ نہ سکا کہ آج اس وادی کی وسعتوں سے خوبصورتی کیوں گریزاں ہے، معاً اس کی نگاہوں میں اُس کے کالج کا کیمپس آگیا، جس کے وسط میں ایک پیپل کا پیڑ تھا، اور بنچ پر بیٹھی ہوئی سٹیلا، سٹیلا کے شہابی رخسار، جن پر کوٹی کے پاؤڈر کا شبہ ہوتا تھا۔ سٹیلا کی ہر وقت چمکتی ہوئی مسکراہٹ، جیسے کسی نے اس مسکراہٹ پر تازہ تازہ پالش کیا تھا۔ کیوں وہ مسکراہٹ ہمیشہ پالش کئے بوٹ کی طرح چمکتی تھی، کیوں اس مسکراہٹ میں ایسی گہرائی نہ تھی، وہ سٹیلا کو دیکھ کر مسکرارہا تھا۔ ”ہیلو۔“ ”ہیلو۔“ اُس نے اپنی انگلی سے اُس کے رخساروں کو چھولیا۔ یہ محبت کتنی سطحی، فروعی، مصنوعی تھی۔ ”تم نے میرے خط کا جواب نہ دیا۔ بڑے ظالم ہو۔“ ”وہ یوں ہوا“ ”او مائی ڈارلنگ“ ”آج میٹرو میں ڈانس ہے نا۔“ ”او کے۔“ ”یہ جھوٹی زندگی، یہ جھوٹی محبت، ایک مسلسل، غیر مختتم

جھوٹ، یارب، کیا یہ تسلسل کبھی نہ ٹوٹے گا، کیا اس کی ساری زندگی اسی جھوٹے، مصنوعی تلخ راہ گزر پر چلتی جائے گی۔۔۔ یکایک ایک فاختہ ناشپاتی کی پھننگ سے اُڑ گئی، ایک اور فاختہ اپنے پر پھیلائے ہوئے اُس سے آملی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ فضا کی پہنائیوں میں پرواز کرنے لگے، اور وہ حیران نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا، اسے خیال آیا یہ کبھی نہیں ہو سکتا، یہ دونوں پرندے اس خوبصورتی کے ساتھ اس فضا میں رقص نہیں کرسکتے۔ کبھی نہیں کرسکتے، ابھی کوئی حادثہ ضرور ہوگا، اور اُن کی جاہل مسرت اور وحشیانہ خوشی کا قصر مسمار ہو جائے گا، لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا۔ اور وہ دونوں پرندے رقصاں لرزاں فضا میں پیرتے ہوئے نظروں سے گم ہو گئے، اور اُس کے لب زور سے اندر کی طرف بھینچ گئے، اور کوئی اُس کے دل کے ویرانے کے اندر چیخیں مار کر کہنے لگا، اے کائناتِ عظیم کے شاطر خداوند، اپنی ظلمتوں کا تاریک پردہ اس عالم کون و مکاں سے ہٹالے، نور کی لرزتی ہوئی آخری کرن کو انسان کے سنگلاخ سینے کو چھو لینے دے، تاکہ وہ جاگ اٹھے اور اس اندھے قفس کی تیلیوں کو پارہ پارہ کردے، اور فضا میں ایک آزاد پرندے کی طرح سانس لے سکے۔ فاختاؤں کا وہ جوڑا اب فضا میں گم ہو گیا تھا، اور وادی کی پری کسی پرانی داستان کی سوسالہ نیند میں کھو گئی تھی۔ اور وادی کے کھیتوں میں جنگل اگ رہے تھے، اور اُس کا سارا سبزہ ایک خار دار جھاڑ بنتا چلا جارہا تھا، اور رونتی ایک پرانے قعر میں محبوس اس خار دار جھاڑ کی گہرائیوں میں گم، سوسالہ نیند میں کھو گئی تھی، اور وہ اس وادی کا آخری حقیر کیڑا تھا، جس نے اپنے رینگتے ہوئے تخیل میں انسانی سماج کے بھیانہ ساحر کو حسن اور زندگی اور مسرت کو موت کا زہر ہلاہل پلاتے ہوئے دیکھا تھا، خوبصورتی اس سوسالہ نیند سے کب بیدار ہوگی۔ زندگی زہراب کے اس خشک چشمے سے کب ہویدا ہوگی، اور مسرت کس طرح اس خارزار کی ہلاکت آفریں لپیٹ سے بچ کر فضا میں پرواز کرے گی، یہ سوال چیخ چیخ کر اس کے دل کے ویرانوں اور کھنڈروں میں گونجنے لگے، اور اُن کی داخلی اذیت سے بے قرار ہو کر اُس کی کنپٹیوں کی رگیں تڑپنے لگیں۔۔۔ راہ گزر پر اب موسم خزاں اپنا زہریلا سانس اُگل رہا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں سے پتے جھڑ رہے تھے۔ زرد پژمردہ، خشک پتے، بے جان ہو کر راستے میں آپڑے تھے۔ گھاس ہر جگہ کاٹی جارہی تھی اور زمین اُس بھیڑ کی طرح ٹھٹھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جس کی ساری اُون گڈریئے نے تراش لی ہو۔ یکایک اُس نے اپنے سامنے راستے کے ایک طرف شفتالو کے ایک ٹنڈ منڈ

درخت کو دیکھا، اور اُس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے، اور اُس کی نگاہوں میں ایک دھند سی پھیلنے لگی، اور اس دھند کی سیاہی اور سفیدی میں پچھلے دو ہفتوں کے واقعات اجاگر ہونے لگے۔۔۔

بسنت کشن اب روبہ صحت تھا۔ چندرا کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ اسی رات کہیں غائب ہو گئی تھی، اور کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ ونتی کا بیاہ قریب آ رہا تھا۔ اور شیام ہر وقت اپنی زبان پر راکھ کا ذائقہ محسوس کرتا تھا۔ اُس کی حسیات جلد جلد تبدیل ہو رہی تھیں، جیسے کسی غیر معمولی کیمیائی عمل نے زندگی کی ساری مسرتوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اس راکھ کا ذائقہ نہ صرف اس کی زبان پر تھا، بلکہ اس کی نظر میں بھی اب اُسے ہر چیز بدلی بدلی نظر آتی، وادی میں کھلی ہوئی چاندنی دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے وادی کے ننگے جسم پر بھبھوت مل دی ہے۔ بلبل کے شیریں نغمے کو بھی کسی نے جلا کر راکھ کر دیا تھا اور خوش الحان پرندوں کی بولیاں اُس کے کانوں میں راکھ کی بارش کا اثر کرتیں۔ عجیب احساس تھا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا اُس کی ساری حسیات قوت شامہ میں تبدیل ہو گئی ہیں، اُسے ہر چیز میں راکھ کا مزہ آنے لگا۔ کڑوا، کسیلا، چرچرا، کھٹا کھٹا سا ذائقہ، جیسے کسی نے اُس کے منہ میں، اُس کی آنکھوں میں، اُس کے کانوں میں، اُس کے خون میں، اُس کے دل میں، اُس کی روح کے گوشے گوشے میں یہ راکھ جھونک دی تھی، اور اب وہ اس راکھ کے سوا اور نہ کچھ چکھ سکتا تھا، نہ سن سکتا تھا، نہ دیکھ سکتا تھا، نہ محسوس کر سکتا تھا۔ چاروں طرف راکھ ہی راکھ تھی، اور وہ کسی گندے برتن کی طرح اس میں اٹا ہوا تھا۔

اس احساس نے اس پر ایک عجیب قسم کا جمود طاری کر دیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ باہر نہ گیا تھا، کسی سے ملا نہ تھا۔ اکثر بستر پر لیٹے لیٹے دن گزار دیتا۔ یا کبھی اُٹھ کر باغ میں چلا جاتا، اور آڑوؤں کے جھنڈ میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا، یا یونہی گھٹنوں کتاب کو گھٹنوں پر رکھے کسی سوچ میں مستغرق ہو جاتا، اور پھر اُسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ خیالات کے طوفان بڑھتے آتے اور اس کی روح کے ساحل کی ریت پر پھیل جاتے، اور ان کے بعد بے خیالی کے لمبے لمبے وقفے آتے، جب لہریں اُس ریت سے پیچھے ہٹتے ہٹتے گم ہو جاتیں، اور وہ اپنے سامنے اس ساحل کی ریت کو چمکتے ہوئے دیکھتا، اور دیر تک دیکھتا رہتا۔ بے خیال، ہر قسم کے احساس سے معرا، اور وہ کچھ نہ سمجھ سکتا، کہ یہ ریت کیوں چمکتی ہے، اور

لہروں کے نقش قدم اس پر کیوں موجود نہیں رہتے، اور وہ طوفان جس کا اب اُسے صرف ایک کنارہ نظر آ رہا ہے، کیوں ساکن ہے، منجمد ہے، اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس طوفان کو کسی نے ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر محبوس کر دیا ہے، لیکن اس احساس کے آتے ہی جیسے وہ طوفان پگھلنے لگتا اُس کی لہریں آگے بڑھنے لگتیں، اور چمکتی ہوئی ریت پر چھا جاتیں لیکن اب اُسے ایسا معلوم ہوتا، گویا اس کا طوفان سے کوئی تعلق نہیں، وہ ایک تماشائی ہے، جو ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھا اس منظر کو دیکھ رہا ہے، جیسے یہ اُس کی روح کا ساحل نہیں ہے، جیسے یہ طوفان اُس کے خیالات کا ہجوم بے پناہ نہیں، جیسے یہ چمکتی ہوئی ریت اُس کی روح کے ساحل کی ریت نہیں، اور وہ واقعات کے بہاؤ سے بالکل الگ تھلگ آڑوؤں کے جھنڈ میں کتاب کو اپنے گھٹنوں پر رکھے بیٹھا ہے، اور سوچ رہا ہے، وہ کیا سوچ رہا ہے، اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے، لیکن اُس کے احساس کسی ایک چیز پر نہ جمتے، اور وہ اس سوچ کی تاریک کائی پر سے ایک تاریک قعر میں نیچے پھسلتا جاتا، اور اُسے کچھ پتہ نہ چلتا، وہ کہاں ہے؛ کیا کر رہا ہے، کیا سوچ رہا ہے، ان باتوں کا اُس کی زندگی سے کیا تعلق ہے، آیا وہ جیتا ہے یا مر گیا ہے۔

اس بے خیالی، جمود، اور حیات اور موت کے درمیان اس نے کئی دن گزار دیئے۔ وہ دن جب وقت تھما ہوا سا تھا، جب زندگی راکھ تھی، پیڑوں پر آڑو اس طرح خاموش اور ساکن تھے، گویا کسی نے اُنہیں مٹی سے بنا کر درختوں پر لٹکا دیا تھا۔ مٹی اور راکھ اور اس کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر ساری کائنات کو اچھی طرح جھنجھوڑ دے جاگو جاگو، ہلو، حرکت کرو، مضطرب اور بے قرار ہو جاؤ۔ اور اُسے الف لیلیٰ کی وہ کہانی یاد آ گئی، جب کوئی غریب الوطن شہزادہ، اپنی محبوبہ پری کی تلاش میں گھومتا گھومتا ایک مقام پر آ کر پتھر ہو گیا تھا، ایک پتھر کے بت میں مبدل ہو گیا تھا، اور ہزار کوشش پر بھی حرکت نہ کر سکتا تھا، یہی اس کی روح کی حالت تھی، شاید پتھر کے بت میں تبدیل ہونا اس دولت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا، اور اُسے احساس ہوا کہ وہ مانند کے کنارے ندی کی ایک اونچی چٹان پر سل پتھر ہو گیا ہے، ایک پتھر کا بت بن کر ساری وادی کو دیکھ رہا ہے، اس بے خیالی، جمود، حیات اور موت کے درمیانی وقفے میں ایک مٹی کے آڑو کی طرح لٹک رہا ہے جسے کوئی ہلا نہیں سکتا، کوئی جھنجھوڑ نہیں سکتا، صدیوں تک، حتیٰ کہ ونتی کا بیاہ ہو گیا ہے، زندگی مر گئی ہے، موت مر گئی ہے، وادی جل کر راکھ ہو گئی، ندی کا پانی خشک ہو گیا ہے، اور وہ اُس کے خشک تپتے ہوئے نیلے نیلے پتھروں کے اوپر ایک

چٹان پر پتھر کا بت بنا ہوا اس منظر کو سالہا سال سے تک رہا ہے، اور نہیں تکنا چاہتا۔ اور آنکھیں جھپکنا چاہتا ہے، اور نہیں جھپک سکتا، کیونکہ اُس کی آنکھیں بھی اُبل کر پتھر بن چکی ہیں۔

جامد اور ساکن اور غیر مضطرب، جیسے وہ خود اس خلا کا حصہ ہے، جو کائنات کو اپنے گھیرنے میں لئے ہوئے ہے، جو نہ سوچتی ہے، نہ سمجھتی ہے، نہ محسوس کرتی ہے، نہ حرکت کرتی ہے، جو ہے اور ہو کر بھی نہیں ہے، جس کی پہنائیوں میں خیالات کی کوئی سمت نہیں ہوتی، اور وہ آوارہ پرندوں کی طرح جدھر جی چاہے، اُڑے چلے جاتے ہیں، احساسات کی کوئی پہنچ نہیں ہوتی اور وہ تالاب کی لہروں کی طرح جنہیں کسی چھوٹے سے کنکر نے متحرک کر دیا ہو، چاروں طرف گھومتے ہوئے، دائرے بناتے ہوئے، اُفق تک یونہی بے مطلب، بے معنی، بڑھے چلے جاتے ہیں۔ افعال کی کوئی تشکیل نہیں ہوتی، اور کھانا، پینا، سونا، پڑھنا، لکھنا، زندگی کے سب افعال غیر ارادی اور لایعنی اور لاینحل معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ خلا کی کوئی صورت نہیں ہوتی، کوئی زاویہ نہیں ہوتا، وہ نہ موت ہے نہ زیست، وہ نہ مضطرب ہے نہ ساکن، وہ ہے اور ہو کر بھی نہیں ہے۔

اور دن گزرتے گئے اور وقت تھما رہا۔۔۔ اور شیام اسی راکھ کی خلا میں پتھر کا بت بنا ہوا زیست اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔

اور پھر چھایا نے اُسے بتایا کہ تحصیلدار صاحب نے اس کا مقدمہ خارج کر دیا ہے۔

"کیا ہوا۔" اُس نے بے خیالی کے انداز میں پوچھا، چھایا حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"بس مقدمہ خارج کر دیا کہا کہ کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ کیوں روشن کو اس کی سرپرستی سے ہٹایا جائے۔ بات یہ ہوئی کہ روشن کچہری میں صاف مکر گیا، کہ وہ ونتی کا بیاہ درگاداس سے کرنا چاہتا ہے، یا یہ کہ بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے، اُس نے صاف کہہ دیا کہ ابھی اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"پھر؟"

"مقدمہ خارج ہو گیا، لیکن میں جانتی ہوں کہ روشن کے دل میں کیا ہے، وہ چپکے سے ونتی کا بیاہ کر دے گا۔"

"پھر؟"

"پرماتما کے لئے کچھ کرو۔"

"ہوں۔"

"شیام، کیا تمہیں اس کا کچھ خیال نہیں۔"

"ہوں"

"شیام، تم اپنے پتا سے کہو، وہ اب بھی اس بیاہ کو روک سکتے ہیں۔"

"ہوں، بہت اچھا، میں اُن سے آج ہی کہوں گا۔"

"تم کہو یا نہ کہو، میں یہ بیاہ ہرگز نہ ہونے دوں گی۔" چھایا نے غصے سے کہا۔ اور وہاں سے چلی گئی۔

یہ غصہ کیوں؟ یہ لوگ اتنی جلدی غصے میں کیوں آجاتے ہیں۔ چھایا اتنی تیزی سے چلی جا رہی ہے۔ اس قدر اضطراب کیوں، یہ تیز حرکت کس لئے، یہاں اس چٹان پر پتھر کا بت بن کر بیٹھنا کس قدر خوشگوار ہے، پرماتما کے لئے کچھ کرو پرماتما کے لئے؟ جو آدمی اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا، وہ پرماتما کے لئے کیا کرے گا۔ بھولی چھایا۔ ہوں۔ میں آج ہی اُن سے کہوں گا۔ کیا کہوں گا، کس سے کہوں گا، ایک پتھر کا بت ایک راکھ کے ڈھیر سے کیا کہہ سکتا ہے۔ لیکن، پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی چاہیئے۔ کیا کہنا چاہیئے ہاں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی چاہیئے۔ پتا جی میں ونتی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں، ہشت، نالائق، پتا جی میں چاہتا ہوں کہ ونتی کا بیاہ درگاداس سے نہ ہو، وہ درگاداس کی بیوی نہ ہوگی سروپ کشن کی ہوگی، میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں، پتا جی یہ معاملہ میرا ہے، میں تمہارا معاملہ تم سے بہتر سمجھتا ہوں تحصیلدار صاحب نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی خواب گاہ کے اندر چلے گئے۔ اور شیام نے دروازے سے کہا، پتا جی، پتا جی، سنیئے تو، پتا جی، سنیئے تو، پتا جی پتا جی، اور وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، اور دروازے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور اس نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے، ایک راکھ کا ڈھیر ایک پتھر کے بت سے کیا کہہ سکتا ہے۔

اور اس کے دو دن بعد ونتی کا بیاہ ہو گیا اور سارا گاؤں وہاں موجود تھا۔ ونتی کا بیاہ ہوا اور تحصیلدار صاحب اور اُن کی بیوی وہاں موجود تھی، ونتی کا بیاہ ہوا اور بسنت کشن اپنے زخموں کے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوا بیدی کے کنارے مسکرا رہا تھا اور اجنتا کی تصویر ایک حریص نگاہ کے ساتھ

اپنی بہو کی طرف بار بار جھانکتی تھی۔ جس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا، اور جواب خود ایک برف کا مجسمہ بن گئی تھی، اور درگاداس کا گھسٹتا ہوا بھوت اس برف کے مجسمے کو اپنی چادر کے پلو سے باندھے بیدی کے چاروں طرف گھوم رہا تھا، بیدی جیسے خوشیوں اور مسرتوں کی قبر تھی، اور وہ اس کے گرد گھوم رہا تھا، حسن اور حیوان، فرینکنسٹن اور معصومیت، کیونکہ ونتی ونتی نہ تھی، وہ لاجونتی تھی، وہ چھوئی موئی تھی جو ہاتھ لگانے سے بند ہو جاتی ہے اور بول نہیں سکتی، جو اپنی روح کے اندر ہی گھٹ جاتی ہے، اور بول نہیں سکتی، ونتی نور کی مورت تھی، سیال، روشن، لیکن جب پنڈت نے اس کا ہاتھ درگاداس کے ہاتھ میں دیا تھا، تو وہ متحرک، روشن، سیال، نور کی مورت اسی لمحے منجمد ہو کر برف کی ایک سل بن گئی تھی، وہ چیخنا چلانا چاہتی تھی، لیکن اُس کی آواز بھی منجمد ہو گئی تھی، کاش وہ برف کی مورت بول سکتی، کاش وہ پتھر کا بت حرکت کر سکتا، کاش! کاش! راکھ! راکھ!۔۔۔

ونتی کا بیاہ ہوا، اور چھایا وہاں موجود نہ تھی۔ کہتے ہیں روشن نے اسے ایک مقفل کمرے میں بند کر دیا تھا، اور چھایا تمام دن اور رات اُسی کمرے کی تاریکیوں میں ایک چمگادڑ کی طرح چکر لگاتی پھری اور چیختی رہی، اور اپنی چھاتی دونوں ہاتھوں سے کوٹتی رہی لیکن اُسے اس طرح چمگادڑ کی طرح بے قرار چکر لگاتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا، اُس کی چیخیں کسی نے نہ سنیں، اُس کی چھاتی کی دھمک اُن مٹی کی دیواروں سے باہر نہ جا سکی، کیونکہ سارا گاؤں ونتی کے بیاہ میں موجود تھا۔ اور مٹی کی دیواریں سب کچھ جانتی ہیں، حرکت کرنا نہیں جانتیں، وہ قید کر سکتی ہیں، لیکن راستہ نہیں دے سکتیں، وہ پناہ دے سکتی ہیں، لیکن آزادی نہیں، اور چھایا مقید تھی، اور ونتی کا بیاہ ہو رہا تھا۔

ونتی کا بیاہ ہو رہا تھا اور تحصیلدار صاحب نے مقدمہ خارج کر دیا تھا، ماں باپ نے اپنے چاہیتے بیٹے کو اپنی زندگی تباہ کرنے سے بچا لیا تھا۔ سماج نے ایک اور فرد کو اپنی محفوظ چار دیواری سے باہر بھٹکنے سے روک لیا تھا۔ تحصیلدار صاحب مسکرا رہے تھے اور اُن کی بیوی مسکرا رہی تھیں، اور روشن مسکرا رہا تھا، اور سروپ کشن مسکرا رہا تھا، اور سروپ کشن کی بیوی موقع پا کر گھر سے باہر آ گئی تھی، اور مکی کے کھیت میں ایک گوجر کی آغوش میں بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ الغرض سارا سماج خوش تھا، مبارک ہیں ایسی شادیاں جن کے ہونے سے سارے سماج پر اس مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے حتیٰ کہ مکی کے کھیت کے پودے بھی مسرت سے جھومنے لگتے ہیں۔

ونتی کا بیاہ ہو رہا تھا۔ اور چاند راکھ کا ڈھیر تھا، اور سارے آسمان پر تارے راکھ کے سپید ذروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اور زمین اور آسمان اس گندے آنگن کی طرح نظر آتے تھے جو راکھ میں اٹا ہوا ہو، اور ایک کم عمر اخروٹ کے تنے سے سہارا لگائے ایک پتھر کا بت کھڑا تھا۔ اُس کے پاؤں میں دور تک مکی کے کھیت تھے اور سروپ کشن کا گھر جس کی چھت سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور ایک ہلکا سا مدہم شور اور مہین قہقہے، اور گیتوں کے تھراتے ہوئے سر، اور اس گھر سے پرے ایک ڈھلوان اور بازار اور بازار کا تلہ اور روڑی نالہ اور پھر دور تک دھان کے کھیت اور اُن سے پرے شرقی سلسلہ ہائے کوہ اور ان سب کے اوپر چاندنی کی راکھ کا غبار، اور وہ پتھر کا بت اُس کم عمر اخروٹ کے تنے سے سہارا لگائے کھڑا تھا اور ساری وادی اُس کے پاؤں میں تھی اور وہ بالکل اکیلا، جامد، ساکن کھڑا تھا۔

یکایک ساری وادی میں شہنائی کا چیختا ہوا سر گونجنے لگا۔ بلند اور بلند، حتیٰ کہ زمین اور آسمان اُس کی گونج سے معمور ہو گئے، سر تھرا رہا تھا، کانپ رہا تھا، بلند اور بلند، اس کی چیخ کسی انسانی چیخ کے مشابہ تھی، بلند اور بلند، جیسے ونتی کی روح پگھل گئی تھی، اور اب ان بلند سُروں میں اس وادی کے بے رحم خدا کے آگے سر بسجود آہ و بکا کر رہی تھی، بلند اور بلند، تڑپ رہی تھی، یہ خوشی کا نغمہ نہ تھا کسی زخمی طائر کی پرواز تھی، آخری پرواز، گولی لگ چکی تھی، اور وہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا، ہوا میں چکر کاٹتا ہوا چیختا ہوا موت کے منہ میں جا رہا تھا، بلبل کا نغمہ موت۔۔۔ شادی کی شہنائی۔۔۔ موت۔۔۔ بلبل کا نغمہ۔۔۔ کیٹس کا مصرعہ۔ The sink upon the midnight with pain شاید کیٹس سچا تھا، اس شہنائی کے نغمے میں زندہ گوشت کے جلنے کی بو آتی تھی...... اور بیدی جل رہی تھی، اور درگاداس اور ونتی اُس کے گرد گھوم رہے تھے۔

کہیں سے دو جگنو اس اخروٹ کے تنے کے قریب جھلملانے لگے، دو نازک روشنیاں اُس پتھر کے بت کی آنکھوں کے قریب کانپنے لگیں، لیکن اُس کی آنکھیں خشک تھیں اور ہاتھ بے جان، اور وہ اُنہیں پکڑ نہ سکتا تھا۔ کوئی اُس کے کانوں میں کہہ رہا تھا۔ "اتنی خوشی برداشت نہیں ہوتی، اب میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔۔۔ جب تک زندہ ہوں تمہارے ساتھ ہوں"۔۔۔ لیکن وہ زندہ نہ تھا وہ تو پتھر کا بت تھا اور اس آواز کو سن نہ سکتا تھا، "او مائی ڈارلنگ۔۔۔ او مائی ڈارلنگ"۔۔۔ ونتی نے اپنے ہونٹ اُس کے لبوں پر رکھ دیئے وہ اُس کے گلے سے لپٹی جا رہی تھی او مائی ڈارلنگ۔۔۔ لیکن اس کے لب

مردہ تھے سرد اور بے جان اور اندر کو بھنچے ہوئے اور وہ ونتی کو چوم نہ سکتا تھا۔

جگنوؤں کی کانپتی ہوئی نازک روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ سروپ کشن کے آنگن میں لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ "سوہنے رانجھے نے مندراں پائیاں اور جھیاں لائیاں نی توڑ نبھائیاں"۔۔۔ چاند چمک رہا تھا اور کم عمر اخروٹ کے تنے کے نیچے چاندنی اور تاریکی کا خوبصورت سنگم تھا، اور پتھر کا بت اس سنگم میں اکیلا کھڑا تھا۔ جامد، ساکن غیر متحرک۔۔۔ "جھیاں لائیاں نی توڑ نبھائیاں" یہ لڑکیوں کا گیت تھا، یا شہنائی کا نغمہ، یا زخمی طائر کی آواز۔۔۔ "او مائی ڈارلنگ۔۔۔ او مائی ڈارلنگ۔۔۔"

۔۔۔ چاندنی راکھ کی طرح برستی رہی، فضا دیر تک اس زخمی چیخ کی فریاد سے کانپتی رہی، لیکن کم عمر اخروٹ کے تنے کا سہارا لئے ہوئے پتھر کا بت خاموش کھڑا رہا اس کی آنکھیں خشک تھیں، اور لب اندر کو بھنچے ہوئے۔

پتہ نہیں کتنے دن وہ اسی طرح زیست اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ کتنے دنوں سے اُس نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے، کب سوتا ہے، کب جاگتا ہے، یا شاید وہ یہ سب کچھ دکھلا رہا تھا۔ اُس کی ماں بے کل تھی، اس کے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے، چھایا کو بھی اُس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے دیکھا تھا۔ نائب تحصیلدار کی باتیں بھی اُس نے سنی تھیں، ڈاکٹر کی طفل تسلیاں، سیداں کی افواہیں، چندرا پاگل ہو گئی تھی۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتی پھرتی تھی، اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، وہ ہر شخص کو موہن سنگھ سمجھتی تھی اور اُسے زبردستی مکی کے کھیتوں میں گھسیٹ لے جاتی تھی، اُس کے منہ سے رال بہتی تھی۔ آج ونتی دھر مشالہ پوجا کے لئے گئی تھی، اور اُس نے سانپ کی مورتی کو دودھ سے نہلایا تھا۔ آج ونتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹھاکر جی کی پوجا کرنے گئی تھی۔ اور اُس نے ندی پر ترناری کے پھول بیرائے تھے۔ آج ونتی نے سبز ریشم کا جھلملاتا لباس پہن رکھا تھا اور اُس کی ناک میں سپید موتی کی بندی چمک رہی تھی۔ اُس کے رشتے دار لاہور سے آگئے تھے، جنہیں منگنی پر آنے کے لئے لکھا تھا، وہ باغ میں آرام کرسیوں پر بیٹھے اُس سے باتیں کر رہے تھے، اور وہ "ہوں" "ہاں" کر کے اُن کا جواب دے رہا تھا۔ موہوم سی مدھم سی تصویریں، دھندلے نقوش جو یاد کے کوندے میں یکایک چمک جاتے۔ اس کی ماں کی منت، ساجت، اس کے

باپ کا نرم لہجہ، وہ کھانا بھی کھا رہا تھا، وہ کپڑے بھی بدل رہا تھا، وہ نائب تحصیلدار کے ساتھ سیر کو بھی جا رہا تھا، وہ آڑو کے کنج میں کتاب بھی پڑھ رہا تھا، اور پھر اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کچھ بھی نہیں کر رہا، جیسے وہ وہ نہیں، وہ کسی اور کو یہ سب کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جیسے وہ ان سب باتوں سے الگ تھلگ، ایک اونچی چٹان پر ایک تماشائی بنا اس کھیل کو دیکھ رہا ہے۔ اس کھیل میں خوشی نہ تھی، غمی بھی نہ تھی، نہ مسرت نہ حزن وملال، اس کھیل سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا، اُس کے احساس جامد تھے، اُس کی روح ساکت، اُس کا دل برف کی ایک قاش۔۔۔

منگنی؟ یہ کس کی منگنی ہو رہی تھی؟ وہ اُسی بے خیالی کے انداز میں سوچنے لگا یہ سارا اہتمام کس لئے کیا جا رہا ہے، سیندور کے ایک ذلیل، حقیر، گول سے ٹیکے کے لئے، جو ایک پتھر کے بت کی جبین پر اس لئے لگایا جائے، تاکہ صدیوں تک ایک بدنما سرخ کوڑھ کے داغ کی طرح جھلملاتا رہے، عجیب لوگ ہیں یہ بھی، یہ کیسی دنیا ہے۔ دلیل، سچائی، انصاف، اُسے خالی خولی الفاظ معلوم ہونے لگے، ایسے الفاظ جن میں روح نہ تھی، جن میں سے روح نکال کر باہر پھینک دی گئی تھی، اور اب اُسے یہ الفاظ چندرا کی طرح پاگل معلوم ہوتے تھے، نہ صرف یہ الفاظ، بلکہ یہ لوگ جو ہر لمحے ان الفاظ کا سہارا ڈھونڈتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُسے گمراہ معلوم ہوتے تھے۔ بے چارے مسافر راستہ بھول گئے ہیں اور اب شہنائیاں اور ڈھولکیں، اور مصری کی ڈلیاں اکٹھی کر رہے ہیں۔ تاکہ مصری کی لذت میں اور شہنائی کی آواز میں اُس زخمی چیخ کی تلخی اور اُس مرتے ہوئے طائر کی آخری پرواز کو گم کر سکیں، جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں ہلاک کیا تھا۔ اُس بت کے ماتھے پر سرخ سیندور کا ٹیکہ لگائیں، جس کی روح کو اُن کے سنگدل ہاتھوں نے اس نہاں خانے سے نوچ نوچ کر باہر پھینک دیا تھا۔

منگنی؟ اُس نے سوچا منگنی بڑی اچھی چیز ہے، منگنی کے بعد ایک بھوت ایک برف کی سل کو اپنے پلو سے باندھے ایک خوشنما بیدی کے گرد گھسٹتا ہوا گھومتا ہے، بیدی جلتی ہے اور شہنائی بجتی ہے جس کے بلند سروں میں زندہ گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے، اچھا کھیل ہے۔ اچھا ہو یا برا، وہ تو ایک اونچی چٹان پر بیٹھا ہے۔ اور ان لوگوں کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اُسے کیا؟

لیکن اُسے کیا۔ یہ منگنی کا دن تھا۔ شہنائیاں بج رہی تھیں، باغ اور بنگلہ جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ عورتیں خوبصورت لباس پہنے آ رہی تھیں، مردوں نے سپید براق کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہاں

کہیں کہیں نیل کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ یہاں نیل زیادہ لگا تھا۔ زیادہ سپیدی کی کوشش میں کپڑے نیلے کر لئے تھے۔ بے چارے انجان دیہاتی۔ یہ لڑکی کون ہے؟ اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے، مسکرا رہی ہے، تحصیلدار صاحب ہیں یہ اُن کے رشتے دار ہیں یہ تحصیلدار صاحب کی بیوی ہے، یہ چھایا ہے، یہ چمگادڑ ہے جو ایک مقفل تاریک کمرے کی دیواروں سے اپنا سر ٹکراتی پھرتی ہے۔ نمسکار پنڈت جی آہا پنڈت سروپ کشن جی، تحصیلدار صاحب کی بیوی اُن کے چرن چھو رہی تھی، اجنتا کی تصویر مسکرا رہی تھی، پر غرور انداز میں وہ زندہ تھی، کامیاب، اُس کی تہذیب، تمدن، آرٹ، ادب سب کچھ زندہ تھا۔ ایک سپید دوپٹہ گردن کے دونوں طرف آویزاں تھا۔ تم مجھے مردہ سمجھتے ہو، جاہل، بے وقوف، میری مسکراہٹ دیکھو۔ میرے رخساروں کی چمک میری آواز کی درخشندگی ملاحظہ کرو۔ میرے قہقہوں کا وقار، میں زندہ ہوں، صرف تم پتھر کا بت ہو، میں زندہ ہوں۔ سماج کی روح میری مٹھی میں ہے، جاہل، بے وقوف، تخیل پرست۔۔۔

ہون ہونے لگا۔ پنڈت آسنوں پر بیٹھے ہوئے اشلوک پڑھ رہے تھے، آگ جل رہی تھی۔ اگر کا دھواں، اور معطر گھی کی لپٹیں، ایک تھال میں چاول اور زعفران، اور سیندور اور گلاب کی پتیاں اور معطر مصفا پانی اور گھی کا چراغ جلتا ہوا ایک لو، اکیلی، رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے، نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔۔۔ لیکن اس کے پاؤں رکابوں میں تھے، وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا تھا، اور وہ اور غلام حسین دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

شہنائی بج رہی تھی، ڈھولک بج رہی تھی، گیت گائے جا رہے تھے یکایک پنڈت سروپ کشن نے ہاتھ کا اشارہ کیا، اور تھوڑے عرصہ میں چاروں طرف سکوت چھا گیا صرف ہون کی لکڑیاں کبھی کبھی چیخ جاتیں، یا شعلوں میں گھی کے جلنے کی آواز آتی، جیسے زندہ گوشت بھن رہا ہو۔ پنڈت جی اشلوک پڑھ رہے تھے۔ آخری اشلوک جس کے بعد چندن، زعفران، سیندور، گلاب، جل، اور چاول کا ٹیکا لگتا ہے۔ عجیب تماشا تھا، اور وہ اپنی بلند چٹان پر بیٹھا ہوا اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

پنڈت جی نے مسکرا کر ہاتھ سے اشارہ کیا، اور تحصیلدار صاحب کی بیوی نے تھال اُٹھا لیا، اور ہولے ہولے قدموں سے آگے بڑھی۔ یہ کیا؟ رب عظیم یہ کیا، وہ اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی، وہ جو تماشائی تھا۔ مسکراتے ہوئے بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اس کی طرف۔ جوان سب سے الگ

تھلگ ایک اونچی چٹان پر بیٹھا تھا۔ سب لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف تھیں، لڑکیوں کے متبسم چہرے اُس کی طرف تھے جو اُسے ایک کھیل سمجھتا تھا۔ ایک تماشہ، جس میں نہ غم ہے نہ مسرت۔ وہ اُس کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اور دنیا کی نگاہیں اُس پتھر کے بت کی جبیں پر جم گئی تھیں، جہاں تھوڑی دیر میں سرخ کوڑھ کا بدنما داغ لگا دیا جائے گا اور پھر صدیوں تک جھلملاتا رہے گا۔ نہیں نہیں۔۔۔ یہ منگنی اُس کی نہ تھی، وہ پتھر کا بت تھا تو بھی اس جرم کا مرتکب نہ ہو سکتا تھا۔۔۔ ہاتھ اُس کے قریب آ رہا تھا نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا، میں تو صرف تماشائی ہوں تم لوگوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک معصوم پتھر کا تماشائی، خدا کے لئے۔۔۔ یہ سرخ کوڑھ مجھے نہ دو۔ یہ سماج کا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، اتنا بڑا خوفناک ہاتھ اور سرخ ٹیکا اس ہاتھ کی مٹھی میں جگمگا رہا تھا، جیسے ایک تیز جلتی ہوئی مشعل۔ یہ مشعل میری آنکھیں جھلس دے گی، میرے ماتھے کو جلا دے گی، نہیں، نہیں، میں نے کوئی قصور نہیں کیا، اُف یہ آگ کا گول دائرہ۔۔۔

یکایک اُس نے سنا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا دروازے کی دہلیز پر کھڑا ہو کر چلا چلا کر اور بازو ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”ونتی مر گئی۔ ونتی مر گئی۔

اور اُس پتھر کے بت میں جان آ گئی اور اُس نے زور سے اپنی ماں کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تھال ایک جھناکے کے ساتھ فرش پر جا پڑا اور شیام بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ بھاگتا ہوا جارہا تھا۔ اور اس کے ماں باپ اور رشتے دار اور نوکر چاکر اُسے آوازیں دے رہے تھے، لیکن یہ آوازیں اُسے کسی دوسرے سیارے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ اُن دور اُفتادہ آوازوں کے مدھم شور پر موت کے اُس طوفان کو گرجتے سن رہا تھا، جو بار بار ہزاروں لاکھوں توپوں کی گرج کے ساتھ کہہ رہا تھا ونتی مر گئی، ونتی مر گئی، اُس کے کانوں کے پردے اس طوفان کی گرج سے پھٹے جارہے تھے، لیکن وہ پھر بھی اُسے بار بار سن رہا تھا، ونتی مر گئی، ونتی مر گئی، بجلی کی کڑک کی طرح یہ آواز بار بار سنائی دیتی تھی، اس خوفناک رعد کی لہریں اُس کے روح کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور وہ چٹان اور وہ پتھر کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہی بجلی اُس پتھر کے بت پر گری تھی، جس نے ونتی کی موت کا جانگداز نغمہ لہراتے ہوئے کوندے میں بھر کر ساری کائنات میں پھیلا دیا......
ونتی مر گئی تھی اور اس کے احساسات زندہ ہو گئے تھے، اُس کی رگوں میں آتشِ سیال، برقِ تپاں کی طرح دوڑ رہی تھی، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا سروپ کشن کے گھر کی طرف جا رہا تھا کیونکہ وہ اب بت تماشائی نہ تھا، خود اس تماشے کا جزو تھا، اس حزنیئے کا وارث......

ونتی سروپ کشن کے گھر نہ تھی، وہ علی الصبح ندی پر نہانے کے لئے گئی تھی اور پھر واپس نہ آئی تھی، درگا نے اُسے بتایا، ایک طرح سے وہ ونتی کے مر جانے پر خوش تھی، کیونکہ ونتی کا شباب اور اُس کا پھول کی طرح پاکیزہ حسن درگا کی بدصورتی اور ادھیڑپنے کو اور بھی نمایاں کر دیتا تھا اور وہ جب سے ونتی آئی تھی، ہر وقت پژمردہ خاطر رہتی تھی، درگا کو معلوم تھا کہ ونتی خوش نہیں ہے، کبھی خوش نہ رہ سکتی تھی، اُس نے درگاداس کی تمام خواہشات کو ٹھکرا دیا تھا، اُس کے چہرے سے گلاب کے پھول غائب ہو گئے تھے۔ اب وہاں برف تھی، سپید، سرد، خوفناک، جو اُن اونچے پہاڑوں کی

یاد دلاتی تھی، جن کی چوٹیوں تک انسانی قدم آج تک نہیں پہنچ سکے، یہی برف اس کی نگاہوں میں تھی اور گو وہ منہ سے کچھ نہ کہتی۔ لیکن جب وہ اپنی نگاہیں درگاداس یا سروپ کشن کے چہرے پر گڑو دیتی تو وہ اُن یخ بستہ، برفیلی نگاہوں کی تاب نہ لا سکتے، اور اُن کے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی، جیسے وہ کسی خوفناک پھسلتے ہوئے گلیشیر کے دہانے پر کھڑے ہیں اور چاروں طرف برف کا قعرِ فنا ہے، اور وہ ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کر لیتے، یا کھسیانے ہو کر ادھر اُدھر مڑ جاتے، اور دُرگا سے یا ہالیوں سے یا گھر کی نوکرانی سے باتیں کرنے لگتے، اور جب درگاداس یا سروپ کشن وہاں نہ ہوتے تو بھی ونتی کئی مرتبہ اکیلی بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی، اور اُس کی آنکھوں کا سرد، خوفناک، برفیلا سکون گھر کی فضا پر ایک کپکپی سی طاری کر دیتا، اور درگا کو احساس ہوتا کہ اسوج کی کھلی رُت میں پھاگن کی طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں، جو اُس کے گھر میں غصے سے پھنکارتی ہوئی اُس کی چھت کو پھاڑ کر نکل جائیں گی، اور اُسے ونتی سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ اور وہ اُس کی آمد کو ایک بدشگون سمجھنے لگی، اور دل ہی دل میں اُس سے نفرت کرنے لگی۔

شادی کے بعد اُس کی سہیلیوں نے ونتی کو ہنستے یا مسکراتے بہت کم دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کا جامد سکون ایک پردے کی طرح اُس کی روح کے گرد لپٹا ہوا تھا اور کوئی یہ دیکھ نہ سکتا تھا کہ اس روح کے اندر کیا ہے، ونتی کیا دیکھ رہی ہے کیا سوچ رہی ہے، سہیلیوں کے بہت تنگ کرنے پر اور بار بار گدگدانے پر وہ بھی کبھی ہنس پڑتی یا مسکرا دیتی، اور ایسا معلوم ہوتا گویا برف کی سل پر کوئی بھولی بھٹکی کرن تھرا رہی ہے، اور پھر وہ کرن بھی غائب ہو جاتی، اور اُس کے مسکراتے ہوئے کانپتے ہوئے لب آنسوؤں میں سموئے ہوئے معلوم ہوتے، اور اُس کی سمیں گردن کے خم پر ایک رگ زور زور سے دھڑکنے لگتی۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی اُس کی پوری نگہداشت کی جاتی تھی۔ اُسے اکیلے کبھی گھر سے نکلنے نہ دیا جاتا تھا۔ عورتیں ہر وقت اُسے گھیرے رہتیں، کوئی نہ کوئی ہر وقت ہر لمحہ اُس کے قریب موجود ہوتا، لیکن ان کی قربت کا ونتی کو بہت کم احساس تھا، اب وہ بہت دور، بہت دور چلی گئی تھی، چلی جا رہی تھی، اُس کے دل میں کسی قسم کی پریشانی نہ تھی، نہ وہ ان پریشانیوں کو حیرانی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یہ سب کچھ صحیح تھا، جائز، رسم و روایت کے عین مطابق، یہ سب کچھ درست تھا۔ صرف اس کا دل منجمد ہو گیا تھا اور اُس کی روح یخ بستہ اور وہ گلیشیر جو دوسروں کو اُس کی نگاہوں

میں نظر آتے تھے، خود ونتی کی آنکھوں میں پھسل رہے تھے۔ وہ قعرِ فنا جس کا احساس لوگوں کو اپنے لئے ہوتا تھا، دراصل ونتی کی اپنی آنکھوں میں نہاں تھا۔

اور جب سہیلیوں نے اُسے سنایا کہ تحصیلدار کے لڑکے کی سگائی کا شگن ہونے والا ہے اور یہ کہ شگن بڑے ٹھاٹھ سے ہوگا، اور گاؤں بھر کی عورتیں وہاں جمع ہوں گی، اور لاہور سے تحصیلدار صاحب کے رشتے دار آئے تھے، اور بیاہ سے بھی زیادہ رونق وہاں ہوگی، تو بھی وہ چپ رہی، اور کسی نے اُس کی بڑی بڑی پتلیوں کی حیرانی کو نہ دیکھا، نہیں، یہ شاید حیرانی نہ تھی، بلکہ ایک عجیب طرح کی سمجھ، ایک دل گداز تجربے کی گہرائی بھی اس حیرانی میں شامل تھی، ایک ایسی حیرانی جس میں اُس کی روح کا سوز اور اُس کے جگر کا لہو گھلا ہوا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے چہرے پر ایک ایسی عجیب مسکراہٹ آگئی، جس میں تلخی اور شیرینی اور مامتا اور ملائمت اور درگزر اور ہزاروں معافیاں شامل تھیں، کیونکہ شاید ایک عورت ہی معاف کرنا جانتی ہے، لیکن کسی نے اُس کی اس عجیب مسکراہٹ کو نہ سمجھا، نہ اس کی نگاہ کو۔

اور جب اس کی سہیلیوں نے اس سے پوچھا کیا وہ وہاں منگنی پر جائے گی، اُن کے ساتھ چلے گی نا، تو اُس نے اُسی عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ہاں میں ضرور چلوں گی۔“ اور وہ منگنی کے روز بہت سویرے اٹھی اور نئے کپڑے لے کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی پر نہانے کے لئے چل دی۔ مانِدر کی ندی پر نہیں، بلکہ روڑی نالے پر جو بازار کے پیچھے ایک پر فضا تلے میں ایک نرم رو ندی کی طرح بہتا تھا۔ جس جگہ ونتی اور اس کی سہیلیاں نہا رہی تھیں، وہاں بند لگا کر ان لڑکیوں نے پانی کی ایک چھوٹی سی خوشنما جھیل بنا ڈالی تھی، یہاں ندی کے ایک طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں، اور دوسری طرف جنگلی انجیر کے درختوں کا جھنڈ تھا جس کے گھنے سائے سے یہ جگہ اوٹ میں ہو گئی تھی۔

نہا دھو کر ونتی نے کپڑے بدلے، اُس نے وہی سوٹ زیب تن کیا جو اُس نے بہت عرصہ ہوا مشرا گنگو کے لڑکے کے بیاہ میں پہنا تھا، آج وہ خلافِ معمول مسکرا رہی تھی اور اس کے نازک ہونٹوں کے کونے رہ رہ کر کانپ اٹھتے، اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دوڑ جاتی، ہاں چہرے پر سرخی نہ تھی، اور اُس کے چہرے کی سپیدی اُس کی گھنی پلکوں کی سیاہ صف کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی، لڑکیاں اس تبدیلی پر حیران تھیں، اور اصل بات نہ سمجھ کر اُسے بار بار چھیڑ رہی تھیں، لیکن ونتی نے ان کی شریر لگاوٹ کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ واپس چل دی، نقرئی لہریئے والے دوپٹے نے اُس کے چہرے کی سپیدی کو اور بھی جلا دے دی تھی، اور اس کے گھنے بالوں کا جال اس دوپٹے کی نازک شکنوں میں رہ رہ کر جھلک اٹھتا تھا، وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اپنے ہاتھ میں اُس نے کانسی کا کٹورا اٹھا رکھا تھا۔ جس میں ترناری کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ دھڑے کے پہاڑ کے مرغزاروں پر آہستہ آہستہ دھند پھیل رہی تھی، وہ آج شیام کو دیکھے گی، اپنے محبوب کو دیکھے گی، وہ اُسے دیکھے بنا نہیں رہ سکتی، اور اس کا دل کانپنے لگا، اور اُس کی روح پر جمی ہوئی برف آہستہ آہستہ پگھلنے لگی، وہ اُسے ضرور دیکھے گی، مرغزاروں پر دھند چھا رہی تھی، اپنے محبوب کے پیارے لمس کی طرح، اور نیلا دھاریوں کی جھاڑیوں کی آغوش میں ایک سندر جھرنا تھا اور وہ اپنے من موہن شیام کی آغوش میں تھی، اور چاروں طرف انجوں کے نیلے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے، اور بلبل جھاڑیوں میں چھپی ہوئی گیت گا رہی تھی، اور اُس کی گردن کے خم میں ایک یاقوت چمک رہا تھا اور ترناری کے پھولوں کی کہکشاں لرز رہی تھی، اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گئی اور اس کی سہیلیوں نے اُسے تھام لیا اس کا رنگ فق ہو گیا اور زمین اور آسمان گھومنے لگے، اور کٹورا ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا اور ترناری کے پھول چاروں طرف بکھر گئے۔ ”ونتی، ونتی۔“ اس کی سہیلیوں نے کہا۔ لیکن وہ اب چل نہ سکتی تھی۔ اور وہ وہیں گھاس کے سبزے پر ایک شہتوت کے تنے کے قریب لیٹ گئی، زمین اور آسمان گھوم رہے تھے، اور اس سے اپنی پلکیں اٹھائی نہ جاتی تھیں، اور اس کی سانس مدھم ہوتی گئی، اور اس کے احساسات دائروں کی شکل میں گھومتے ہوئے غائب ہونے لگے، دو جگنو چمک رہے تھے۔۔۔ اور اُس کے ہاتھوں کی پوروں پر، پلکوں پر، رخساروں پر، لبوں پر، گردن کے ہالے پر بوسوں کی بارش ہو رہی تھی، لطیف، ننھی ننھی، خوشگوار بوندوں کی طرح، اور ان بوندوں میں دو جگنو چمک رہے تھے، اور دور کہیں اُس کی سہیلیاں کہہ رہی تھیں۔ ونتی، ونتی۔۔۔ دو جگنو چمک رہے تھے۔۔۔ اور کوئی کہنے لگا۔۔۔ جب تک زندہ ہوں تمہارے ساتھ ہوں اور پھر جیسے اس آواز کے ساتھ ہی کسی نے اس کے دل میں خنجر چبھو دیا، اور اس کے لبوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی، ایک آہ۔۔۔ ایک گہرا سانس جو آہستہ آہستہ مدھم ہوتا گیا، اور وہ ایک سپید گلیشیئر کے قعرِ فنا میں گم ہو گئی۔

اور اس کی سہیلیاں زور زور سے چلانے لگیں۔ ”ونتی، ونتی۔“ لیکن ونتی وہاں نہ تھی، وہ دور،

بہت دور چلی گئی تھی، اور ایک لافانی گلیشیئر کی گہرائیوں میں سماگئی تھی اور گو انہوں نے بہت شور مچایا اور اس کے ہاتھ پاؤں ملے، اور اس کے سرد رخساروں سے اپنے گرم گرم لہو سے رواں دواں گال چھوئے، لیکن نہ ونتی کی گھنی پلکوں پر کوئی لرزش ہوئی، نہ اُس کے لبوں کے کونے کانپے، نہ اُس کے نتھنوں سے زندگی کا لطیف سانس پیدا ہوا۔ وہ ایک پتھر کی مورت کی طرح اس شہتوت کے تنے کے نیچے پڑی تھی، اور ڈال ڈال پات پات ہرے ہرے طوطے چلا رہے تھے۔ ونتی اُٹھ، ونتی جاگ، ونتی ترے محبوب کا شگن ہے، دیکھ دھند پہاڑوں پر پھیل رہی ہے، سورج کا سونا ندی کی آنکھوں میں چمک رہا ہے، تیری سہیلیوں کے دلوں میں محبت کے گیت رکے ہوئے ہیں، اُٹھ پیاری ونتی لاجونتی، چھوئی موئی ایسی نازک شرمیلی، کنواری اُٹھ، دیکھ تیرے محبوب کے ماتھے پر شگن کا سرخ ٹیکا چمک رہا ہے، اور تیری مانگ سہاگ کے سیندور سے رچی ہوئی ہے، اُٹھ پیاری ونتی، دیکھ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ شہتوت کے پیڑ پر گلابی قرمزی شہتوت لمبے لمبے آویزوں کی طرح لٹک رہے ہیں اور پہاڑوں پر دھند محبوب کے نازک گداز لمس کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔۔۔

اور گو طوطے دیر تک چلاتے رہے، اور اُس کی سہیلیاں دیر تک شور مچاتی رہیں، حتیٰ کہ بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے، اور گو کائنات اُسی طرح خوبصورت تھی، اور نیلے آسمان پر ستمبر کے بادل شہزادے اپنا لباس فاخرہ جس میں دھند کا ریشم اور کرنوں کے سنہری تار گندھے ہوئے تھے، پہن کر خراماں خراماں گزر رہے تھے لیکن ونتی کو فرصت نظارہ کہاں تھی، اس نے کسی کی طرف پلک اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور چپ چاپ برف کے گلیشیر کی طرف بڑھتی گئی۔

اور اُس کی ماں، اور شیام اور پنڈت سروپ کشن اور درگاداس اور بہت سے لوگوں نے اُسے اس شہتوت کے تنے کے نیچے سوتے ہوئے پایا۔ اور شیام نے آگے بڑھ کر اس برف کی مورت کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا، اور ونتی کے بالوں کا گھنا جال نیچے زمین تک بکھر گیا، اور وہ اُس کے سپید چہرے کی طرف دیکھنے لگا، اُس کی گھنی پلکوں کی صف کی طرف جن کے اندر آنسوؤں کی جھیلیں منجمد ہو گئی تھیں، اُس کے ہونٹوں کے کونوں کی طرف، اُس کی نازک گردن کے خم کی طرف، جہاں اب کوئی رگ نہ تڑپتی تھی، بلبل مائل پرواز نہ تھی، وہ دیودار کی آخری ٹہنی سے اڑ کر فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گئی تھی، اور شیام پاگل ہو گیا اور اس نے اپنا چہرہ اس سیمیں ہالے میں چھپالیا، اور سسک سسک کر کہنے لگا۔ او مائی ڈارلنگ،...... او مائی ڈارلنگ......!"

اور اب اُسے اتنا یاد تھا کہ ماندر کی ندی کے کنارے ایک چتا جل رہی تھی اور اس کے لمبے لمبے شعلے ندی کی سطح پر ناچ رہے تھے، اور وہ سپید برف اب چاندی کی بھبوت بنتی جارہی تھی، اور ہوا خاموش تھی، اور بادل گھرے ہوئے تھے، اور شفتالو کا ایک درخت اُس چتا کے قریب کھڑا تھا، جس کے پتے، پھل، پھول، سب جھڑ چکے تھے اور وہ اس بہار کے موسم میں اپنی زندگی کی خزاں لئے چپ چاپ کھڑا تھا، اور چتا جل رہی تھی۔ اور وہ مرمر کی مورت چاندی کی بھبوت بنتی جارہی تھی۔

چتا کے قریب درگاداس کھڑا تھا۔ خاموش، سر جھکائے ہوئے، اور شعلوں کی روشنی میں اُس کا تاریک مہیب سایہ ایک بھوت کی طرح ندی کی سطح پر ہل رہا تھا۔ شیام کا سایہ بھی ایک بھوت تھا، اور بلبھدر کا بھی، اور سروپ کشن کا بھی، اور چھایا کا بھی، اور ان زندہ بھوتوں کے درمیان ایک خاموش چتا جل رہی تھی۔ اور شفتالو کا درخت اکیلا کھڑا تھا۔